باچا خان

فارغ بخاری

محمد فاروق قریشی

۷۹۹

باچا خان

(خان عبدالغفار خانؒ کے سوانح حیات)

فارغ بخاری

○ نیا مکتبہ پشاور

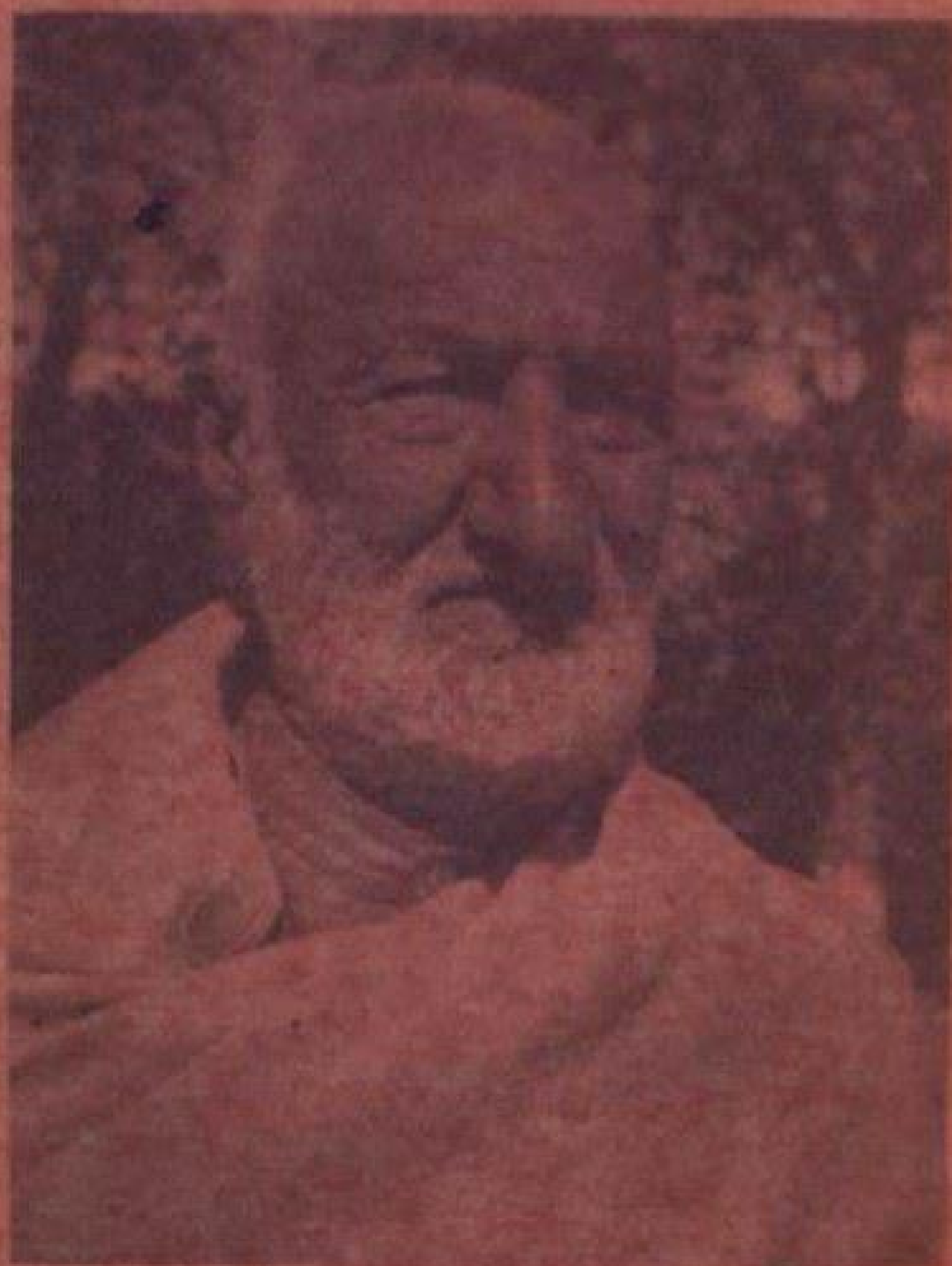
○ گوشۂ ادب۔ لاہور

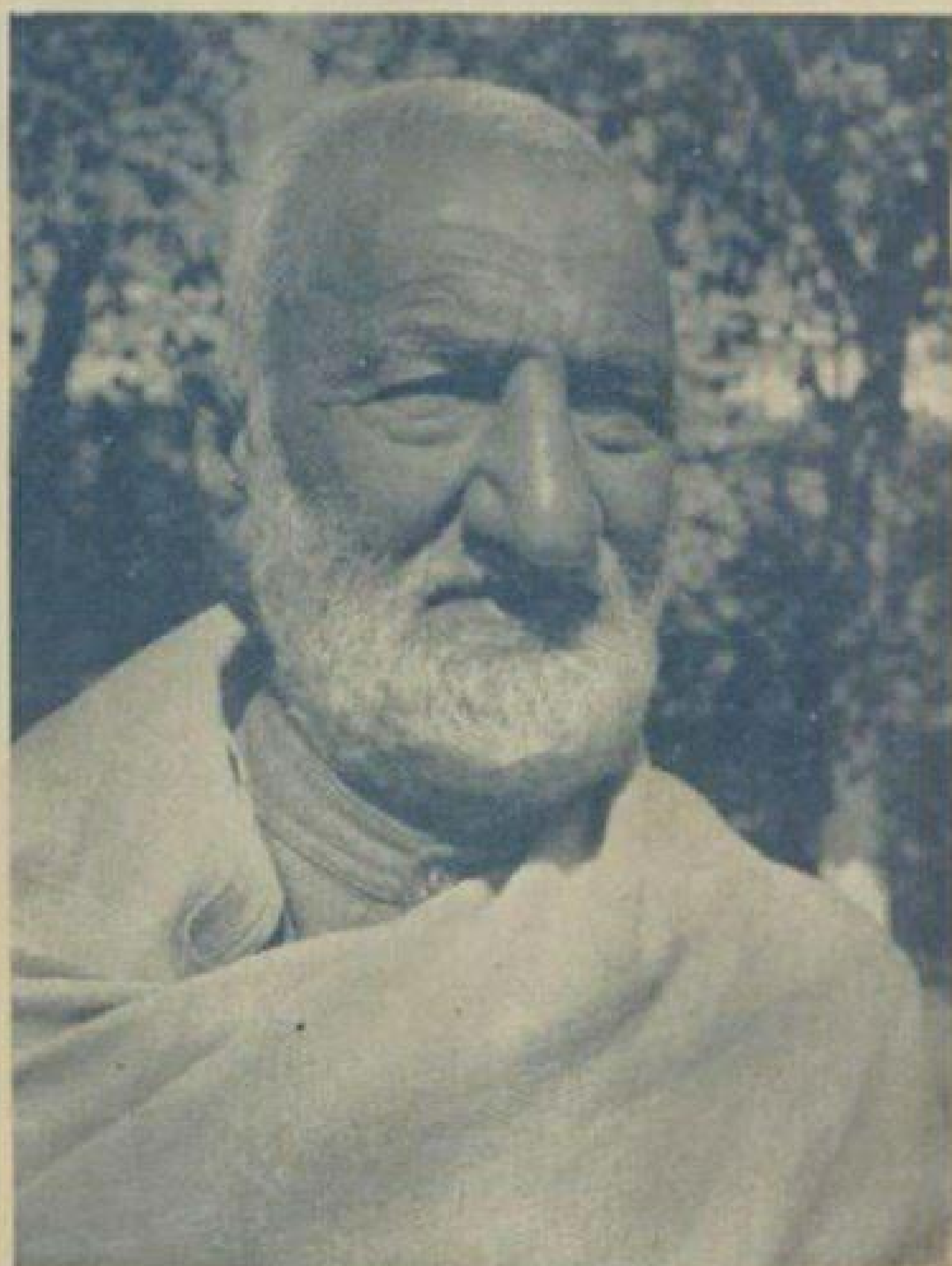


ناشران : نیا مکتبہ ۔ پشاور
گوشۂ ادب ۔ لاہور
طابع : نقوش پریس ۔ لاہور

بار اول دو ہزا
قیمت سات رو

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی





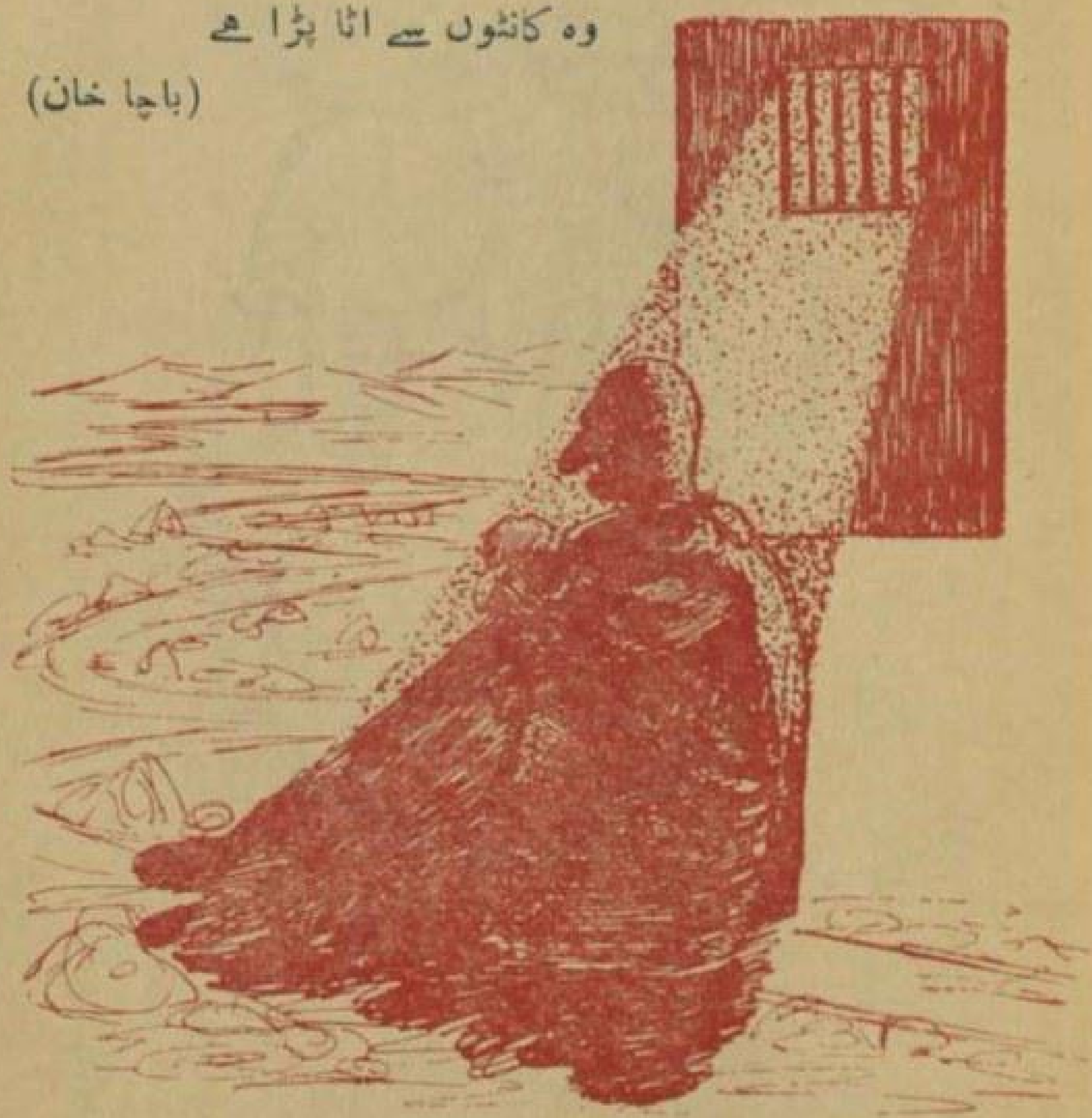
خدائی خدمتگار تحریک
کے نام
جو پہلے بھی مغضوب تھی
اور
اب بھی معتوب ہے

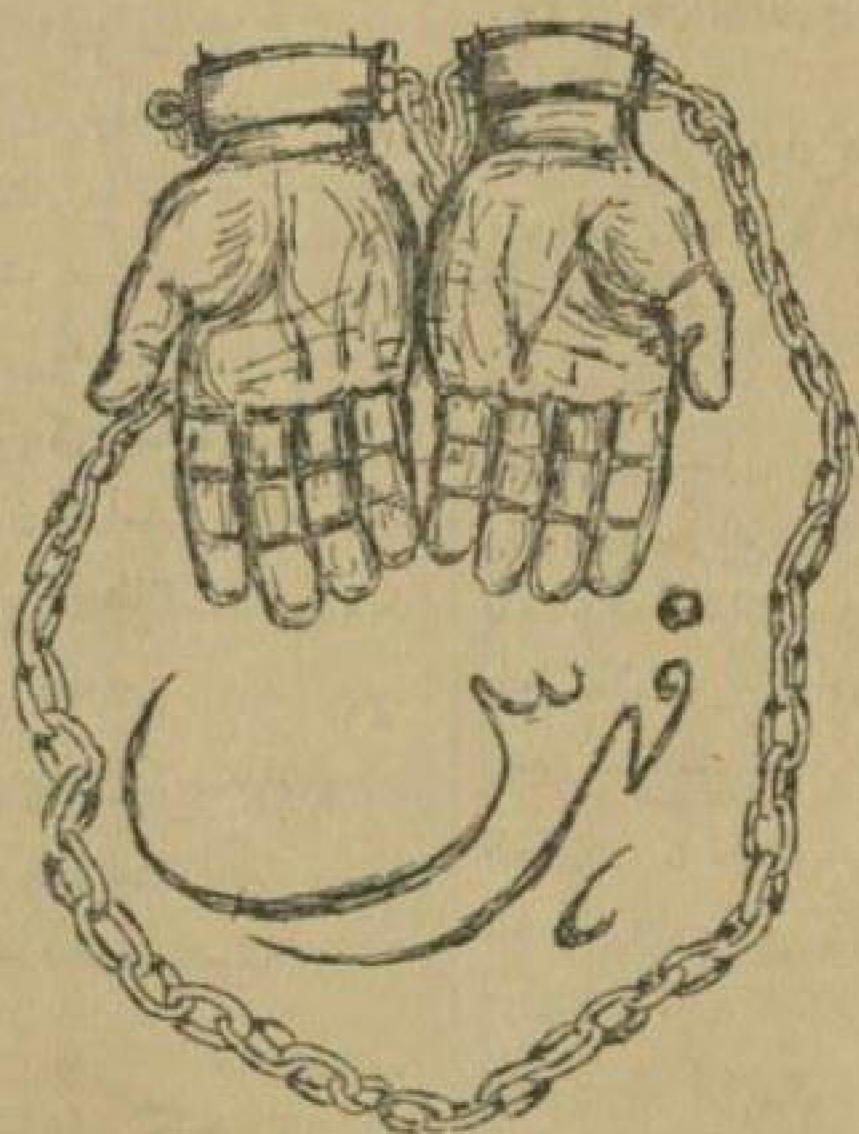


عوام کا محبوب رہنما
اور
جنگ آزادی کا ہیرو
خان عبدا لغفار خان
جسے
ملک کے طول و عرض میں
محبت اور احترام سے سب
باچا خان
کہہ کر پکارتے ہیں



میری دوستی غم و آلام سے پُر ہے
میں جس راستے کا مسافر ہوں
وہ کانٹوں سے اٹا پڑا ہے
(باچا خان)





حصۂ اول

خدائی خدمتگار تحریک

پہلا دور

خدائی خدمتگار تحریک

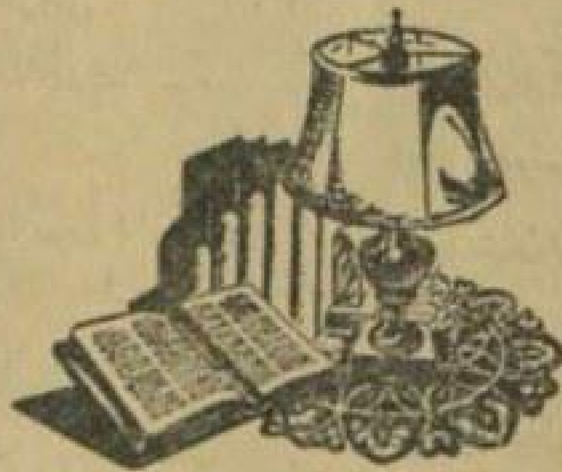
دوسرا دور

قیام پاکستان

خدائی خدمتگار تحریک

تیسرا دور

حصۂ دوم



باچا خان

اس عظیم رہنما کی کہانی جسکے لئے پٹھان دیدہ و دل فرش راہ کرتے ھیں لیکن "اٹک کے اس پار" اسکی ذات مختلف افسانوں کے گرد و غبار میں دبی گئی ہے جو آزادی کے حصول پر سب سے زیادہ قید و بند کا مستحق سمجھا گیا۔

یہ کتاب خان عبدالغفار خان کی "آپ بیتی" ہے جسے سرحد کے نوجوان ادیب فارغ بخاری نے "جگ بیتی" کے انداز میں لکھا ہے اس کا مطالعہ آپ کے ذہن کو شکایت سے حکایت کی طرف موڑ دے گا۔

آپ بے شک اپنی رائے پر قائم رہئے لیکن اس کتاب کا مطالعہ آپ کو ان چٹانوں کی آواز سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے جن کی سنگینی کو عبدالغفار خان نے اپنے نعرہ ھائے رستاخیز سے انگڑائی لینے پر مجبور کیا اور جو پاکستان کے دل کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکتی ھیں۔

لاھور　　　　شورش کاشمیری

۱۰ اپریل ۱۹۵۷ء

ابتدائیہ

اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں صوبہ سرحد بھی انگریزوں کے تسلط میں آچکا تھا۔ ہندوستان بھر پر قبضہ جمانے میں وہ دشواریاں پیش نہ آئیں جن کا سامنا انہیں اس سرزمین پر کرنا پڑا اور قبضہ کرنے کے بعد بھی یہ عالم تھا کہ اپنے ڈیڑھ سو سالہ عہد حکومت میں کبھی ایک دن کے لیے بھی انگریزوں کو یہاں سکھ کا سانس لینا نصیب نہ ہوا اور سرحد کے قبائلی علاقے کو زیر نگین لانے کا خواب تو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا بلکہ آزاد قبائل ہمیشہ اُن کے لیے بلائے جان بنے رہے اور اُن کی دفاعی قوت کا غالب حصہ ان کی شورش فرو کرنے پر صرف ہوتا رہا۔

پشتونوں کی شجاعت، مردانگی اور جذبۂ حریت کو انگریز حکمرانوں کی کوئی حکمت عملی بھی نہ جیت سکی تو انہیں بڑے قاتل اور خونخوار ثابت کرنے کے لیے انہوں نے اپنی ساری قوت صرف کر دی چنانچہ سرحد میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ گزارنے والے انگریزوں نے یہاں کے متعلق جو کچھ لکھا اس کی ہر سطر اُن کے ذہنی تعصب اور بغض کی آئینہ دار ہے اور بادی النظر میں ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ ان تہذیب کے پتلوں نے ہم ۔ وحشیوں ۔ میں زندگی گزار کر ہم پر بے پناہ احسان کیا حالانکہ مغربی سامراج نے جہاں بھی قدم رکھا اپنے مفاد کے حصول کے لیے اس بدقسمت سرزمین کے چپے چپے پر ہم رنگ زمین دام بچھائے اور اس دام میں استبداد کے دانے پھینک کر وہاں کے سادہ لوح انسانوں کو اسیر کرتے رہے ۔

سابق صوبہ سرحد انہیں بدنصیب خطوں میں سے ہے جہاں انگریزوں نے اپنی ظالمانہ آمریت کو حکمت عملی کے پردے میں سالہا سال تک مسلط رکھا اور محض ان کے حریت پرستی کے جذبے کو کچلنے کے لیے انہیں وحشی اور اُجڈ قرار دے کر ہندوستان کے دوسرے حصوں کی نسبت یہاں کے لوگوں سے امتیازی سلوک روا رکھا ۔ اس خطہ کو سرزمین بے آئین کا نام دے کر یہاں کے لیے خاص ظالمانہ قوانین اور ریگولیشن ڈھالے جن کی رُو سے جس شخص کی نقل و حرکت پر بھی انہیں ذرا سا شک گزرتا اسے بلا کسی ثبوت اور دلیل و وکیل کے غیر محدود عرصہ کے لیے جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا ۔ قتل کے مقدمات جن کے متعلق کوئی ثبوت نہ مل سکتا لیکن ملزمین کو سزائیں دلانا ضروری سمجھا جاتا انہیں جرگہ کے سپرد کر دیا جاتا اور جرگہ کے ان پڑھ اور غیر قانون دان اراکین ملزمین کو چودہ برس تک قید دلانے کی سفارش کر سکتے ۔ غازی ایکٹ کے تحت بغیر کسی سماعت کے کسی کو تختہ دار پر لٹکا دینا ، گھروں کو جلانا اور فصلوں کو تباہ کرنا معمولی بات تھی ۔ سابق شمال مغربی صوبہ سرحد نے ۱۹۰۱ء میں جنم لیا اس سے قبل یہ صوبہ پنجاب کا ایک حصہ تھا اس وقت یہ صوبہ ایک چیف کمشنر کے ماتحت تھا یہ انتظام ۱۹۳۲ء تک رہا ۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات جو ۱۹۱۹ء میں ملک کے دوسرے صوبوں کو دی گئیں بدقسمتی سے اس صوبے میں نافذ نہ ہو سکیں کیونکہ اسے پس ماندہ رکھنے میں انگریز حکمرانوں کی بعض مصلحتوں کو دخل تھا ۔

جب یہاں کے سیاسی رہنماؤں کی مسلسل کوششوں سے یہاں کے لوگوں میں کافی بیداری

پیدا ہو گئی اور وہ حکومت کے اس توہین آمیز رویے کو بُری طرح محسوس کرتے ہوئے اصلاحات طلب کرنے کے لیے میدان میں اُتر آئے اور اپنے مسلسل احتجاج سے انہوں نے حکام کا ناک میں دم کر دیا تو حکومت کے ایما پر تین سرکردہ مسلمان رہنماؤں ہز ہائی نس آغا خان، قائد اعظم محمد علی جناح اور صاحبزادہ عبدالقیوم خان کو اس غرض کے لیے لندن بلایا گیا جہاں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مذکورہ صدر حضرات کی پُر زور سفارش پر ۱۹۳۲ء میں صوبہ سرحد کو یہ اصلاحات دے دی گئیں جن کے ذریعے اس صوبے نے نئی زندگی میں قدم رکھا (حکومت پاکستان نے اس صوبے کو اب پھر مغربی پاکستان کی وحدت میں مدغم کر دیا ہے) جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ پشتون قوم ہندوستان کے حکمرانوں کے لیے ہمیشہ ایک مستقل دردِ سری رہی اس کا اندازہ تاریخ کے مختلف ادوار میں وقتاً فوقتاً ان کی سرکشی اور بغاوت سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ غیر ملکی اقتدار انہیں کبھی ایک دن کے لیے بھی گوارا نہ ہوا اور نہ ہی انہوں نے اسے برضا و رغبت قبول کیا۔

پشتون فطرتاً حریت پسند تھے غلامانہ زندگی سے انہیں نفرت تھی اپنے محل وقوع، آب ہوا اور صدیوں کی تاریخی روایات نے اُن کے دل و دماغ میں آزادی کی ایسی شمع روشن کر رکھی تھی جو انقلابات کی آندھیوں اور سخت گیر حکمرانوں کے تشدد کی صرصر سے بھی نہ بجھ سکی۔

صوبہ سرحد کے شمال مغرب کی طرف آزاد قبائلی علاقہ پھیلا ہوا ہے جہاں سالہا سال سے کبھی ایک دن کے لیے بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کے اقتدار کا سایہ تک نہیں پڑا، وہاں کوئی بادشاہ نہیں، کوئی حاکم نہیں، وہ لوگ آسمان کی لمبی فضاؤں میں اُڑنے والے پرندوں کی طرح بالکل آزاد اور خود مختار ہیں وہاں زمانۂ ماقبل تاریخ کا آزاد قانون آج تک رائج ہے۔

اس آزاد علاقے کے باشندوں کا حکومتی علاقے کے لوگوں سے

رسم و راہ اور میل جول ہے۔ لین دین ہے ان کی زبان ایک ، معاشرت ایک ، قومیت ایک ، اور ماحول کی مناسبت سے مزاج بھی ایک ہی جیسے ہیں آزاد علاقے کی ہمسائیگی کے باعث آزادی کی لگن کی چنگاری بھی اُن کے دل میں کبھی بُجھنے نہیں پائی اس لیے اس خطے کو کچھ ایسی خصوصیات حاصل رہی ہیں کہ ہمیشہ یہیں سے آزادی کی نئی نئی تحریکیں اُٹھتی رہیں۔

پیر رو خان نے اپنی جدوجہد کے لیے اسی علاقے کو منتخب کیا ، خوشحال خان خٹک نے اپنی جنگ آزادی کا محور اسی خطے کو بنایا ، شاہ اسماعیل شہید نے ہندوستان کے دُور دراز علاقے سے آکر اسی سرزمین میں جہاد کا آغاز کیا اور انگریزوں کے عہد میں بھی کانگرس بھارت سبھا ، خاکسار ، سُرخ پوش ، احرار ، مسلم لیگ وغیرہ جماعتوں کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کے لیے یہی میدان مناسب معلوم ہوا ، یہ راز غیر ملکی حکمرانوں پر بھی پوری طرح واضح ہو چکا تھا ، چنانچہ انگریزوں یا مغل سب نے اپنی زیادہ توجہ اسی علاقے پر مرکوز رکھی اور اُن کی فوجی طاقت اور مالی قوت کا زیادہ تر حصہ اسی سرحد پر استعمال ہوتا رہا اس خطے میں سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ اس کے ساتھ ملحقہ نہایت وسیع و عریض آزاد پہاڑی علاقہ تھا جہاں بوقت ضرورت جنگ آزادی کے رہنما پناہ لے کر اپنی جدوجہد جاری رکھ سکتے تھے۔

سچ پوچھیے تو جنگ آزادی کے اس محاذ نے صرف سرحد ہی نہیں بلکہ برعظیم کی تمام سیاسی تحریکوں کو کافی مدد پہنچائی کیونکہ جب کبھی یہاں عوام پر غیر ملکیوں کے استبداد نے شدت اختیار کی وہیں فوراً قبائلی مجاہدین نے شورش برپا کر کے حکومت کو اس حد تک مجبور کر دیا کہ اسے اپنا طرزِ عمل بدلنا پڑا اور اپنی استعماری پالیسی میں لچک پیدا کرنی پڑی۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز سامراج نے ہندوستانیوں کو اس سختی اور بے دردی سے دبایا کہ پوری نصف صدی تک کسی کو آواز بلند کرنے یا سر اُٹھانے کی جُرأت نہ ہو سکی۔ بیسویں صدی

کے اوائل میں چند دانش مند بزرگوں نے انگریزوں سے ہمنوا ہو کر اپنی قوم کو اشاروں، کنایوں اور سرگوشیوں میں بیدار کرنے کی سعی کی جس کا اور کچھ فائدہ ہوا ہو یا نہ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ کہ ایک عرصہ کا جمود ٹوٹتا نظر آیا۔ ادھر جنگِ طرابلس وغیرہ میں انگریزوں کے ہاتھوں ترکوں کی تباہی و بربادی نے ہندوستانی مسلمانوں کو عموماً اور سرحدی سورماؤں اور قبائلی مجاہدوں کو خصوصاً بُری طرح جھنجھوڑا، اور اُن کے دل میں مغربی لٹیروں کے خلاف شدید نفرت اور انتقام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو برطانیہ نے عرب ممالک کے ساتھ تمام حفاظتی معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر اُن پر فوج کشی شروع کر دی اور مسلمانوں کے مقدس مقامات فلسطین، عراق، لبنان اور سعودی عرب کو تاخت و تاراج کرنے لگا اور فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر کے مشرق وسطیٰ کے سینے میں وہ ناسور پیدا کر دیا جس نے عرب ممالک کے آرام و سکون کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غارت کر دیا۔

برطانیہ کے اس مسلم کُش رویّہ نے ہندوستان کے طُول و عرض میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کو غم و غصہ سے بھر دیا، ہر طرف ایک عام بے چینی پھیل گئی اور سرحدی مجاہدین کے دل اپنے بھائیوں کے دُکھ درد سے تڑپنے لگے۔ حکومت برطانیہ کی اس جارحانہ اور ظالمانہ حکمت عملی کے ردّ عمل نے ہندوستان میں تحریک خلافت کو جنم دیا جو انگریزی دَورِ حکومت میں اس برعظیم کی سب سے پہلی تحریک آزادی تھی۔

لیکن سرحد کے حالات مُلک کے دُوسرے حصوں سے مختلف تھے۔ ۱۹۰۱ء میں صوبہ سرحد کو پنجاب سے علیٰحدہ کرنے کے بعد حکومت انگریزی نے یہاں بے پناہ فوجیں ڈال کر ملٹری راج کی سی کیفیت پیدا کر دی ہر طرف ظلم و ستم کا دور دورہ ہوا۔ ہندوستان کے دوسرے

صوبوں کو جو "اُمبری اصلاحات" دی گئیں اس صوبے کو نہ صرف ان اصلاحات سے محروم رکھا گیا ہے بلکہ یہاں "فرانٹیر ریگولیشن" "غازی ایکٹ" اور دوسرے کئی قسم کے ظالمانہ قوانین عاید کر کے یہاں کے باشندوں کو اس حد تک بے دست وپا کر دیا گیا کہ کوئی سیاسی تحریک تو ایک طرف رہی معاشرتی اور اصلاحی کام کرنے والوں کو بھی اِس جرأت کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی اور ان کی سرگرمیوں کو باغیانہ قرار دے کر اس بے دردی سے کچل دیا جاتا کہ دیکھنے والے مدتوں اس سے عبرت حاصل کرتے رہتے۔

انہی ایام میں جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی حفاظتی اقدامات کے تحت اس جبر و تشدد میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ...... ہندوستان کی تمام سیاسی تحریکیں معطل کر دی گئیں اور بڑے بڑے جغادری سیاسی رہنماؤں کے لیے حکومت کی ہمنوائی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا ..... جن چند ایک سرپھروں نے جرأت رندانہ سے کام لے کر نعرۂ مستانہ لگانے کی کوشش کی انہیں گرفتار کر کے جیلوں میں ٹھونس دیا گیا اور ہر طرف ایک موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

اس خوفناک دور میں جب "اٹک پار" کا خطہ آئینی اصلاحات سے محروم تھا، کمپنی کی حکومت نے ہنگامی حالات کا لیبل چپکا کر اس سرزمین کو اپنے جبر و تشدد کی آماج گاہ بنایا ہوا تھا۔ ہر طرف وحشت و دہشت کا دور دورہ تھا۔ یہاں کے لوگوں پر ایسے ایسے شرمناک مظالم توڑے جاتے کہ زمانہ جاہلیت کی یاد تازہ ہو جاتی۔

یوسف زئی قبیلے کے ایک آزاد منش اور بہادر شخص ارسلا خان کو انگریز دشمنی کی پاداش میں نہ صرف قتل کیا گیا بلکہ اس کا مال واملاک غارت کر کے اس کے اہل و عیال کو دربدر پھرایا گیا۔ پشتو کا یہ مشہور ٹپہ اسی حادثے کی یادگار ہے۔

د ارسلا خان تجیرے لسو تہرہ

ادس د رابټ پہ مخکښې ځي سرتور روان ځي

ارسلا خان کی حسین و جمیل لڑکیاں برہنہ سر جنرل رابٹ کے سامنے لے جائی جا رہی ہیں، اسی طرح ایک پشتون حافظ جس نے ایک انگریز افسر مسٹر ایچی سن کو قتل کیا تھا اسے ہاتھی پر سوار کر کے تمام شہر میں پھرایا گیا تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور بعد میں اسے چونے میں جلادیا گیا ایسے استبدادی دور میں اعلائے کلمۃ الحق کرنا جان جوکھوں کا کام تھا لیکن سرحد کی تاریخ اس دور میں بھی اور اس سے پہلے بھی بالکل گونگی نہیں رہی بلکہ اس بھیانک ظلمت میں بھی اس سرزمین نے روشنی کے ایسے ایسے ستون پیدا کئے جن کی سحر آفریں ضیائنے نہ صرف مستقبل کے زندگی بخش نقوش کو ابھارا بلکہ آنے والی نسلوں کی رہنمائی بھی کی۔

باچا خان کے حالات بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان چند اولوالعزم شخصیتوں کی زندگی کی ایک جھلک پیش کر دی جائے جنہیں باچا خان کے پیش روؤں کی حیثیت حاصل ہے۔ اور جنہوں نے یہاں باچا خان سے پہلے نہ صرف یہ کہ جد وجہد کے تسلسل کو قائم رکھا بلکہ اپنی بیش بہا قربانیوں اور مجاہدانہ کارناموں سے ان مقدس روایات کو جنم دیا جن کی وجہ سے آگے چل کر باچا خان جیسا جوان ہمت رہنما پیدا ہوا۔

ہڈے ملا صاحب

عالم بے بدل تھے انگریز دشمنی گھٹی میں پڑی تھی انگریزوں کے خلاف متعدد جنگیں لڑیں۔ آپ افغانستان میں جلال آباد سے تین میل ادھر ہڈہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام نجم الدین اخوند زادہ تھا۔ آپ نے امیر عبدالرحمان والئے کابل کے عہد میں اصلاحی سرگرمیوں کے پردے

میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد شروع کی امیر عبدالرحمان نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا آپ بھاگ کر چرکنڑ آگئے اور وہاں سے لشکر بنا کر شبقدر پر ۱۸۶۳ء میں حملہ کر دیا اور لوٹ مار کر کے واپس آگئے کچھ عرصہ بعد انگریزوں نے حملہ کر کے ہڈہ ملا کے تمام حمائتی قبائلیوں کے گاؤں جلا دیئے اور جب ہڈہ ملا کی مسجد کا محاصرہ کیا تو چند مریدین نے آپ سے کہا کہ انگریز آپہنچے ہیں۔ آپ نے کہا بے فکر رہو اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بعد مریدوں کو حکم دیا کہ جا کر جنگ کریں۔ کہتے ہیں اسی اثنا میں ایسی شدید ژالہ باری ہوئی کہ انگریزی فوج بمشکل جان بچا کر بھاگی اور تمام گولہ بارود اور گھوڑے وغیرہ وہیں چھوڑ گئی۔ ۱۸۹۵ء میں آپ عمرا خان کی حمایت میں انگریزوں سے لڑے۔

ہڈہ ملا مرحوم کا تمام قبائل اور ضلع پشاور و افغانستان میں بہت اثر تھا اور بیشمار مرید تھے۔ حاجی صاحب ترنگزی بھی آپ ہی کے مرید تھے۔ اور حاجی صاحب اپنے پیر کی تعلیم و تربیت کے باعث ہی انگریز دشمنی پر مائل ہوئے۔

موجودہ پیر صاحب مانکی شریف کے دادا اور ان کے پیر سوات بابا ہڈہ ملا سے معاصرانہ رقابت کے باعث ان کے لیے ہمیشہ سد راہ بنے رہے۔

عمرا خان جنڈول

عمرا خان سالارزئی قبیلے میں مست خیل خاندان سے تھا وہ ۱۸۶۰ء میں بمقام جنڈول پیدا ہوا۔ ۱۸۸۰ء میں اپنی ریاست کا انتظام سنبھالا اور اسے سوات دیر اور چترال تک وسیع کر لیا۔ وہ ایک انگریز دشمن شخص تھا اس کی جنگی طاقت خاصی تھی صرف پانچ ہزار مسلح سوار اس کے پاس موجود تھے اس کے علاوہ ہزاروں قبائلی بھی اس کے ساتھ تھے وہ خود نہایت بہادر اعلیٰ اولوالعزم انسان تھا۔ انگریز اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے گھبرائے اور اسے قابو میں لانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

سب سے پہلے انگریزوں نے عمرا خان کے چھوٹے بھائی کو اس کی مخالفت پر ابھارا عمرا خان نے اس پر حملہ کر دیا، نواب دیر نے انگریزوں کے اشارے پر اس کے بھائی کی مدد کی اور عمرا خان کو ہزیمت اٹھانی پڑی، دو برس بعد عمرا خان نے لشکر جمع کر کے پھر نواب دیر پر حملہ کیا۔ اس دفعہ نواب نے شکست کھائی اور عمرا خان کا علاقہ جنڈول سے دریائے پنج کوڑہ تک وسیع ہو گیا اس کے بعد عمرا خان کی انگریزوں سے متعدد بار جھڑپیں ہوئیں۔ لیکن ہمیشہ فتح یاب ہوا۔ ان پے بہ پے کامیابیوں نے اس کے حوصلے بلند کر دیئے اور وہ تمام ہندوستان پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھنے لگا۔

۱۸۹۳ء میں عمرا خان نے آگے بڑھ کر چترال پر حملہ کر دیا اب انگریزوں کے لیے صورت حال ناقابل برداشت ہو گئی انہوں نے پوری فوجی طاقت سے چترال کو کمک دی لیکن عمرا خان کی طاقت بھی کم نہ تھی سخت مقابلہ ہوا۔ قریب تھا کہ انگریز شکست کھا جائے لیکن عین وقت پر انہوں نے عمرا خان کے مشہور سپہ سالار قورے کو جو ایک نہایت اہم مورچے پر اڑ رہا تھا اپنے ساتھ ملا لیا جس سے لڑائی کا پانسہ ہی پلٹ گیا۔ اور عمرا خان کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا اور اس نے افغانستان میں امیر عبدالرحمٰن کے پاس پناہ لی اور وہیں وفات پائی۔

مولوی عبدالعزیز

مولوی صاحب انتہائی طور پر انگریز دشمن انسان تھے۔ یہاں تک کہ کسی انگریز کو دیکھتے تو آنکھیں بند کر لیتے۔ حاجی صاحب ترنگزئی پر اپنے اُستاد چڈے ملا صاحب کا بھی کافی اثر تھا لیکن درحقیقت مولوی عبدالعزیز صاحب جن کا حاجی صاحب بہت عزت و احترام کرتے تھے انہوں نے ہی حاجی صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ پیری مریدی چھوڑ کر یہ راستہ اختیار کریں، امان اللہ خان سابق والئے افغانستان کو اصلاحات پر آمادہ کرنے اور انہیں روشن خیال بنانے میں بھی مولوی صاحب

کا ہاتھ تھا آخر میں آپ سوات جا کر کام کرتے رہے اور وہیں انگریزوں کی سازش سے شہید ہوئے۔

حاجی صاحب ترنگزئی

حاجی صاحب ترنگزئی باچا خان کے پیش رو تھے وہ سب سے پہلے پشتون قائد ہیں جنہوں نے پشتون قوم کی اس مردگی اور گھٹن کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۱۰ء میں ضلع پشاور (جس میں اس وقت مردان بھی شامل تھا) میں اپنے تبلیغی اور اصلاحی مشن کا آغاز کیا اور اس مہم کو اس تن دہی اور سرگرمی سے انجام دینے لگے کہ تھوڑے عرصہ ہی میں ضلع بھر کے لوگوں کے تمام خانگی جھگڑے جھگڑے ڈاکے اور قتل مقاتلے کے مقدمات تک عدالتوں کے بجائے آپ کے قائم کردہ عوامی جرگوں میں فیصل ہونے لگے اور کچہریاں اُجڑی اور ویران نظر آنے لگیں کیونکہ کسی کو وہاں جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ آپ نے فضول اور بُری رسومات بند کرانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور شادی مرگ پر تمام نمائشی رسومات یک قلم بند کرا دیں اس کے علاوہ آپ نے اصلاح و تبلیغ کے لیے صوبہ سرحد کے طول و عرض میں اسلامی مدرسے جاری کئے جس میں بھاری تعداد میں لوگ تعلیم حاصل کرنے لگے اس طرح گویا پشتون قوم میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک مسلح سد قوم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور اُسے اسلامی اور قومی زندگی سے روشناس کرنے کی کوشش کی اس نے صوبہ سرحد کے عوام میں حاجی صاحب نے ایسی ہر دلعزیزی حاصل کر لی جس کی مثال اس صوبے کی تاریخ میں نہیں ملتی

حاجی صاحب اپنے مشن میں اس قدر کامیاب ہوئے کہ جہاں بھی جاتے ہزاروں کی تعداد میں عقیدت مند ان کے گرد جمع ہو جاتے اور ہر طرح سے ان کی مدد کرتے۔ آپ کی تقریباً تین سال کی مسلسل جدوجہد اور بے نظیر کامیابی نے کمپنی کی حکومت کو بدحواس کر دیا

اور وہ بوکھلا کر پشتونوں کی اس سیاسی اور سماجی بیداری کو ایک بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ سمجھنے لگی کیونکہ اس میں بہت حد تک حکومت سے بالعموم انگریزوں سے نفرت اور آزادی کی لگن کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ کو معہ دیگر رفقاء کے گرفتار کر لیا گیا لیکن گرفتاری کے بعد جب حکومت کو حاجی صاحب کے عقیدت مندوں کے جوش و خروش کا پتہ چلا اور صوبہ میں عام بغاوت کا خدشہ نظر آیا تو اس نے حاجی صاحب کو ضمانت پر رہا کر دیا اور آپ کے بعض خلفاء کو تین تین سال قید کی سزا دے دی۔ لیکن جب اس کے بعد بھی آپ کی سرگرمیوں میں کمی فرق نہ آیا تو حکومت آپ کو رہا کر کے سخت پشیمان ہوئی اور آپ کو دوبارہ گرفتار کرنے کی تدبیریں سوچنے لگی۔

یہ ۱۹۱۳ء کا زمانہ تھا۔ ابھی جنگ عظیم کا آغاز ابھی نہیں ہوا تھا۔ انہی دنوں صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم نے اسلامیہ کالج پشاور کی بنیاد ڈالی۔ حاجی صاحب کی قبولیت کے پیش نظر ان کی انگریز دشمنی کے باوجود اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے انہیں دعوت دی گئی۔ اس وقت حاجی صاحب کی گرفتاری کے احکامات جاری ہو چکے تھے لیکن چونکہ آپ نے اس تقریب میں شمولیت کا وعدہ کر لیا تھا اس لیے عین موقع پر آپ عجیب پراسرار طور پر وہاں پہنچے اس وقت آپ نے چادر سے اپنا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ آپ نے نہایت نورانی طور پر دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا اور دوسرے ہی لمحے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے نکل گئے۔ آپ اسی عالم میں پنجے گاؤں پہنچے اور وہاں سے اپنے چند مخصوص ساتھیوں کے ساتھ جنہیں مولوی عبدالعزیز مرحوم بھی شامل تھے ہجرت کر کے بنیر چلے گئے اور وہاں سے مہمندوں کے آزاد علاقے موضع صافی میں جا کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ حاجی صاحب کی یہ ہجرت قید و بند کے ڈر سے نہیں بلکہ ایک باضابطہ پروگرام کے ماتحت تھی۔

حاجی صاحب کے علاقہ غیر میں ہجرت کر جانے سے انگریزوں کے حلقہ میں صف ماتم بچھ

گئی ایک اتنے بڑے صاحب اثر مذہبی رہنما کا ان کے ہاتھ سے نکل کر دشمن کی حیثیت سے قبائلی علاقے میں جا پہنچنا واقعی بڑی خطرناک بات تھی خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ ان دنوں یورپ میں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی اور پہلی جنگ عظیم شروع ہونے کے آثار صاف نظر آ رہے تھے، اس وقت ایک انگریز افسر نے کہا تھا۔

" حاجی صاحب ترنگزئی کا ہمارے ہاتھ سے نکل جانا ہندوستان میں ہماری سب سے پہلی ناکامی ہے "

اور ہوا بھی یہی ...... درحقیقت حاجی صاحب کا آزاد قبائلی علاقے میں ہجرت کر جانا ہند و پاک کی آزادی کے لیے نیک فال ثابت ہوا وہ سیاسی رہنما جو اس حقیقت سے باخبر ہیں بخوبی جانتے ہیں کہ اگر آزاد قبائل میں حاجی صاحب انگریزوں کے خلاف ایک مضبوط محاذ نہ بناتے تو آج ہم آزادی کی منزل سے کوسوں دور ہوتے۔

یہاں اس دور کے چند دوسرے نوجوان مجاہدوں کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا جنہیں انگریز دشمنی کے باعث اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہنا پڑا اور جنہوں نے آزادی کی لگن اور اسلام کی محبت میں نہ صرف اپنا گھر بار چھوڑا بلکہ اپنی تمام زندگی جلاوطنی کے عالم میں گزاری اور بعض کو تو مر کر بھی اپنے پیارے وطن کی خاک نصیب نہ ہو سکی۔

غازی کرنل عبدالرحمٰن

پشاور کے ایک مشہور معزز خاندان کا یہ نونہال علی گڑھ میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر، دسمبر ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ایک طبی وفد کے ہمراہ ترکی پہنچا اور وہاں دوران جنگ میں ایسی مجاہدانہ خدمات انجام دیں کہ حکومت عثمانیہ کے دربار میں انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا جنگ کے اختتام پر ارکان وفد نے واپسی کا ارادہ کیا اور آپ کو اطلاع دی لیکن آپ نے غلام آباد

ہندوستان میں واپس جانا پسند نہ کیا اور مستقل طور پر ترکی ہی کو اپنا وطن بنا لیا جہاں آپ ترقی کر کے کرنل کے اعلیٰ منصب تک پہنچے اور آخر میں ایک سازش کا شکار ہو کر شہید ہوئے۔

سید علی عباس بخاری

آپ ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے اعلیٰ تعلیم پائی لیکن شروع ہی سے انگریز دشمنی آپ کی گھٹی میں پڑی تھی۔ انگریز جو حکومت کے نشے میں ہندوستانیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے آپ کو ان سے سخت نفرت تھی آپ جہاں کہیں کسی انگریز کا توہین آمیز رویہ دیکھتے فوراً تصادم کے لیے تیار ہو جاتے ...... بیسیوں انگریزوں سے ان کی جھڑپیں ہوئی اور کتنے ہی ایسے سرپھرے انگریزوں کو آپ نے پیٹنے سے بھی دریغ نہ کی یہاں تک کہ آخر میں آپ کا نام "انگریزوں کو پیٹنے والا بخاری" پڑ گیا۔

خلافت عثمانیہ کے خلاف حکومت برطانیہ نے اعلان جنگ کیا تو آپ نے مسجد مہابت خاں میں ایک دھواں دھار تقریر کی جس میں انگریز سامراج کی حکمت عمل کے تار و پود بکھیر دیئے تقریر کے بعد گھر پہنچنے کی دیر تھی کہ آپ کو گرفتار کر لیا گیا جیل پہنچ کر آپ نے ایک عام قیدی کی طرح رہنے سے انکار کر دیا اور بہتر کلاس کا مطالبہ کیا۔ اس وقت سیاسی قیدی بہتر کلاس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے آپ نے بھوک ہڑتال کر دی اور اس وقت تک اپنی ہٹ پر قائم رہے جب تک بہتر کلاس اور سیاسی قیدی کی خصوصی مراعات حاصل نہ کر لیں غالباً سرحد میں آپ پہلے سیاسی قیدی تھے جو جیل میں سب سے پہلے بہتر کلاس لینے میں کامیاب ہوئے۔ ایک عرصہ کے بعد جیل سے رہا ہونے پر ایک اجاڑ سے گاؤں میں نظر بند کر دیئے گئے جہاں سے آپ خفیہ طور پر بھاگ کر افغانستان چلے گئے اور باقی ماندہ زندگی وہیں جلا وطنی کے عالم میں گزار کر راہیٔ ملک عدم ہوئے۔

قاضی عبدالولی خان

آپ پشاور کے قاضیوں کے قابل قدر خاندان سے تعلق رکھتے تھے تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملکی سیاسیات میں حصہ لینے لگے آپ ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جنہوں نے یہاں سب سے پہلے عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی مہم کا آغاز کیا اور بے خبر اور غافل لوگوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ آپ نے بھی ترکوں پر برطانوی حملہ کے خلاف اپنے ساتھی سید علی عباس بخاری کے ساتھ احتجاج میں حصہ لیا انگریزوں کے خلاف آتشیں تقریریں کیں انگریزی مال کے بائیکاٹ پر لوگوں کو آمادہ کیا اور اس کے بدلے قید و نظر بندی کی صعوبت جھیلتے رہے۔ آخر تنگ آ کر اپنے وطن سے ہجرت کر کے افغانستان میں پناہ لی لیکن بدقسمتی سے شک و شبہ کی بنا پر وہاں بھی جیل میں ڈال دیئے گئے بعد میں غازی امان اللہ خان کو قاضی صاحب کی شخصیت کا علم ہوا تو انہیں نہ صرف رہا کر دیا۔ بلکہ افسر سرحدات مقرر کیا اور اپنا مصاحب خاص بنا لیا آپ ساڑھے تین برس افغانستان میں مقیم رہے۔ پھر وہاں سے جرمنی اور جرمنی سے ترکی جا پہنچے جہاں اپنے دوسرے جلاوطن بھائیوں کا ایک وفد لے کر سوئزرلینڈ گئے اور ترکی کی حمایت میں ہندوستانیوں کی ترجمانی کرنے لگے وہاں سے جرمنی واپس آ کر ہفتہ وار اخبار "دی کریسنٹ" جاری کیا پھر دوسرا اخبار "مسلم سٹینڈرڈ" نکالا جو یکے بعد دیگرے بند کر دیئے گئے۔ جرمنی و فرانس کے علاوہ آپ نے یورپ کے دوسرے علاقوں کا دورہ بھی کیا اور آزادی ہند کے لیے انتھک جدوجہد کرتے رہے۔

۱۹۱۹ء تک صوبہ سرحد کی سیاسی باگ ڈور آپ کے ہاتھوں میں رہی، با اصول مخلص اور بے باک انسان تھے یہاں کے اولین رہنماؤں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

محمود سنجری، محمد اسلم سنجری

محمود سنجری مرحوم اور محمد اسلم سنجری پشاور کے بہت پرانے سیاسی کارکن ہیں ۱۹۱۹ء میں انڈین ڈیفنس ایکٹ

کا صوبہ سرحد میں سب سے پہلا شکار یہ دو بھائی اور اُن کے والد ہوئے آپ یہاں کے اوّلین سیاسی کارکنوں کے ہراول دستہ میں شمار ہوتے ہیں ۱۹۱۹ء تک قید رہے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر شاہی اعلان کی رو سے ہندوستان کے تمام سیاسی نظربندوں کے ساتھ آپ بھی رہا ہو گئے ۱۹۱۹ء میں یہ دونوں بھائی اینٹی رولٹ ایکٹ ایجی ٹیشن میں انقلابی پارٹی کے انتھک کارکن ثابت ہوئے انہیں دنوں بغاوت کے الزام میں حکومت نے انہیں گرفتار کرنا چاہا لیکن بھاگ کر افغانستان چلے گئے آخر وہاں بھی حکومت برطانیہ کی سفارش پر گرفتار کر لیے گئے اور پورے چودہ برس جیل میں محبوس رہے ——— قیام پاکستان کے بعد پشاور آ گئے ۵۲ء میں بڑے بھائی نے انتقال کیا۔ چھوٹے بھائی محمد اسلم سنجری اینٹی یونٹ فرنٹ اور نیشنل پارٹی میں اب تک نہایت سرگرمی اور تن دہی سے حصہ لے رہے ہیں۔

صنوبر حسین مومند

مومند قبیلے کا یہ آہنی انسان پشاور سے تین میل کے فاصلے پر گگے ولہ گاؤں میں پیدا ہوا۔ ضروری تعلیم کے بعد ملکی سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔ جمعیت نوجوانان سرحد اور نوجوان بھارت سبھا جیسی انقلابی جماعتوں کی یہاں نہ صرف بنیاد ڈالی بلکہ انہیں ہمیشہ پیش پیش رہے اور قید و بند کے مصائب جھیلتے رہے۔ جب یہاں رہ کر کام کرنے کے ذرائع مسدود دیکھے تو اپنے ساتھیوں سمیت آزاد قبائلی علاقے میں جا کر پورے اٹھارہ برس تک انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیتے رہے قیام پاکستان کے بعد اپنے وطن واپس آئے لیکن اپنی قومی حکومت نے بھی انہیں آرام سے نہ چھوڑا اور یکے بعد دیگرے دو دفعہ گرفتار ہو کر تقریباً تین برس جیل میں گزارنے پڑے۔

سابق صوبہ سرحد کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دلانے کے لیے اہل سرحد کو بھاری قربانیاں دینی پڑیں۔ اس جدوجہد کی خون چکاں تاریخ نصف

صدی تک پھیلی ہوئی ہماری تاریخ آزادی کا ایک ناقابل فراموش باب ہے جو نہایت دردناک واقعات و حادثات سے معمور ہے جس میں ایک طرف بہادر پشتون عوام کی پروانہ وار جانثاری ہے تو دوسری طرف انگریز سامراج کے جابرانہ، ظالمانہ اور وحشیانہ تشدد کے دہشتناک مناظر ہیں جن سے چنگیز و ہلاکو کی روحیں بھی شرما جائیں۔

اس متشددانہ دور میں جن اولوالعزم حضرات نے سر دھڑ کی بازی لگا کر قوم کی راہنمائی کا بیڑا اٹھایا انہیں وقت کا شداد کتنا ہی پس پشت ڈالنے کی کوشش کیوں نہ کرے لیکن مستقبل کا مؤرخ ان کے سنہری کارناموں، سرفروشانہ اقدامات اور بے پناہ قربانیوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

برعظیم ہند و پاک کی جنگ آزادی میں سرحدی راہنماؤں کا بڑا حصہ ہے۔ اس مردم خیز خطے نے گزشتہ نصف صدی میں کتنی ہی ایسی گرانمایہ سیاسی شخصیتیں پیدا کیں جن کے مجاہدانہ کردار پر ہماری قوم اور ملک بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

خان عبدالغفار خان المعروف باچا خان سرحد کی انہی غیر فانی شخصیتوں میں سے ہیں آپ نہ صرف ملک کے اس پار بسنے والی شمشیر زن پشتون قوم کے مقبول اور محبوب رہنما ہیں بلکہ متحدہ ہندوستان کے ان چند ایک چوٹی کے سیاسی رہنماؤں میں سے ہیں جنہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ آپ اس "خدائی خدمت گار" تحریک کے بانی مبانی ہیں جس نے قبیلوں، خیلوں اور زئیوں میں بٹی ہوئی پشتون قوم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ آپ نے سرحدی دیہات کے طوفانی دورے کر کے پشتونوں میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ آپ کی آتشیں تقریروں نے سرحد کے گوشے گوشے میں بغاوت کے شعلے بھڑکا دیئے اور آزادی کے پروانوں نے دیوانہ وار شمع حریت پر اپنی جانیں نثار کر دیں، جیل بھر دیئے، گولیوں

اور سنگینوں سے سینے چھلنی کرائے گھر لٹوائے اپنی بیویوں لڑکیوں اور ماؤں بہنوں کی بے عزتی اپنی آنکھوں سے دیکھی مگر اُف تک نہ کی۔

باچا خان کو قیام پاکستان کے بعد اپنی قومی حکومت نے بھی ایک طویل عرصہ تک قید و بند اور جلاوطنی کا شکار بنایا ان کی عمر اس وقت ۸۰ سال کے قریب ہے مسلسل قید و بند کی صعوبتوں اور دات دن کی مسلسل دوروں نے ان کی صحت بہت حد تک بگاڑ دی ہے سرخ و سفید چہرہ زرد پڑ گیا ہے اور اس پر جھریوں نے قبضہ جما لیا ہے۔ اعضا مضمحل اور سر اور داڑھی کے بال برف کی طرح سپید ہو چکے ہیں لیکن ان کے عزم و حوصلے میں ذرا بھر فرق نہیں آیا۔ ان کے حوصلے بلند اور عزائم اب بھی جوان ہیں وہ اب بھی اپنا تمام کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور میلوں پیدل چل کر دیہات کے دورے کرتے ہیں لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں ان کی خدمت کرتے ہیں اور اُن کا دکھ درد بٹاتے ہیں۔

پشتون عوام بابا خان کو دل وجان سے چاہتے ہیں اُن کی پرستش کرتے ہیں اور انہیں اپنا واحد رہنما مانتے ہیں۔ بلاشبہ آج بھی ان کی آواز ساری پشتون قوم کی آواز ہے۔

درحقیقت باچا خان کی زندگی کو سرحد کی سیاسی تاریخ سے الگ کر کے کسی صورت نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ یہاں شروع سے آخر تک سیاسی جدوجہد کی روح رواں رہے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس خطے کی تمام سیاسی تاریخ باچا خان کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ اس لیے اس پس منظر کے بغیر ان کی زندگی کے صحیح خدوخال کو سامنے لانا محال ہے

باچا خان صرف سرحدی نہیں سارے ملک کے سیاسی رہنماؤں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

باچا خان میں بے شمار ایسی خصوصیتیں ہیں جو انہیں دوسرے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہیں

باچا خان نہایت بلند اور اعلیٰ کردار کے مالک اور با اصول انسان ہیں انہوں نے اپنی چالیس سالہ سیاسی زندگی میں سے تقریباً پچیس برس کا طویل عرصہ قید و بند اور نظر بندی کی نذر کر دیا۔ اور کبھی بھول کر بھی اس کی شکایت نہیں کی اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگ جنہوں نے وطن کی راہ میں تھوڑی بہت تکلیفیں بھی گزاری ہیں رات دن نہ صرف اس کا اظہار کرتے نہیں تھکتے بلکہ اُن کا معاوضہ طلب کرنے سے بھی نہیں چُوکتے اور بعض تو اپنی قربانیوں کا بھاری معاوضہ وصول کرنے کے بعد بھی مطمئن نظر نہیں آتے بلکہ کچھ نہ کچھ مزید حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔

باچا خان ذاتی طور پر اقتدار پرست نہیں بلکہ ہمیشہ اس چیز کے مخالف رہے ہیں جس کا ثبوت اُن کے حالات زندگی سے فراہم ہو سکتا ہے۔ وہ نام و نمود کی خواہش سے بھی کوسوں دُور ہیں چنانچہ غیر ضروری جلسے جلوسوں اور تقریروں سے انہوں نے بیشتر اوقات اجتناب کرنے کی کوشش کی۔

باچا خان فطرتاً عزلت پسند واقع ہوئے ہیں وہ بنیادی طور پر ایک روحانی آدمی ہیں انہیں سیاسیات میں مجبوراً آنا پڑا بالکل اسی طرح جیسے پشتو کے عظیم شاعر خوشحال خان خٹک کو قلم چھوڑ کر تلوار سنبھالنی پڑی کیونکہ قوم پر ایسی افتاد آن پڑی تھی کہ ان کے لیے خاموشی سے گوشۂ عزلت میں بیٹھنا ناممکن ہو گیا تھا وہ حساس تھے، غیور تھے۔ ان کی قوم ذلت و نکبت کے عمیق گڑھوں میں ڈھلکتی جا رہی تھی اسے سچی اور مخلصانہ رہنمائی کی ضرورت تھی خود اُن کی ضرورت تھی اس لیے وہ آنکھیں نہ چُرا سکے اور سر بکف ہو کر میدان میں کود پڑے۔ ... عہد انگریزی میں انھوں نے انگریز کے انتہائی تشدد اور استحصال کے باوجود کبھی کوئی کمزوری نہیں دکھائی۔

وہ ان جرنیلوں میں سے نہیں جو اپنی فوج کو آتش و خون کے سمندر میں جھونک کر خود تماشا دیکھتے رہے ہوں بلکہ ہر آزمائش کے موقع پر سب سے پہلے انہوں نے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا، ہر سخت اور مشکل لمحے میں وہ ہمیشہ سب سے آگے سینہ تانے ہوئے نظر آئے۔

ہندوستان کے دوسرے حصوں کے لوگ نسبتاً ترقی یافتہ تھے تعلیم و تربیت اور سیاسی شعور میں کافی آگے تھے پھر وہاں کمپنی کی حکومت کے احتساب کا بھی یہ عالم نہیں تھا اس لیے وہاں سیاسی رہنماؤں کو کام کرنے کے لیے زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

لیکن اٹک پار کے حالات وہاں سے بالکل مختلف تھے یہ خطہ شروع ہی سے نہایت پسماندہ واقع ہوا تھا، عوام میں تعلیم نہیں تھی، سیاسی بیداری نہیں تھی، نکبت، غربت اور معاشی بدحالی نے ان کے چھکے چھڑا دیئے تھے حکومت اور خوانین کی ملی بھگت نے لوگوں کو اتنا دبا رکھا تھا اتنا جکڑ رکھا تھا کہ وہ ہل نہیں سکتے تھے بول نہیں سکتے تھے، کچھ سوچ نہیں سکتے تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کے خصوصی ظالمانہ قوانین نے انہیں اپاہج بنا رکھا تھا۔

باچا خان کو ایسے پس ماندہ ماحول، بے روح فضا اور مفلوج طبقے میں کام کرنا پڑا۔ انہوں نے سب سے پہلے جاگیرداروں، خوانین اور سرمایہ داروں کے خلاف آواز اٹھائی نچلے طبقے کو ان کی نکبت اور بدحالی کا احساس دلایا، انہیں بتایا کہ تمہاری تباہی و بربادی تقدیر کا کرشمہ نہیں بلکہ اونچا طبقہ اس کا ذمہ دار ہے جو تمہاری محنت اور خون پسینے کی کمائی پر عیش و عشرت کرتا ہے اور تمہیں فاقوں کی آگ میں جلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ خدا ظالم نہیں عادل ہے، وہ بے انصاف نہیں بلکہ بہت بڑا منصف ہے اس نے کسی کو بڑا چھوٹا نہیں بنایا اس نے سب کو ایک جیسا پیدا کیا ان پر اپنی نعمتوں کی یکساں ارزانی کی لیکن بعض انسانوں نے ان نعمتوں کو اپنے لیے مخصوص کر لیا اور دوسروں کو ان سے ہمیشہ کے لیے محروم

کر دیا انہوں نے عوام کو بتایا کہ تمہاری بھوک، ننگ اور آشفتہ حالی کا ذمہ دار وہ انگریز ہے جو سمندر پار سے آ کر تمہیں سالہا سال سے لوٹ رہا ہے تمہارے ملک کی دولت پر ڈاکے ڈال رہا ہے۔

وہ غریب لوگوں کے حجروں میں جا کر اُن کے ساتھ زمین پر بیٹھے ان کے دُکھ درد میں شریک ہوئے اور ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے بعد انہیں بتایا کہ خان بھی تمہاری ہی طرح گوشت پوست کا انسان ہے اس لیے اس سے ڈرنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں اور اس کے برابر چارپائی پر بیٹھنا تمہارا حق ہے۔

انہوں نے احساسِ کمتری کے شکار غریبوں کے دلوں سے خانوں، پولیس، اور حکومت کا خوف نکال کر انہیں بہادری، اولوالعزمی اور جرأت کا درس دیا۔ جس انگریز کو دیکھتے ہی وہ سلام کرتے تھے اس سے نفرت دلائی اور اس سے ٹکر لینے کے لوگوں کو تیار کیا۔

پھر ملک کی جنگ آزادی شروع ہوئی اور آپ پورے چالیس برس تک اس برطانوی شہنشاہیت سے لڑتے رہے جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوا تھا اُس کے پاس بھاری ٹینک، ہوائی جہاز، بم، بندوقیں، سنگینیں اور کبھی ختم نہ ہونے والی فوج تھی اور ادھر غیر مسلح بے دست و پا وطن کے سپاہی —— اُدھر تلواریں تھیں اور اِدھر گردنیں، اُدھر گولیاں تھیں اور اِدھر سینے، اُدھر پھانسی کے پھندے تھے، وحشت و درندگی کے مظاہرے تھے، جیل اور چکیاں تھیں اور اِدھر وطن کے جانثار پروانے، اُدھر آتشِ نمرود تھی اور اِدھر ایمانِ براہیمی اُدھر غیض فرعونی تھا اور اِدھر صبرِ موسوی، اُدھر بوجہل کا غضب تھا اور اِدھر غلامانِ محمد کا صبر و استقلال اور انجام کار فرعون غرقِ نیل اور بوجہل قتیل ہو کر رہا اور انگریز سامراج کی سلطنت کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

اتنا کچھ ہوا جب کہیں جا کر آزادی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔

یہ اتنا آسان کام نہ تھا جن لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ان کے خالی خولی نعروں، بیانوں اور تقریروں سے صرف چند دنوں میں آزادی مل گئی وہ دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں حقائق کو جھٹلا رہے ہیں، ان کا یہ دعویٰ ——

بہت بڑا فراڈ ہے۔

تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ہے

اور

دیدہ دلیری کی انتہا ہے

انگریز اتنا کم ہمت، اتنا نادان، اتنا ڈرپوک نہیں تھا کہ وہ شیر قالین قسم کے لوگوں کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈر کر بھاگ جاتا، اسے نکالنے کے لیے ملک کو دیو استبداد کے پنجہ سے چھڑانے کے لئے حصول آزادی کے لئے یہاں

برسوں طوفانی جدوجہد کی گئی

سالہا سال تک دلیرانہ جنگ لڑی گئی

مدتوں خوفناک مقابلے کئے گئے

ہماری جنگ آزادی کی تاریخ ایک خونیں داستان ہے جو ہولناک اور دردناک واقعات سے اٹی پڑی ہے جس کا آغاز تو المیہ تھا ہی —— لیکن انجام کو بھی خود غرض اور بے درد لوگوں نے المیہ بنا کر چھوڑا۔

اس جنگ کے دل دہلانے والے واقعات پر نظر کی جائے تو انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس میں مجاہدین وطن کو ——

تلواروں کی دھار پر رقص کرنا پڑا

آتش و خون کی لہروں سے کھیلنا پڑا

ہیبت پہاڑوں اور چٹانوں سے ٹکر لینا پڑی

اس میں کتنے ہی حافظ، ہری کشن، حبیب نور اور غازی عبدالرشید جانوں پر کھیل کر اپنی جوانیوں کو آزادیٔ وطن پر بھینٹ چڑھا گئے، سینکڑوں انسانوں نے اپنے مقدس خون سے نخل آزادی کو سینچا، اسے پروان چڑھایا اور اسے خزاں کے بے رحم ہاتھوں سے بچانے کے لیے اپنے تن من دھن کی بازی لگا دی۔

اور جب آزادی ملی تو اس کا سہرا کس خوش نصیب کے سر نظر آیا یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔

بقول باچا خان جو ہونا تھا ہو گیا اس کا نہ کوئی گلہ ہے نہ شکایت ... مقصد آزادی حاصل کرنا تھا سو پورا ہو گیا، یہ اعزاز جس کی قسمت میں لکھا تھا اسے مل گیا۔ ہماری بے لوث خدمت تھی کوئی لالچ نہ تھا کوئی غرض نہ تھی تمبداری کے ہم قائل ہیں نہ اس کے نہ ملنے کا افسوس ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ باچا خان ملک کی تقسیم نہیں چاہتے تھے وہ ہندوؤں مسلمانوں کے اختلافات کا کوئی ایسا خوشگوار حل چاہتے تھے جس میں کوئی بھی نقصان میں نہ رہے اور ملک کی وحدت بھی قائم رہے لیکن ایسا کوئی حل بھی باوجود انتہائی کوششوں کے نہ مل سکا اور آخر ملک تقسیم ہو گیا، بھارت اور پاکستان ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو الگ الگ ریاستیں بن گئیں، اٹک پار کا خطہ پاکستان کے حصے میں آیا۔

قیام پاکستان کے بعد باچا خان اور اس کی جماعت نے اسے برضا و رغبت قبول

کریا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ یہیں رہ گئے اگر وہ پاکستان کو تسلیم نہ کرتے تو نہایت آسانی سے بھارت چلے جاتے جہاں ان کے لیے سب کچھ موجود تھا لیکن انہیں اپنا ملک عزیز تھا انہوں نے یہیں رہنا پسند کیا اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اسے ذہنتاً قبول کر چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے پارلیمنٹ میں حلف وفاداری لیا اور بار بار اعلان کیا کہ پاکستان بننے کے بعد اس سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں رہا یہ ہمارا وطن ہے اور اس کی خدمت اور حفاظت کو ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود بعض مفسدہ پرداز لوگوں نے ملک کے با اختیار لوگوں کے دل میں شکوک و شبہات کا ایسا زہر بھر دیا کہ . باچا خان کے مسلسل اعلانات، یقین دہانیوں اور اپیلوں پر بھی ان کی غلط فہمیاں دُور نہ ہو سکیں ان کے دل صاف نہ ہو سکے ان کی رائے نہ بدل سکی

ان کی جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا

انہیں گرفتار کر کے طویل مدت کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا

ان کی جائیداد اور مال منال ضبط کر لیا گیا

ان کے پیروؤں پر شرمناک مظالم ڈھائے گئے

اور خود باچا خان پر افسوسناک اور دل دکھانے والے الزامات لگائے گئے۔

ملک سے وفاداری کا پیمانہ با اختیار لوگوں کی وفاداری قرار دیا گیا اور تمام مخالفت پر غدار، وطن دشمن اور غیر ملکی حکومتوں کے ایجنٹ ہونے کا گھناؤنا الزام لگا کر بیرونی دنیا کی نظروں میں پاکستان کے وقار کو انتہائی نقصان پہنچایا گیا کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہاں چند ایک با اختیار لوگوں کے سوا اور کوئی بھی وطن دوست شخص موجود نہیں

باچا خان کو اس بات کا افسوس نہیں کہ ــــــ

ان کی توقعات کے خلاف ملک کی تقسیم کیوں عمل میں آئی

انہیں اس بات کا صدمہ نہیں کہ ــــــ

حکومت کی باگ ڈور انہیں کیوں نہ ملی جو اس کے حقیقی حقدار تھے۔

انہیں صرف اس بات کا دکھ ہے کہ ــــــ

آج انہیں وہ لوگ وطن دشمنی کا الزام دے رہے ہیں جو خود کبھی بھی وطن دوست نہیں رہے ان کی بے پناہ قربانیوں کا صلہ آج انہیں یہ مل رہا ہے کہ ــــــ

کہ ان جیسے وطن پرست شخص پر جنہوں نے اپنا سب کچھ وطن کے ناموس، عزت اور آزادی کے لیے قربان کر دیا غدار وطن کا ذلیل ترین بہتان لگاتے ہوئے وہ لوگ ذرا نہیں شرماتے جو اس لفظ کا صحیح مفہوم سمجھ پائیں تو انہیں ڈوبنے کے لیے ان کا اپنا عرق ندامت بھی کافی ہوگا۔

باچا خان کو ان باتوں سے بید دکھ پہنچا ہے اور پہنچنا بھی چاہیے کیونکہ یہ باتیں ہی کچھ ایسی ہیں کہ کوئی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس صدمے سے یا تو اس کی حرکت قلب بند ہو جاتی یا کم از کم توازن دماغی کھو بیٹھتا لیکن باچا خان بڑے دل گردہ کے انسان ہیں وہ اس دکھ کے باوجود ان لوگوں کی طرف دوستی کا ہاتھ ابھی تک بڑھا رہے ہیں وہ مسکرا کر کہتے ہیں کہ یہ لوگ نادان ہیں اپنے نفع نقصان کا خیال بھی نہیں کر سکتے وہ اتنا نہیں سوچتے کہ میری دوستی سے انہیں فائدہ ہی فائدہ ہے نقصان کوئی نہیں میں تو خدائی خدمتگار ہوں میں تو ان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں میں ان سے عہدے نہیں مانگتا حکومت نہیں مانگتا پیسے نہیں مانگتا میں تو صرف خدمت کرنے کی اجازت مانگتا ہوں ایسے کہ یہ میری فطرت ثانیہ بن چکی ہے میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتا میں خدمت کرتا رہوں اور جب تک زندہ ہوں خدمت کرتا رہوں گا یہی میری زندگی ہے اور یہی میری زندگی کا مقصد

حصّه
اوّل

باچاخان

ابتدائی حالات

پشاور سے ۲۲ میل دُور دریائے سوات کے کنارے ایک چھوٹا سا سرسبز وشاداب قصبہ واقع ہے جس کا نام ہشت نگر ہے۔ یہ قصبہ برِ عظیم ہند و پاک کی تاریخ آزادی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے جسے فخرِ افاغنہ خان عبدالغفار خان عرف باچا خان کی جنم بھومی ہونے کا فخر حاصل ہے۔

باچا خان ہماری جنگ آزادی کا ہیرو ——— جو اپنی طویل قامت، خوبصورت خدو خال اور پُر جلال چہرے سے قدیم یونانی مصوّروں کا شہکار مجسمہ معلوم ہوتا ہے۔

جو آسمانوں کی بلندی اور پہاڑوں کا عزم لیے آج بھی پورے استقلال سے اپنے مقام پر ایستادہ ہے جس کی داستان حیات پورے برِ عظیم کی جنگ آزادی کی داستان ہے۔

جس کی چالیس سالہ سیاسی جد وجہد کی دکھ بھری کہانی متحدہ ہندوستان کے بدترین غلامانہ دور کی کہانی ہے جو سنگلاخ ماحول کا پروردہ ایسا فولادی انسان ہے جسے انگریز سامراج

کے ظلم و استبداد کی بھٹی کے جہنمی شعلے بھی نہ پگھلا سکے۔ جس کے بلند عزائم کو انگریز کی جابر حکومت کی انتہائی قوت بھی نہ جھکا سکی۔ جس کی خارا شگاف ہمت نے مصائب کے پہاڑوں کو مسمار کر دیا جس کی قوت ایمانی نے باطل کی صفوں کو الٹ دیا۔

باچا خان صبر و استقلال کا پیکر، ایثار کا مجسمہ، کردار و عمل کا بے مثال نمونہ —— جس کی بے نظیر قربانیوں نے ملک و قوم کو غلامی کے جہنم سے نکال کر آزادی کی جنت سے روشناس کرایا، جس کی مسلسل مجاہدانہ ضربوں نے انگریزوں کی شہنشاہیت کے مہیب بت کو چکنا چور کر دیا اور وہ اس سرزمین سے اپنی حاکمیت کا تسلط اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔

باچا خان —— جس کی سالہا سال کی بے خوابی نے ہماری آزادی کے سہانے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ جس کی برسوں کی کاوشوں نے ہمیں غلامی و محکومی کے قعر مذلت سے نکالا جس کی مدتوں کی تگ و دو سے پاکستان کی حقیقی ریاست عالم وجود میں آئی۔

باچا خان —— جو
ملک کا نجات دہندہ ہے
قوم کا حقیقی محسن ہے
آزادی کا دیوتا ہے
پاکستان کا ——
مصطفےٰ کمال ہے
ابراھم لنکن ہے
جنرل ناصر ہے

باچا خان نے ہوش سنبھالا تو ملک میں جنگ آزادی کا آغاز ہو چکا تھا، ہندوستان میں

مختلف سیاسی تحریکیں شروع تھیں، متشدد جماعتیں کام کر رہی تھیں۔ انگریز حکومت کا استحصال اور وطن پرستوں کا استقلال دونوں اپنے اوج کمال پر پہنچ چکے تھے برسوں کی غلامانہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان کروٹ لے کر بیدار ہو چکے تھے اور ان سلاسل کو توڑنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے تھے، بے حس اور بے جان لوگوں میں زندگی کا احساس پیدا ہو چلا تھا ملک میں ہر طرف "انقلاب زندہ باد" کے نعرے گونج رہے تھے۔

ملک کے دوسرے حصوں میں آزادی کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی اس کی آنچ صوبہ سرحد تک بھی آپہنچی تھی اور یہاں بھی بعض سر پھرے نوجوان سر دھڑ کی بازی لگا کر میدان میں کود پڑے تھے، انگریزوں سے ٹکرا رہے تھے شمع آزادی پر پروانہ وار اپنی جانیں نثار کر رہے تھے۔

لیکن اس وقت تک کوئی منظم کام نہیں شروع ہوا تھا۔ . . . .

کمیٹی کی شاخیں قائم کر دی گئیں اور کسی حد تک منظم کام ہونے لگا لیکن پھر بھی یہ تنظیمیں محض پشاور کے شہری حلقے تک ہی محدود تھیں اور صوبہ سرحد کے دوسرے حصوں اور خصوصاً دیہات کی طرف توجہ دینے کا کسی کو موقع نہ مل سکا۔

باچا خان نے اس کمی کو بری طرح محسوس کیا اور اس لیے شروع ہی سے انہوں نے دیہات کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کی اور اپنی تنظیم کو سارے صوبے میں پورے نظم و نسق کے ساتھ چلایا، پھیلایا اور اسے ہمہ گیر بنایا۔

باچا خان کے والد بہرام خان اتمان زئی کے بہت بڑے خان اور زمیندار تھے۔ انگریز حکمرانوں سے ان کے تعلقات بڑے خوش گوار تھے، ۱۸۵۷ء کے غدر کو ناکام بنانے میں انہوں نے انگریزوں کی بڑی مدد کی اور اس کے صلہ میں سیکڑوں ایکڑ زمین جاگیر میں پائی

اپنے علاقے کے تمام انگریز افسر اُن کی قدر کرتے تھے اور انہیں احترام سے "چچا" کہا کرتے تھے۔

یہ تنگ و تاریک اور گھٹا ہوا ماحول تھا جس میں سب سے پہلے "خدائی خدمت گار" باچا خان نے ۱۸۹۰ء میں آنکھ کھولی وہ اپنے محترم والدین کا پانچواں بچہ تھا، ان کا خاندان پشتونوں کے مشہور قبیلے محمد زئی سے تعلق رکھتا ہے، آپ کی پیدائش کے وقت گھر میں اولاد نرینہ میں سے آپ کے ایک بڑے بھائی عبدالجبار خان عرف ڈاکٹر خانصاحب موجود تھے۔ جن کی تاریخ پیدائش ۱۸۸۳ء ہے۔

ڈاکٹر خان صاحب نے مشن ہائی سکول پشاور سے میٹرک اور ایڈورڈز کالج سے ایف اے کیا، ایک سال تک بمبئی گرانٹ میڈیکل کالج میں رہے اور پھر ڈاکٹری کی تکمیل کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے۔

خان عبدالغفار خان نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر مشن ہائی سکول میں پڑھتے رہے، میٹرک کے امتحان میں فیل ہونے کے سبب سکول چھوڑ کر علیگڑھ چلے گئے لیکن وہاں سے بھی تعلیم ادھوری چھوڑ کر آنا پڑا۔

تعلیم چھوڑنے کے بعد والد نے فوجی ملازمت کے لیے مجبور کیا لیکن ایک انگریز افسر کے ہاتھوں اپنے ایک دوست کی توہین ہوتی دیکھ کر آپ نے یہ ارادہ بھی ترک کر دیا پھر باپ نے انجینیری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیجنا چاہا جہاں آپ کا بڑا بھائی ڈاکٹر خانصاحب پہلے ہی سے ڈاکٹری کی تکمیل کے سلسلہ میں مقیم تھا لیکن آپ کی والدہ صاحبہ جنہیں سب سے چھوٹا بچہ ہونے کے باعث آپ سے والہانہ محبت تھی آپ کی مفارقت گوارا نہ کر سکیں اس لیے آپ اپنے والد کی اس خواہش کو بھی پورا نہ کر سکے (افسوس کہ جس والدہ سے آپ کو اتنی محبت

تھی مرتے وقت اس کا منہ بھی نہ دیکھ سکے نہ جنازے میں شامل ہو سکے کیونکہ اس وقت آپ جیل میں تھے)

اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق باچا خان خود فرماتے ہیں۔

"ہماری طرف اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنا خلاف شرع سمجھا جاتا تھا البتہ مسجدوں میں مکتب ہوتے تھے۔ جہیں مولوی قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے اور تھوڑی بہت مذہبی تعلیم دیتے تھے۔ برطانوی دور کے شروع ہوتے ہی یہ مکتب تو بند ہو گئے لیکن انکی جگہ بہت تھوڑے سے اسکول قائم ہوئے لوگ ان نئے اسکولوں کے بہت خلاف تھے لیکن میرے والد اتنے تنگ نظر نہ تھے انہوں نے ہمیں مشن اسکول میں داخل کرا دیا میرے بھائی نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا ایک سال بمبئی کے گرانٹ میڈیکل کالج میں رہے اس کے بعد ڈاکٹری کی تکمیل کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے۔ جب بھائی صاحب کو انگلستان بھیجنے کا مسئلہ پیش آیا تو ہماری قوم میں بڑا واویلا مچا لوگ یہ اندیشہ ظاہر کرتے تھے کہ کہیں وہ عیسائی نہ ہو جائیں یا وہیں سکونت اختیار نہ کر لیں یا کسی انگریز لڑکی سے شادی نہ کر لیں، آخری بات پوری بھی ہوئی لیکن میرے والد ان معاملات میں بڑے وسیع النظر تھے انہوں نے فرمایا کہ میں اپنے لڑکوں کی تعلیم کے راستے میں حائل ہونا نہیں چاہتا۔

بدقسمتی سے میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس نہ کر سکا، میرے انگلستان بھیجنے کے معاملہ پر بھی غور کیا گیا لیکن اتفاق سے خاندان میں دو تین موتیں واقع ہو گئیں اور یہ ایک بدشگونی سمجھی گئی ان خانگی حادثات اور توہمات کی وجہ سے میرے دو قیمتی سال ضائع ہو گئے۔ بالآخر بھائی صاحب کے ایک انگریز لڑکی سے شادی کرنے کی وجہ سے میرا انگلستان جانا ہمیشہ کے لیے ملتوی ہو گیا اور میری تعلیم یہیں ختم ہو گئی۔

لیکن مشن اسکول کی تھوڑے عرصہ کی تعلیم سے بھی مجھے بہت کچھ فائدہ ہوا اسکول کے پرنسپل ریورنڈ وگرام کی نیک سیرت اور نفس کشی نے انہیں شاگردوں میں ہردلعزیز بنا دیا تھا میں نے اپنے پرنسپل کو دیکھ کر اسی زمانہ میں یہ عہد کیا کہ میں بھی اسی طرح اپنی قوم کی خدمت کروں گا۔ ابھی میرے انگلستان جانے کا معاملہ بالکل ختم نہ ہوا تھا اور میں نے سیاسی میدان میں قدم نہ رکھا تھا کہ مجھے فوج میں داخل ہونے کا شوق پیدا ہوا تاکہ ایک سپاہی کی حیثیت سے نام پیدا کروں پٹھان تو پیدائشی سپاہی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں میں ایک معزز خاندان کا فرد تھا یہ چیز میرے لیے اور بھی سفارش بنی اور میری درخواست منظور ہو گئی۔ فوج میں داخل ہونے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا میری جان پہچان کے بہت سے لوگ اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے میں دل ہی دل میں فخر کیا کرتا تھا کہ میں خاص طور سے اس کے لیے موزوں ہوں۔ لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا اتفاق سے میں اپنے ایک فوجی دوست سے ملنے گیا اور وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے یہ ذلت آمیز منظر دیکھا کہ ایک نیچے کے درجہ کے انگریز نے ان کی سخت توہین کی بس میں نے وہیں طے کر لیا کہ فوج میں ہرگز داخل نہ ہوں اس کے بعد ایک سال تک علی گڑھ میں رہا وہاں جا کر اردو پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خاں کے روزنامہ اخبار زمیندار اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور ہفتہ وار اخبار الہلال کا (جو افسوس کہ جنگ کے زمانہ میں بند کر دیا گیا) میں بڑے انہماک سے مطالعہ کیا کرتا تھا سیاسیات سے میرا تعلق یہیں سے شروع ہوتا ہے اور قومی تعلیم سے مجھے اس وقت دلچسپی ہوئی جب کہ ۱۹۱۱ء میں صوبہ میں بہت سے قومی اسکول قائم کرنے میں میں نے خاص حصہ لیا تھا جنگ عظیم کے بعد ہماری خدمات کے صلہ میں رولٹ بل کا تحفہ ہمیں پیش کیا گیا اور مہاتما جی نے اس کے خلاف کارروائی شروع کی تو میں بلاتامل اس میں شریک ہو گیا دوسرے صوبوں کی طرح ہمارے

صوبہ میں بھی ایسی ہڑتالیں ہوئیں جن کی اس سے قبل نظیر نہیں ملتی۔ اتمان زئی کے ۱۷ اپریل ۱۹۱۹ء
والے جلسہ میں تقریباً ایک لاکھ آدمی شریک ہوئے سب والا بھی موجود تھے اس وقت مسئلہ گرو کا کوئی
ذکر بھی نہ تھا لیکن اس جلسہ کا ہونا ہی افسروں کے لیے بہت کافی تھا چنانچہ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔
گر مقدمہ نہیں چلایا۔ گرفتاری سے پہلے مجھ سے دریافت کیا۔ کیا تم پٹھانوں کے بادشاہ ہو۔ میں
نے جواب دیا میں نہیں جانتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ قوم کا خادم ہوں اور اس قسم کے قوانین کو
خاموشی سے برداشت نہیں کر سکتا میرے پاس ایک جرگہ بھی آیا اس نے طرح طرح کی دھمکیاں
دیں اور بہت سی سطحی دلیلیں پیش کیں ان میں سے ایک دلیل یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں
انہوں نے کہا کہ ہمارے صوبہ میں جو قانون انسداد جرائم سرحد نافذ ہے وہ رولٹ ایکٹ سے
کہیں بدتر ہے پھر اگر پٹھانوں کو اس قانون سے کوئی اختلاف نہیں تو رولٹ بل کی احتجاجی
تحریک میں کیوں شریک ہوتے ہیں علاوہ ازیں دوسرے صوبوں نے پٹھانوں کے ساتھ
کبھی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا پھر پٹھان ان ناشکر گزار لوگوں کے لیے خطرے میں کیوں پڑیں؟
لیکن ان دلیلوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا میں اپنے خیال پر قائم رہا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے
کارکنوں کے ساتھ مجھے گرفتار کر دیا گیا۔ میں کوئی معمولی قیدی تو تھا نہیں بلکہ بڑا خطرناک مجرم
تھا ہتھکڑیاں ڈال کر مجھے جیل میں لے گئے اور جب تک میں جیل میں رہا میرے پاؤں میں
بیڑیاں پڑی رہیں اس زمانہ میں میرا جسم اب سے دوگنا تھا میرا وزن ۲۲۰ پونڈ تھا اس لیے
میرے پاؤں میں کوئی بیڑی ٹھیک نہ آتی تھی یہ مجھے معلوم نہیں کہ میرے لیے کوئی خاص جوڑی
تیار کی گئی یا نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ میرے لیے بیڑیاں تلاش کرنے میں انہیں سخت
پریشانی اٹھانی پڑی اور بالآخر جب انہوں نے ایک جوڑی مجھے پہنائی تو میرے ٹخنے سے
بہت سا خون بہہ نکلا لیکن جیل کے افسروں کو بظاہر اس سے کوئی تردد نہیں ہوا اور وہ کہنے

لگے کہ رفتہ رفتہ تم اس کے عادی ہو جاؤ گے۔ اسی پر انہوں نے بس نہ کی بلکہ مجھ پر ایک سخت الزام لگانے کی ناپاک کوشش کی۔ میرے گاؤں کے ایک پٹھان کو ٹیلی گراف کے تار کاٹنے کے جرم میں سزا ہوئی تھی اس سے دریافت کیا کہ تم عبد الغفار خان کو جانتے ہو اس نے اثبات میں جواب دیا اور کہا انہیں کی تحریک پر میں اس جد و جہد میں شریک ہوا ہوں اس پر اس سے پوچھا گیا کہ کیا انہیں نے تم کو تار کاٹنے کی ترغیب دی تھی لیکن اس نے اس کی سخت تردید کی۔

میرے بڑے بھائی نے انگلستان جا کر لندن کے سینٹ تھامس ہسپتال سے ایم آر ایس کا امتحان پاس کیا اس کے بعد محاذ جنگ پر چلے گئے جنگ کے بعد وہ ابھی فرانس ہی میں تھے کہ یہاں تحریک شروع ہو گئی اس زمانہ میں ان کو ہندوستان کا ایک خط بھی نہیں ملتا تھا انہوں نے واپس آنے کی کوشش بھی کی لیکن چھ مہینے تک انہیں لندن میں انتظار کرنا پڑا سنہ ۱۹۲۰ء میں انہیں واپسی کے احکام ملے گویا جس وقت ان کے والد بھائی اور دوسرے اعزہ جیل میں تھے اس وقت فرانس میں وہ انگریزوں کی ملازمت کر رہے تھے اور جان بوجھ کر انہیں ان واقعات سے تاریکی میں رکھا جا رہا تھا جب وہ وطن واپس آئے تو انہیں بڑی مشکل سے استعفیٰ دینے کی اجازت ملی۔

ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد ڈاکٹر خاں صاحب تو نجی طور پر مطب کرنے لگے اور میری کانگرس اور کانگرس کے مقاصد سے دلچسپی برابر بڑھتی گئی ایک موقع پر مہاتما گاندھی جی سے میں نے کہا تھا کہ مصائب کی درس گاہ میں انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر میں کہیں عیش و آرام کی زندگی میں پڑ گیا ہوتا اور جیل کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملتا تو میری کیا کیفیت ہوتی۔ میری پہلی اور دوسری

اسیری واقعی میرے لیے ایک امتحان تھی بعد کی سزائیں تو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھیں۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ابتدا ہی میں میری اتنی سخت تربیت کی ہے۔

سر عبدالقادر کے متعلق روایت ہے کہ تعلیم چھوڑنے کے بعد کسی اعلیٰ افسر کی سفارش سے آپ ایک دور دراز گاؤں میں ٹیچر مقرر کئے گئے لیکن جب چارج لینے کے لیے بہ ہزار دشواری اس گاؤں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے اس آسامی پر کسی دوسرے شخص کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت آپ نہایت مایوس ہو کر اپنی قسمت کو کوستے ہوئے وہاں سے لوٹ کر گھر آئے ہوں گے۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ شکست ان کے شاندار مستقبل کی پیش خیمہ ہو گی۔

باچا خان بھی ملٹری میں نہ جا سکے، انجینیری کی تعلیم کے لیے انگلستان جانے سے محروم رہے انہیں خود اس وقت اس کا افسوس ہوا یا نہ، اپنے بیگانے انہیں ضرور بدنصیب خیال کرتے ہوں گے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اس نے ان سے ایک ایسا عظیم کام لینا تھا جو فوجی کمیشن اور انجینیری سے کہیں زیادہ اہم، بلند اور ضروری تھا۔

وہ اپنے بھائی کی طرح ڈاکٹر نہ بن سکے لیکن قدرت نے انہیں اپنی قوم کا مسیحا بنا دیا وہ فوجی کمیشن نہ حاصل کر کے بڑے افسر نہ بنے لیکن خدا نے انہیں اپنی قوم کا بے تاج بادشاہ بنا دیا۔

جیسا کہ باچا خان نے خود فرمایا ہے ان کے والد بڑے نیک اور فراخ دل انسان تھے وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینا نہیں جانتے تھے بلکہ ہمیشہ انہیں نہایت فراخدلی سے معاف کر دیتے تھے۔ باچا خان نے بہت سی اچھی باتیں اپنے والد سے ورثے میں پائیں وہ اپنے والد کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

آپ کے والد نہایت سمجھدار انسان تھے وہ بچوں پر جبر کرتے یا ان سے ان کی طبیعت کے خلاف کوئی کام کرانے کے قائل نہیں تھے چنانچہ انہوں نے باچا خان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا اپنی کھیتی باڑی کا انتظام انہیں سونپ دیا اور ان کے حسب منشا شادی کرادی۔

باچا خان نے بعد میں ایک دوسری شادی بھی کی اور دونوں بیویوں سے ان کے ہاں تین لڑکے عبدالولی خان، عبدالغنی خان، عبدالعلی خان اور ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کی شادی یحیٰی جان سابق وزیر تعلیم صوبہ سرحد سے کردی گئی۔

باچا خان اپنی بیوی بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اس کے باوجود ہر وقت وہ ایک گہری سوچ میں مستغرق نظر آتے، بیوی انہیں اس کھوئے انداز پر ٹوکتی، اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ دنیا بھر کی آسائش میسر ہوتے پر بھی اس کا شوہر ہمیشہ فکرمند کیوں رہتا ہے

باچا خان کی پہلی بیوی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہی اور صرف پچیس برس کی عمر میں اپنے شوہر اور بچوں کو داغ مفارقت دے کر جنت کو سدھار گئی۔

باچا خان کی بے چینی بڑھتی گئی یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر انہوں نے اپنے نوعمر بچوں کو اپنی بوڑھی ماں کی نگرانی میں چھوڑتے ہوئے اپنے تفکرات اور غم کو قومی خدمت کی مصروفیت میں ڈبو دیا۔

اب انہیں کوئی غم، کوئی فکر، کوئی تردد نہیں رہا تھا انہوں نے اپنا کام تلاش کرلیا، انہوں نے نئی لگن پالی، اپنی قوم، اپنے عوام، اپنے وطن اور اپنی آزادی کی لازوال لگن ——————

پشتونوں کو متحد، تعلیم یافتہ اور منظم ہونا چاہیے، انہیں مہذب اور آزاد ہونا چاہیے انہیں دوسرے لوگوں کے برابر درجہ ملنا چاہیے، ان کی خانہ جنگی، آپس کی مسلسل دشمنیاں

خود غرضیاں اور جنبہ داریاں دُور ہونی چاہیے۔

یہ سوچتے ہی وہ ایک ایک شخص کے پاس جا کر اس سے تبادلۂ خیالات کرنے لگے، اُن کی توجہ قوم کی عزت، بدحالی اور ان کی تاریک زندگی کی طرف دلانے لگے، انہیں اپنا ہم خیال بنانے لگے، غور و فکر کی دعوت دینے لگے۔ —— آپ ان کے حجروں میں گئے، گھروں میں گئے، کھیتوں میں گئے، —— اور انہیں بتایا کہ تمہاری یہ نکبت، یہ بھوک یہ افلاس خدا کی طرف سے نہیں بلکہ انگریزوں کی دین ہے، جنہوں نے تمہیں غلام بنا رکھا ہے جو تمہارا خون چوس رہے ہیں، جو تمہاری دولت لوٹ رہے ہیں۔ —— لہٰذا اپنی حالت سنوارنا چاہتے ہو تو آؤ ہمارے ساتھ شامل ہو کر پہلے اس غلامی کی زنجیروں کو کاٹو، اس محکومی کے طلسم کو توڑو، اس لعنت کے طوق کو اتارو۔ ——

انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ تم انسان ہو تمہیں اسی طرح جینے کا حق ہے جس طرح دوسرے دولت مند انسانوں کو —— تم محنت کش انسان دھرتی کی جان ہو، معاشرے کی بنیاد ہو، زندگی کی روح ہو، شہروں، دیہاتوں، کھیتوں باغوں، کارخانوں ملوں کی رونق تمہارے دم سے ہے، خان کی خانی، زمیندار کی زمینداری، حاکم کی حاکمیت، نواب کی نوابی تمہاری وجہ سے ہے۔

تمہیں کھیتوں میں سونا اگا کر بھوکا نہیں مرنا چاہیے، تمہیں لوگوں کو کمخواب و زربفت پہنا کر خود ننگا نہیں رہنا چاہیے، تمہارے بچوں کے لئے تعلیم، بیماروں کے لیے طبی امداد اور بیکاروں کے لیے کام کاج کا بندوبست ہونا چاہیے۔

انہوں نے غریب اور بے بس انسانوں سے کہا کہ یوں رونے دھونے اور گھر میں بیٹھ کر محض دعائیں مانگنے سے تقدیریں نہیں بدلا کرتیں۔ اس کے لیے عمل، محنت ،۔

قربانی اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔

انہوں نے بے عمل، بے روح ڈھانچوں سے مخاطب ہو کر انہیں علامہ اقبال کے الفاظ میں سمجھایا کہ ؎

بدریا غلط و با موجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

باچا خان کے والد نے تقریباً پچانوے برس کی عمر میں ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔ اپنے والد مرحوم کے علاوہ باچا خان حاجی صاحب ترنگزئی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تعلیم چھوٹنے کے بعد ۱۹۱۱ء میں ایک کارکن کی حیثیت سے آپ نے سب سے پہلے حاجی صاحب کے ساتھ کام کرنا شروع کیا، اُن کے ساتھ دورے کئے اور ان کا ہاتھ بٹایا۔

حاجی صاحب ترنگزئی مرحوم نے اپنی مسلسل جدوجہد سے صوبے کے مختلف حصوں میں ۲۲ مدرسے قائم کئے اور ہزاروں قبائلی اور غیر قبائلی طالب علموں نے ان سے فائدہ اٹھایا۔ حاجی صاحب ترنگزئی کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے جاری کردہ اکثر مدرسے بند ہو گئے، آپ کے ہزاروں پیرو یہاں موجود تھے لیکن ان میں سے صرف باچا خان ہی ایک ایسا شخص نکلا جو ان کا سچا پیرو ثابت ہوا اور جس نے اپنے آپ میں ان کے نقش قدم پر چلنے کی پوری اہلیت اور صلاحیت پیدا کر کے دکھائی

جدوجہد کا آغاز
تحریک رولٹ بل ۱۹۱۹ء

یوں تو باچا خان نے ۱۹۱۰ء ہی میں اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا لیکن اس وقت وہ ایک رضاکار کی حیثیت سے حاجی صاحب ترنگزئی کے ساتھ شریک ہوئے تھے اور نمایاں طور پر سامنے نہیں آنے پائے تھے۔

حاجی صاحب کے ہجرت کر جانے کے بعد آپ ایک عرصہ تک خاموش رہے۔ آخر پورے غور و خوض کے بعد باچا خان نے اپنے لیے لائحہ عمل مرتب کیا اور اس کی رو سے مجاہد اعظم حاجی صاحب ترنگزئی کے ادھورے تبلیغی، اصلاحی اور تعلیمی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے اور اسے آگے بڑھانے کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔

اب باچا خان ایک رہنما کے طور پر سامنے آئے، ایک باقاعدہ پروگرام لے کر آئے اس لئے درحقیقت اسی زمانہ سے آپ کی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔

اس وقت آپ صرف سوشل کام کرنا چاہتے تھے اور سیاسی میدان میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

یہ ۱۹۱۹ء کا زمانہ تھا پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر رولٹ ایکٹ کے خلاف ہمہ گیر ہنگامے نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ صوبہ سرحد کے طول و عرض میں بھی یہ تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اہل سرحد کے دلوں میں سالہا سال کی دبی ہوئی آزادی کی چنگاری شعلہ سر تیز بن کر بھڑک اٹھی ہر طرف جلسے جلوسوں نے لوگوں کے دلوں میں وہ جوش و خروش پیدا کر دیا جسے دبانا محال ہو گیا۔ انگریزی حکومت نے حالات کو بے قابو ہوتا دیکھ کر ملک میں عام گرفتاریاں شروع کر دیں، ہندوستان کے تمام چوٹی کے لیڈروں کے ساتھ ساتھ سرحدی رہنماؤں کو بھی آہنی دیواروں میں محبوس کر دیا گیا۔

صوبہ سرحد میں یہ سب سے پہلی آزادی کی تحریک تھی۔ ایک دن اچانک صبح صبح پشاور

شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ رولٹ ایکٹ پاس ہوگیا ہے ان دنوں ڈاکٹر سی بی گھوش انجانی کی دوکان (واقعہ گھنٹہ گھر پشاور) سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی چنانچہ اسی جگہ مندرجہ ذیل حضرات جمع ہوئے

قاضی عبدالولی

حکیم عبدالجلیل

حکیم محمد اسلم سنجری

حکیم محمود سنجری

سردار ملاپ سنگھ

عمر بخش

آیا رام

ڈاکٹر گھوش (اور چند دوسرے ہندو نوجوان)

انہوں نے ایک میٹنگ کر کے فیصلہ کیا کہ شہر میں ہڑتال کرائی جائے چنانچہ سب سے پہلے ڈاکٹر گھوش نے اپنی دوکان بند کی اور اس کے بعد آناً فاناً سارے شہر میں ہڑتال ہوگئی صوبہ سرحد میں یہ سب سے پہلی ہڑتال تھی جو سیاسی مقاصد کے پیش نظر کرائی گئی، عبدالعزیز خوش باش نے کالا جھنڈا اٹھایا اور اس کالے بل کے خلاف نعرے لگاتا ہوا جلوس کی صورت میں روانہ ہوا جب ۲/۱ ۲ بجے دن سارے شہر کا چکر کاٹ کر یہ جلوس واپس آرہا تھا تو اس کے ساتھ تیس ہزار انسانوں کا مجمع تھا جو ۔۔ رولٹ بل ہائے ہائے ۔ کے نعرے لگا رہا تھا اس کے بعد ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں حکیم عبدالجلیل اور حکیم محمد اسلم سنجری نے اپنی تقریروں میں رولٹ بل کی تشریح کرتے ہوئے لوگوں

کو خبردار کیا کہ اگر یہ بل ہم پر ٹھونس گیا تو ہم بالکل اپاہج ہو کر رہ جائیں گے اس لیے اسے کسی قیمت پر بھی ہمیں قبول نہیں کرنا چاہیے۔

اب یہ ہنگامہ ہر دوسرے دن برپا ہونے لگا کیونکہ ہندوستان سے بڑی خوفناک خبریں آ رہی تھیں — دہلی، بمبئی، گوجرانوالہ، لاہور، کراچی، کلکتہ اور مدراس میں قومی کارکنوں پر فائرنگ اور انگریزی حکام کے گوناگوں ظلم و ستم کی داستانیں غیور پشتونوں کے بھڑکانے کو کیا کم تھیں۔ کہ اچانک امرتسر سے جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے کی اطلاع نے جلتی پر تیل کا کام کیا (جہاں ایک درندے صفت انگریز فوجی افسر جنرل اڈوائر کے حکم سے مظلوم اور نہتے عوام پر نہایت وحشیانہ فائرنگ کی گئی اور جس میں سینکڑوں مجاہدین وطن کام آئے) اس حادثہ سے سرحدی عوام کے دل غم و غصہ سے بھر گئے اور ہر طرف اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی — بن تیر تھ پشاور کے ایک عظیم الشان اجتماع میں ایک نوجوان پشتون شاعر نے اپنی وہ مشہور نظم پڑھی جس کے ٹیپ کا شعر تھا

ننګیالہ پاسه مقام د ننګ دے

یوروپ د لاسه هندوستان تنګ دے

(اے غیرت مند پشتون اٹھ تیرے لیے غیرت کا مقام ہے، یوروپ کے ہاتھوں ہندوستان تنگ آچکا ہے)

پشاور میں بدستور جلسے اور مظاہرے ہو رہے تھے جن میں ہندو و مسلم متحدہ طور پر حصہ لیتے یہ جلسے مسجد قاسم علی خان، مسجد مہابت خان، مسجد عیدگاہ، بن تیرتھ، نمک منڈی اور چوک یادگار میں منعقد ہوتے جن میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے۔

اسی دوران میں ایک دن پشاور شہر میں پوسٹر لگے ہوئے دیکھے گئے جن پر امیر

امان اللہ خان والئی افغانستان کی مہر لگی تھی اور مضمون یہ تھا کہ وہ عنقریب پشاور پہنچ رہے ہیں (اس پوسٹر کے تیسرے دن سہ افغان جنگ - کا آغاز ہوا)

اس پوسٹر نے انگریز حکام کو بدحواس کر دیا اور دوسرے ہی دن فوج شہر میں داخل ہو گئی بکتریں گھوڑے، رسالے، گورکھا، راجپوت اور بھاری تعداد میں گورا فوج جسے بالاحصار، ریس کورس وغیرہ میں اتارا گیا۔ صبح چھ بجے سے دن کے بارہ بجے تک یہ فوج شہر سے گزرتی رہی بارہ بجے شہر کے دروازے بند کر کے شہریوں کو محصور کر دیا گیا اور ان لیڈروں کے نام ایک پوسٹر کے ذریعے مشتہر کئے گئے جو ابھی گرفتار نہ ہو پائے تھے ساتھ ہی چیف کمشنر سر جارج روس کیپل، ڈپٹی کمشنر کرنل کیمن تھا اور سٹی مجسٹریٹ مسٹر مڈکاف (جو بعد میں ریزیڈنٹ جنرل آل انڈیا اور آل انڈیا ہوم منسٹر بھی رہا) کی طرف سے شہریوں کو ایک نوٹس ملا کہ ان لیڈروں کو اگر حکومت کے حوالے نہ کیا گیا تو شہریوں پر پانی بند کر دیا جائے گا۔ ان لیڈروں کے نام یہ تھے۔

قاضی عبدالولی، حکیم عبدالجلیل، سردار ملاپ سنگھ، شیورام، گیا رام، لالی رام، آغا جی شاہ، محمد عاشق نزوٹ مرچنٹ، حکیم محمد اسلم سنجری، عمر بخش، سید عبداللہ شاہ،

سب سے پہلے افغانستان کے وکیل التجار کو گرفتار اور چند مشہور افغان تاجروں کو زیر حراست کر لیا گیا لیڈروں کی گرفتاری کے لیے پولیس نے شہر کے مختلف حصوں میں سینکڑوں چھاپے مارے۔ اسی موقع پر حکیم محمد اسلم سنجری، حکیم محمود سنجری، قاضی عبدالولی، عمر بخش اور گیا رام وغیرہ فرار ہو کر افغانستان چلے گئے۔ باقی ماندہ کارکنوں اور رہنماؤں کو گرفتار کر کے برما بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد گرفتاریوں کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں اندھا دھند گرفتاریاں عمل

میں آئیں ہزارہ اور اتمان زئی کے سینکڑوں کارکنوں کو "نان پولیٹیکل" قرار دے کر جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ گرفتار شدہ رہنماؤں اور کارکنوں کو مختلف سزائیں دی گئیں جن میں چھ ماہ سے دو سال تک قید اور دو دو درجن بید زنی کی سزائیں بھی شامل تھیں۔

مرزا شاعر، پچلے وال آغا جن شاہ وغیرہ کو غنڈہ قرار دے کر لاہور جیل بھیج دیا گیا جہاں انہیں بید زنی کی شدید سزائیں دی گئیں اس گروپ میں سب سے نو عمر لڑکا عبدالعزیز خوش باش تھا جسے فرانٹیئر کرائمز ریگولیشن کے تحت تین سال سخت کی سزا ہوئی۔

باچا خان سب سے پہلے اسی موقع پر منظر عام پر آئے وہ اب تک اپنے اصلاحی کام میں لگے تھے اور ابھی تک سیاسی خارزار میں قدم نہ رکھنے پائے تھے آپ چاہتے تھے کہ سیاست سے دور رہ کر قوم کی تعلیمی اور معاشرتی حالت سنوارنے اور بہتر بنانے کی کوشش کریں لیکن ملکی حالات نے کچھ ایسا خطرناک موڑ اختیار کیا کہ آپ سے نہ رہا گیا آپ نے اس نازک موقع پر محض تماشائی بننا گوارا نہ کیا اور اللہ کا نام لے کر انقلاب کے اس آتشیں لاوے میں چھلانگ لگا دی۔

شہروں کے ہنگاموں کی خبر رفتہ رفتہ دیہات میں بھی پہنچی۔ وہ ڈھیر گاؤں میں سب سے پہلا دیہاتی اجتماع ہوا اس کے بعد اسی ماہ اپریل کی دس تاریخ کو باچا خان نے اتمان زئی میں جلسہ کیا۔ اس جلسے میں دور دراز مقامات سے لوگ جمع ہوئے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لاکھ کی جمعیت اس جلسے میں موجود تھی

باچا خان کا یہ سب سے پہلا جلسہ اور اتمان زئی کی تاریخ میں بھی یہ اولین سیاسی اجتماع تھا جس میں باچا خان نے اپنی سب سے پہلی تقریر کی۔

آپ نے اپنی اس دھواں دھار تقریر میں رولٹ بل کی شدید مذمت کی اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں انگریزوں کے تشدد اور ظلم وستم کے خلاف پرزور احتجاج کیا۔ آپ نے صوبہ سرحد کے خوانین کی انگریز پرستی، عوام کشی اور ملت فروشی کے خلاف بھی بہت کچھ کہا اور بتایا کہ ہماری غلامی اور بدحالی کے ذمہ دار یہ لوگ ہیں جو محض اپنے مفاد اور تحفظ کے لیے حکومت کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔

آپ کی تقریر سے پشتون عوام بے حد متاثر ہوئے اور ہر طرف آپ کے چرچے ہونے لگے۔ لیکن خوانین آپ کے سخت خلاف ہوگئے۔ آپ کے اپنے گاؤں میں آپ سے کہیں زیادہ بڑے بڑے خان موجود تھے آپ چاہتے تو ان کی تعریف کر کے ان کی ہمدردی اور تعاون حاصل کر سکتے تھے جو آپ کی لیڈرشپ کے لیے مفید بھی تھا لیکن آپ نے مٹھی بھر خوانین کے بجائے اپنے ملک کے ہزاروں لاکھوں غریب عوام کا لیڈر بننا پسند کیا، ان کا اعتماد حاصل کیا اور بڑے لوگوں کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہ کی۔

اس تقریر کے فوراً بعد ہی اتمان زئی میں گرفتاریاں شروع ہوگئیں فوج نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور ڈیڑھ سو کے قریب سرکردہ کارکنوں کو گرفتار کر لیا جن میں آپ کے والد بہرام خان بھی شامل تھے۔

اب پولیس کو آپ کی تلاش تھی لیکن آپ راتوں رات اپنے دو ساتھیوں عباس خان اور احمد میاں کے ساتھ سرحد عبور کر کے مہمندوں کے علاقے میں حاجی صاحب ترنگزئی کے پاس جا پہنچے۔ آپ آزاد قبائل میں رہ کر انگریزوں کے خلاف کام کرنا چاہتے تھے۔

حکومت نے پہلے تو یہ سمجھا کہ آپ اپنے گاؤں میں ہی روپوش ہیں اس لیے وہاں مختلف لوگوں کے گھروں پر چھاپے مارتی اور گاؤں والوں کو تنگ کرتی رہی لیکن جب اُسے

آپ کے غیر علاقہ میں جانے کی تصدیق ہوگئی تو وہ بہت گھبرائی اور آپ کو کسی شخص کے ذریعے جواب بھیجا کہ اگر تم واپس نہ آئے تو تمہارے والد کو پھانسی دے دی جائے گی اور تمام جائداد ضبط کر لی جائے گی ــــــ یہ خبر سن کر آپ بہت پریشان ہوئے اور فوراً یہاں آکر گرفتاری دے دی۔

اس کے چھ ماہ بعد یعنی ۱۹۲۰ء کے اوائل میں انڈیا گورنمنٹ اور حکومت افغانستان کے باقاعدہ معاہدے کے ساتھ ہی ان تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور باچا خان بھی جیل سے باہر آگئے۔

یہ جدوجہد سے بھرپور دور صوبہ سرحد میں سیاست کا اولین دور تھا۔

تحریک ہجرت

۱۹۲۰ء میں باچا خان رہا ہو کر آئے تو سرحد میں ہجرت کی تحریک شروع ہوگئی۔ مولانا عبدالباری نے لکھنؤ سے فتویٰ جاری کیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اس لیے مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت کر کے کسی اسلامی ملک میں چلا جانا چاہیے۔ اس فتوے پر سب سے پہلے پنجاب اور سرحد نے لبیک کہی۔ سرحدی رہنماؤں نے عوام کو ہجرت پر اکسایا اور لوگ اپنا تمام اثاثہ اونے پونے بیچ کر بال بچوں سمیت مہاجروں کے قافلوں میں شامل ہونے لگے علمائے کرام اور رہنمایان عظام نے قرآن اور حدیث کے حوالے دے دے کر لوگوں کو ترک وطن پر آمادہ کیا صوبے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گویا ایک قیامت صغریٰ بپا تھی صدیوں کے آباد گھر اجڑ رہے تھے، مال و متاع کوڑیوں کے مول نیلام ہو رہے تھے جائیدادیں بیچی جا رہی تھیں کھڑی فصلیں جلائی جا رہی تھیں، باپ بیٹوں سے اور بیٹے ماؤں سے جدا ہو رہے تھے جوان بیٹیوں کی شادیوں میں والدین اتنی عجلت برت رہے تھے کہ بغیر جانے

بوڑھے، دیکھے بھالے جو نوجوان سامنے آتا نکاح پڑھوا کر اس کے پلے باندھ دیتے، جو بوڑھے والدین سفر کے قابل نہ تھے وہ اپنے بچوں کو آنسوؤں بھری آنکھوں اور لرزتے ہاتھوں سے رخصت کر رہے تھے ہر طرف عورتوں کی آہ و بکا اور بچوں کی گریہ و زاری سے ایک کہرام مچا تھا، جدھر دیکھو لوگ جانے کی تیاریوں میں منہمک نظر آتے اور ہر طرف سے یہ صدائیں آتیں ؎

برباد ہوں پروا نہیں
ناشاد ہوں پروا نہیں
اے دوستو جو کچھ بھی ہو کابل چلو کابل چلو

سب سے پہلا جتھا مولانا عبدالعزیز امرتسری المعروف عزیز ہندی لے کر یہاں پہنچے جو اُن کے عزیزوں اور دوستوں پر مشتمل تھا اس موقع پر پشاور کے لوگوں نے ایک ہجرت کمیٹی بنائی جس میں حاجی جان محمد، علی گل خان اور باقی تمام مسلم اور غیر مسلم قومی کارکن بھی شامل تھے یہ کمیٹی مہاجرین کی امداد اور ان کے استقبال کے لیے بنائی گئی جس کا دفتر بجوڑی گیٹ کے باہر قائم کیا گیا اس میں بے شمار والنٹیر شامل ہوئے پشاور کے لوگوں نے بے تحاشا قربانی دی اور مالی امداد کی چنانچہ کمیٹی کے دفتر سے پانچ آدمیوں سے لے کر پانچ ہزار آدمیوں تک کے جتھے روانہ کئے گئے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا گیا۔ پشاور سے لے کر افغان سرحد تک خوراک اور پانی کا جگہ جگہ قبائل نے انتظام کیا۔ یوں تو پنجاب اور سندھ سے بھی قافلے آ رہے تھے لیکن اہل سرحد تو گویا سب کے سب گھر بار چھوڑ کر چل پڑے۔ ایک جتھا جان محمد جانی سندھ سے لے کر آیا جس میں ہزاروں آدمی تھے یہ جتھا دو دن پشاور میں قیام کرنے کے بعد افغانستان

روانہ ہو گیا، ادھر پشاور اور صوبہ سرحد کے دوسرے حصوں سے پے در پے قافلوں کا تانتا بندھ گیا۔ مہاجر اتنا کچھ سامان لے کر پاپیادہ اور جانوروں پر افغانستان میں داخل ہوئے کہ افغانستان کی زمین ان پر تنگ ہو گئی والئ افغانستان نے مہاجروں کے اس سیلاب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مہاجرین کا بے پناہ ہجوم ٹڈی دل کی طرح کھیتوں اور میدانوں میں کھلے آسمان کے نیچے پڑے پڑے بھوک اور پیاس سے دم توڑنے لگا، عورتیں بچے اور نوجوان ایک گلاس پانی اور ایک ٹکڑا روٹی کے لیے اپنی عزت ناموس اور عصمت تک بیچنے پر مجبور ہو گئے، اب نہ تو وہ آگے جانے کے قابل تھے نہ پیچھے لوٹنے کی سکت تھی۔

یہ المناک خبریں جب یہاں پہنچیں تو مہاجر کمیٹی کو مجبوراً فیصلہ کرنا پڑا کہ مہاجروں کے مزید قافلے بھیجنے بند کر دیئے جائیں لیکن یہاں ایسا ماحول پیدا ہو چکا تھا کہ لوگ ان کے اس فیصلے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے اور ان پر غدار اور ملت فروش کا الزام لگا کر انہیں بدنام و رسوا کرنے لگے۔

چنانچہ پشاور کی مہاجر کمیٹی نے جب اپنے اس فیصلے کی اطلاع دو رضا کاروں کے ذریعہ درہ خیبر کی مہاجر کمیٹی کو بھیجی تو انہوں نے ان رضا کاروں کو انگریزوں کا مخبر اور ایجنٹ جان کر گرفتار کر لیا اور گولی سے اڑا دینے کا فیصلہ کیا پھر جرگہ بیٹھا اور آخر جب پشاور سے تصدیق کرائی گئی تو ان رضا کاروں کو رہا کیا گیا۔

اس طرح ہجرت کی تحریک کا یہ المیہ ختم ہوا اور لاکھوں بے خانماں انسان اپنے گھروں کو واپس آئے لیکن ایک افسوسناک بات یہ ہوئی کہ واپس آنے کے بعد یہاں بھی انہیں لوگوں نے اچھی نظروں سے نہ دیکھا اور انہیں مدتوں طعنے دیتے رہے کہ جہاد

کے لیے جا کر وہاں سے بھاگ آئے ہو۔

یہ ایک نہایت غلط اور جذباتی سا اقدام تھا جس کی وجہ سے سرحدی عوام کو بے پناہ مالی و جانی نقصان اٹھانا پڑا لطف یہ کہ اس وقت کے تمام بڑے بڑے تجربہ کار جہاندیدہ رہنما بھی اسی جذبات کی رو میں بہہ گئے انہوں نے لوگوں کو اس غلط اقدام سے روکنے کے بجائے اکسایا اور اتنا نہ سوچا کہ آخر اتنی مخلوق افغانستان جیسی مختصر سرزمین میں کیونکر سمائے گی۔

ہجرت کی اس تحریک میں باچا خان نے بھی نہ صرف حصہ لیا بلکہ اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی ایک بھاری جمعیت کے ساتھ وہ شب قدر کے راستے کابل گئے اور پھر واپس آتے ہوئے راستے میں حاجی صاحب ترنگزئی سے بھی ملاقات کی۔

ہجرت کے متعلق باچا خان فرماتے ہیں۔

"میرے ضعیف والد بھی ہجرت کرنے پر سخت مصر تھے حالانکہ ان کی عمر اس وقت نوّے برس کے قریب تھی میں نے انہیں روکا اور التجا کی کہ اپنی ضعیف العمری کا خیال نہ سہی کم از کم اپنی آبائی جائداد ہی کی خاطر اس ارادے کو ملتوی کر دیں ان کے قویٰ ہم دونوں بھائیوں سے زیادہ مضبوط تھے اور اس عمر میں بھی وہ دور دور تک پیدل چل سکتے تھے غرض بڑی مشکل سے انہیں میں اس ارادہ سے باز رکھ سکا"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا جذبہ اس قدر عام اور ہمہ گیر تھا کہ نوجوان تو نوجوان صد سالہ بوڑھے بھی اس تحریک میں حصہ لینے کو سعادت دارین سمجھتے تھے، دوسرا یہ کہ باچا خان کے والد بہرام خان کی ابتدائی زندگی خواہ کیسی ہی کیوں نہ گزری ہو لیکن آخر میں وہ ویسے نہیں رہے تھے ان پر انگریزوں کی خود غرضیوں اور استحصالی

پالیسی کا راز کھل گیا اور وہ نہ صرف اُن سے نفرت کرنے لگے بلکہ اپنی سابقہ انگریز نواز زندگی کی تلافی کرنے کا بھی انہیں شدید احساس تھا۔

تحریک خلافت ۱۹۲۰ء

سنہ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں ہجرت کی تحریک کی خوفناک ناکامی نے عوام کو دل شکستہ کر دیا۔ لٹے پٹے لوگ واپس آئے تو انہیں نئے سرے اپنی زندگی کا آغاز کرنا پڑا۔ گھر بار، کاروبار، شہری زندگی سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا تھا اور اسے دوبارہ بحال کرنا خاصا مشکل کام تھا ہر شخص اپنے غم میں کچھ اس بری طرح گرفتار تھا کہ دوسرے معاملات کی طرف توجہ دینا محال تھا ان حالات میں عوام سے سیاست میں دلچسپی لینے کی توقع ہو ہی نہیں سکتی موجودہ لیڈروں سے لوگ کافی بدظن ہو چکے تھے اس لیے انہیں بھی عوام کے سامنے آنے کی جرات نہ ہوتی تھی ان تمام واقعات نے مل ملا کر ایسی فضا پیدا کر دی کہ ایک عرصہ تک کسی سیاسی تحریک کے پنپنے کے امکانات نظر نہ آتے تھے۔

لیکن یہ سیاسی جمود زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ انہی دنوں ترکی کی خلافت عثمانیہ کی بربادی سے متاثر ہو کر سید الاحرار مولانا محمد علی اور اُن کے بھائی مولانا شوکت علی نے بمبئی میں خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی جو دیکھتے ہی دیکھتے بے حد مقبول ہو گئی اور سارے ملک میں اس کی شاخوں کا جال پھیل گیا۔

آخر یہ تحریک سرحد بھی آن پہنچی، مرکزی خلافت کمیٹی نے پشاور کے کارکنوں کو یہاں پر کمیٹی کی شاخ قائم کرنے کی دعوت دی اور اس سلسلہ کا پہلا جلسہ شاہی باغ میں منعقد کیا گیا جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اس جلسہ میں مولانا عبدالغفور صاحب نے اپنی تقریر میں خلافت کمیٹی کی غرض و غایت اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد سرحد خلافت کمیٹی کا مندرجہ ذیل انتخاب عمل میں لایا گیا۔

آغا سید مقبول شاہ صاحب — صدر

بابو ذکریا خان — نائب صدر

سردار گوربخش سنگھ — جنرل سیکرٹری

چاچا عبدالکریم — جائنٹ سیکرٹری

خلافت کمیٹی نے عمل میں آتے ہی پورے زور و شور سے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں، ہجرت کمیٹی اگرچہ ناکام ہو چکی تھی لیکن پشاور کے مشہور قدیم رہنما حاجی جان محمد مرحوم کی قیادت میں ابھی اس کا وجود باقی تھا خلافت کمیٹی کے وجود میں آنے پر آپس کی افہام تفہیم سے ہجرت کمیٹی نے نئی تنظیم سے تعاون کرنا منظور کر لیا لیکن ان کی جداگانہ حیثیتیں اپنی اپنی جگہ اسی طرح قائم تھیں۔

دفتر الگ الگ تھے، رضا کار جدا جدا تھے ...... چنانچہ زیادہ عرصہ تک ان کا اشتراک قائم نہ رہ سکا اور آخر ایک دوسرے کے خلاف دونوں جماعتیں پوری طرح صف آرا ہو گئیں ان جماعتوں کی آپس کی مخالفت نے نہایت ناخوشگوار صورت اختیار کر لی اور عوام میں ان کا وقار گرنے لگا۔

حاجی جان محمد صاحب جو عوام میں اپنی بے پناہ جانی و مالی قربانیوں کی وجہ سے کافی ہر دلعزیز تھے آئے دن کے ان جماعتی جھگڑوں سے سخت دل برداشتہ ہو گئے دوسرے رہنما بھی اس خلفشار اور انتشار کو بری طرح محسوس کرنے لگے۔

اسی دوران میں راولپنڈی میں ایک مسلم کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں پشاور کے تمام قابل ذکر رہنماؤں نے شرکت کی، وہاں سرحد سے خلافت کمیٹی اور ہجرت کمیٹی کے زعماء کے علاوہ باچا خان بھی موجود تھے اس موقع پر بیرونی رہناؤں کی طرف سے سرحد

کی ان دو جماعتوں میں سمجھوتہ کرانے کی کوششیں ہونے لگیں اور بالآخر دونوں جماعتوں کو توڑ کر جمعیت خلافت کے نام سے ایک نئی جماعت وجود میں لائی گئی جس کی صدارت کے فرائض باچا خان کو سونپ دیئے گئے اور اس طرح پشاور کے کارکنوں کے اختلافات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔

نئی تشکیل نے جماعت میں نئی روح پھونک دی اور تمام کارکن متحد ہو کر پوری قوت سے کام کرنے لگے۔ باچا خان کی صدارت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ جماعت کی سرگرمیاں پشاور شہر کی محدود چار دیواری سے نکل کر سارے صوبے میں پھیل گئیں خصوصاً دیہات میں اس کے خوب چرچے ہونے لگے اور سیاسی کارکنوں کو دیہات میں پہلی دفعہ کام کرنے کا موقع ملا۔

پہلا آزاد قومی مدرسہ سنہ ۱۹۲۱ء

سنہ ۱۹۲۱ء میں باچا خان نے اپنے گاؤں اتمان زئی میں پہلا آزاد قومی مدرسہ قائم کیا اور اسے پوری توجہ اور محنت سے چلانے لگے۔ یہ حاجی صاحب ترنگزئی کے ۱۹۱۱ء میں شروع کئے ہوئے پروگرام کی ایک کڑی تھی۔ آپ نے سارے صوبے میں دورے کر کے اس کی شاخیں قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان سرگرمیوں میں حکومت کے خلاف کوئی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی حکومت کو ان کی یہ مہم پسند نہ آئی چنانچہ چیف کمشنر سر جان میفی نے آپ کے والد بہرام خان کو بلا کر کہا کہ اپنے بیٹے کو یہ مدرسے بند کر دے۔ اس دلچسپ واقعہ کو باچا خان کی زبانی انہی کے الفاظ میں سنئے۔ فرماتے ہیں

"سر جان میفی چیف کمشنر نے میرے والد کو اس امر کی ترغیب دی کہ وہ مجھے سکول بند کر دینے پر آمادہ کریں۔ انہوں نے میرے والد صاحب کو اس طرح سمجھایا کہ یہ مدرسہ انگریزوں کے خلاف ہے۔ جب کوئی اور شخص اس کام میں دلچسپی نہیں لیتا تو آپ کا لڑکا

ہی کیوں اسکول قائم کرتا ہے"۔

والد صاحب نے اگر مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا ...... بابا فرض کیجئے لوگ نماز پڑھنا چھوڑ دیں تو کیا آپ مجھ سے یہ فرمائیں گے کہیں بھی نماز نہ پڑھوں اور اپنے فرض سے پہلو تہی کروں یا آپ یہ ہدایت فرمائیں گے کہ نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو میں اپنا مذہبی فرض ادا کرتا رہوں۔

"ہرگز نہیں" والد صاحب نے جواب دیا "دوسرے چاہے کچھ بھی کریں میں تم سے مذہبی فرائض ترک کرنے کے لیے کبھی نہ کہوں گا ...... بس یہی سمجھ لیجئے میں نے کہا، قومی تعلیم کا کام بھی ایسا ہی ہے اگر نماز قضا کرنا صحیح ہو تو اسکول بند کرنا بھی صحیح ہو سکتا ہے۔

"ہاں اب میں سمجھا۔ والد نے کہا، تم بالکل سچ کہتے ہو جاؤ شوق سے اپنا کام جاری رکھو"

اس طرح حبیب کمشنر صاحب کا یہ وار بھی خالی گیا اس لیے انہوں نے برافروختہ ہو کر محض اس جرم پر کہ وہ اپنے پشتون بھائیوں اور بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیوں کرنا چاہتے ہیں آپ کو دفعہ ۴۰ سرحد کے تحت گرفتار کر لیا اور نیک چلنی کی سنگین ضمانت مانگی۔ آپ نے ضمانت داخل کرنے سے انکار کر دیا اور تین سال کے لیے جیل چلے گئے

کانگرس کمیٹی کی تشکیل
سنہ ۱۹۲۰ء

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے یہاں خلافت کمیٹی کے پہلے جنرل سیکرٹری سردار گوربخش سنگھ مقرر ہوئے تھے اس سے اس دور میں بے نظیر ہندو مسلم اتحاد کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی دوران میں پشاور میں کانگرس کمیٹی کی بنا ڈالی گئی جس کے جنرل سیکرٹری پنڈت امیر چند بمبوال مقرر

ہوئے اس کا دفتر محلہ آغہ شیخ میں قائم کیا گیا۔ کانگریس کی متوازی حکومت کا جج قاضی میر احمد کے والد کو بنایا گیا جو ان کے خانگی جھگڑوں کے فیصلے کرتا تاکہ حکومت کے پاس مقدمہ بازی میں لوگ وقت اور پیسے ضائع نہ کریں بس اس وقت کانگریس کا اتنا ہی کام تھا اور باقی تمام کام خلافت کمیٹی نے سنبھالا ہوا تھا

ان دونوں جماعتوں کی تنظیمیں الگ الگ تھیں لیکن آپس میں مکمل اتحاد اور تعاون تھا اور ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں پایا جاتا تھا۔

انہی دنوں اچانک خلافت کمیٹی نے چکلہ (کسبیوں کا بازار) بند کرانے کی مہم شروع کی اس سلسلہ میں روزانہ جلوس نکلتے جن میں ہندکی اور پشتو نظمیں پڑھی جاتیں.....

ھہ ساڑہ چکلے تا دخدائے دپارہ ددڈمانو نرقہ دے مردار

دیو خلقت اکثر اوکڑہ تباہ حہ جماعت تہ موز کڑہ ادا

تا شہ بہ شی مولا رضا

(خدا کے لیے چکلے زنا، رنڈیوں کا طائفہ مردار ہے۔ انھوں نے اکثر لوگوں کو تباہ کیا ہے، مسجد میں جاکر نماز پڑھو تاکہ خدا تم سے راضی ہو۔

بے نمازی گر مر جاسی اُس دا جنازہ کوئی بھی نہ جاسی

پیا رہسی گت مردار چل میت نماز گزار

اس تحریک کی بنیاد اس لیے ڈالی گئی کہ ان دنوں ہندوستان میں پرنس آف ویلز کی آمد آمد تھی اور اس کے دورے میں پشاور آنے کا پروگرام بھی تھا اس لیے یہاں سے

سیاسی حلقے شہزادے کے استقبال کو ناکام بناتے اور اس کے خلاف مظاہرے کرانے کے لیے عوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور ان میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تحریک کے شروع ہوتے ہی حاجی جان محمد، مرزا سلیم خان حکیم عبدالجلیل ندوی، پنڈت امیر چند بمبوال، ملاپ سنگھ اور دوسرے تمام بڑے بڑے رہنماؤں کو دفعہ ۴۰ سرحدی کے تحت گرفتار کر کے ان سے نیک چلنی کی ضمانت مانگی گئی اور ضمانت دینے سے انکار کرنے پر انہیں تین تین سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

خلافت کمیٹی کا دفتر قصہ خوانی بازار میں تھا۔ دوست محمد خان انسپکٹر کی قیادت میں پولیس نے چھاپہ مار کر کچھ کاغذات اپنے قبضے میں کر لیے اور چند نوجوان کارکنوں عبداللطیف وغیرہ کو گرفتار کر لیا جنہیں بعد میں رہا کر دیا گیا۔ شہر میں جلسہ جلوس ممنوع قرار دے دیئے گئے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ کام جاری رکھنے کی گنجائش نہ رہی۔

اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے خلافت کمیٹی کے کارکنوں کا ایک خفیہ اجلاس محمد عثمان نسواری کے مکان پر منعقد ہوا جس میں نہایت سوچ بچار کے بعد تمام اختیارات اللہ بخش یوسفی صاحب کو دیدیئے گئے۔

یوسفی صاحب نے فیصلہ کیا کہ اچانک مسجد قاسم علی خان (قصہ خوانی پشاور) میں ایک جلسہ کیا جائے چنانچہ دوسرے ہی دن رات کی تاریکی میں جلسہ کیا گیا جس میں عبدالرحمان سوداگر چوب نے نہایت دھواں دھار تقریر کی چونکہ اندھیرے میں پولیس مقرر کی شناخت نہ کر سکی اس لیے اگلے روز اس نے غلط فہمی کی بنا پر حکیم عبدالجلیل ندوی کے چھوٹے بھائی عبدالمجید کو گرفتار کر لیا۔

دوسرے دن شام کو پھر جلسہ ہوا جس میں عبدالحنان نے تقریر کی اور اگلے روز

حکیم جلیل کا دوسرا بھائی عبدالحمید گرفتار کر لیا گیا۔ تیسرے دن پھر جلسے میں تقریر ہوئی اور حکیم جلیل کے چچازاد بھائی پکڑے گئے

چوتھے دن کراس ویٹ ڈپٹی کمشنر نے حکیم عبدالجلیل صاحب کے والد حکیم عبداللہ کو بلا کر کہا کر اپنے بچوں کو سمجھاؤ ورنہ میں انہیں سربازار پٹواؤں گا۔ انہوں نے کہا میرے بچوں نے یہ تقریریں نہیں کیں چنانچہ جب اسے پورا یقین دلایا گیا تو ایک ہفتہ بعد ان لڑکوں کو چھوڑ دیا گیا۔

ان ہنگاموں کے درمیان سیدالاحرار آغا لال بادشاہ بخاری نے ...... پہلی دفعہ ایک رضاکار کے طور پر خلافت کمیٹی کی رکنیت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ یہ ۱۹۲۱ء کے ربیع آخر کا ذکر ہے آغا لعل بادشاہ کے سامنے آنے سے خلافت کمیٹی میں دوبارہ جان پڑ گئی انہوں نے آتے ہی جماعت کی نئی تنظیم کی صدارت کے لیے مفتی شہر مولانا عبدالحکیم پوپلزئی کو منتخب کیا، نائب صدر سیٹھ عمر بخش اور جنرل سیکرٹری اللہ بخش یوسفی مقرر ہوئے آغا لعل بادشاہ صاحب کو جماعت کے سرپرست کا اعزاز ملا۔

خلافت کمیٹی کا دفتر سیٹھ عمر بخش کی جائیداد میں بمقام چوک منڈی بیری پشاور قائم کیا گیا اس کے علاوہ سیٹھ صاحب نے خوب دل کھول کر جماعت کی مالی امداد بھی کی۔ رضاکاروں کی نہایت عمدہ وردیاں بنائی گئیں جو اعلیٰ خاکی زین کے کوٹ پتلون، زرد پیٹی، خاکی کلاہ پگڑی پر مشتمل تھیں

انہی ایام میں برطانیہ کے لیبر ممبر کرنل ودج وڈ مع بیوی کے ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے پشاور وارد ہوئے ان کی آمد پر تمام شہر مرکزی بازار کے پل تک دلہن کی طرح سجایا گیا وہ صبح آٹھ بجے ہشتنگری گیٹ میں داخل ہوئے ہمیوں گھڑ سوار، رضاکار، سائیکل

سوار رضا کار اور دوسرے ہزاروں لوگوں نے ان کا شاہانہ استقبال کیا۔ جلوس جا رہا تھا کہ راستے میں ڈپٹی مجسٹریٹ مسٹر بیچم نے آگے بڑھ کر معزز مہمان کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ دیا جو انہوں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یہ جلوس شہر میں داخل ہوا تو مختلف نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ نعرے یہ تھے۔

گاندھی کی جے

انقلاب زندہ باد

ہوم رُول لے کے رہیں گے

جلوس کابلی دروازہ تک پہنچ کر ختم کر دیا گیا کرنل کو سیٹھ ٹمر بخش کے مکان واقع کریم پورہ میں ٹھہرا دیا گیا۔ وہاں کرنل موصوف نے ڈپٹی میجسٹریٹ کا دیا ہوا لفافہ کھول کر پڑھا معلوم ہوا ڈی سی نے چار بجے مع لیڈی کے اپنے بنگلے پر مدعو کیا تھا۔

جب چار بجے وہ ڈاکٹر ڈی سی کی گھوڑش کی کار میں بیٹھ کر ڈی سی سے ملنے گئے تو ڈرائیور کو خلافت کمیٹی کے سرگرم کارکن عبدالعزیز خوش باش نے پشتو زبان میں کہا کہ پانچ بجے آ کر انہیں یہاں سے لے جانا۔ چنانچہ پانچ بجے ڈرائیور انہیں لینے کے لیے آ گیا کرنل کی بیوی وہیں رہ گئی اور کرنل کو وہاں سے سیدھا جلسہ گاہ میں پہنچا دیا گیا جلسہ شاہی باغ میں تھا جہاں سارا شہر اُمڈ پڑا تھا اس جلسے کی صدارت آغا لعل بادشاہ صاحب نے کی۔ کرنل نے تقریر شروع کی جس کا ساتھ ساتھ اردو میں ترجمہ کیا گیا اس نے پشاور کے لوگوں کی مہمان نوازی کی بہت تعریف کی اور ان کی جدوجہد آزادی کو سراہا۔ دوسرے دن درۂ خیبر دیکھنے کے بعد یہ مہمان واپس چلے گئے۔

۱۹۲۲ء میں خلافت کمیٹی کے فیصلے کے مطابق ....

مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر کچلو اور غازی عبدالرحمان لدھیانوی کو پہلے پہل پشاور بلایا گیا اس موقع پر ملک لال خان مشہور قومی کارکن بھی گوجرانوالہ سے پشاور آئے۔ ان لوگوں کو خلافت کمیٹی کے دفتر میں ٹھہرایا گیا اور نہایت پُراسرار طور پر جلسہ گاہ میں پہنچایا گیا جہاں ایک عظیم الشان جلسے میں انہوں نے نہایت جوشیلی اور باغیانہ تقریریں کیں نتیجہ کے طور پر اسی رات انہیں چیف کمشنر کے حکم سے پولیس کی حراست میں اٹک کے اس پار پہنچا دیا گیا اور سرحد میں اُن کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا

اس وقت خلافت کمیٹی کے تمام بڑے بڑے مشہور سرحدی رہنما آہنی سلاخوں میں بند تھے اور جماعتی نظام کو عام نوجوان کارکن نہایت حُسن خوبی سے چلا رہے تھے۔

پرنس آف ویلز کی آمد سنہ ۱۹۲۲ء

سنہ ۱۹۲۲ء میں پرنس آف ویلز کی آمد آمد نے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں پھر گرما گرمی پیدا کر دی اس وقت تمام قابل ذکر سرحدی رہنما جیلوں میں تھے کچھ دنوں بعد پولیس نے پھر خلافت کمیٹی کے دفتر پر چھاپہ مار کر بہت سے مزید کارکنوں کو بھی گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد بچے کھچے رضاکاروں نے ایک خفیہ اجلاس میں اللہ بخش یوسفی صاحب کو صدر تاج محمد شاہ کو سرمنشی اور محمد عثمان کو کپتان منتخب کیا اور سب نے تحریک خلافت سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔

حکومت نے اپنی متشددانہ کارروائیوں سے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ رضاکاروں کے لیے کام کرنا مشکل ہو گیا لوگ کمیٹی کے دفتر میں آتے ہوئے ڈرتے تھے کہ رضاکار بھی کام کرنے سے گھبراتے کیونکہ ہر ایک جانتا تھا کہ اس جماعت سے تعلق رکھنا قید و بند کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس وقت کمیٹی کے رضاکاروں کی تعداد ۲۵ سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ سب نوجوان سرپھرے، مستعد اور بلند حوصلہ تھے۔

سرکاری حلقوں میں پرنس آف ویلز کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں ادھر خلافت کمیٹی نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا اور قومی کارکن اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے جد و جہد کرنے لگے حکومت سرحد چوٹی کے رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد مطمئن تھی کہ حالات قابو سے باہر نہیں ہوں گے انگریز پرست خوانین نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر حکومت کو یقین دلایا کہ ان کے ہوتے کوئی ناخوشگوار واقعہ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔

دوسری طرف رضا کار اپنی طاقت جمع کر رہے تھے اور پوری سرگرمی سے اپنے کام میں لگے تھے حکومت حالات سے بے خبر نہ تھی ایک بہت بڑے نواب کو دفتر میں بھیجا گیا انہوں نے رضا کاروں کو سمجھایا بجھایا کہ شہزادہ کی آمد پر کسی قسم کا مظاہرہ نہ کریں لیکن انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔

حکومت نے جب کوئی اور چارۂ کار نہ دیکھا تو جمعیت خلافت کے رضا کاروں کی تنظیم ہی کو خلاف قانون قرار دے دیا حکومت کا یہ حکم ماننے سے رضا کاروں نے انکار کر دیا اور اس کی اطلاع ڈپٹی کمشنر کو دے دی اس کے بعد تمام رضا کار اس انتظار میں تھے کہ گھڑی ساعت میں ان کی گرفتاری عمل میں آجائے گی لیکن خلاف توقع حکومت نے اس نازک موقع پر کوئی قدم اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔

جماعت پورے زور شور سے سرگرم عمل تھی لیکن رضا کاروں کی مختصر سی جمعیت کے پیش نظر اپنی کامیابی کا اسے پورا یقین نہیں تھا تاہم حوصلہ مند کارکنوں نے ہمت نہ ہاری۔

اسی دوران میں حکومت نے یہ تجویز بھی سوچی کہ شہزادہ کی پشاور میں آمد سے ایک جگہ شہر میں فوج داخل کر دی جائے اور دوکانداروں کو جبراً دوکانیں کھلی رکھنے پر

مجبور کیا جائے تاکہ ۷ر مارچ ۲۲ء کو شہزادہ کی آمد کے روز شہر میں ہڑتال نہ ہونے پائے جماعت کے اراکین کو حکومت کے ارادوں اور اسکیموں کی پل پل کی خبریں اپنے ہمدرد اہلکاروں کے ذریعہ پہنچ رہی تھیں۔ حکومت کی اس اسکیم سے کارکنوں کو بڑی پریشانی ہوئی کیونکہ اگر اس پر عمل درآمد کیا جاتا تو حکومت کی کامیابی یقینی تھی کارکنوں کا اضطراب بڑھ گیا اور وہ حکومت کے اس سحر کو توڑنے کی تدبیریں سوچنے لگے

کارکنوں کو ایسے مخدوش حالات میں اپنی کامیابی کا بہت کم یقین تھا لیکن اچانک حکومت سے ایک ایسی شدید غلطی ہوئی جس کے باعث قدرت نے ان کی کامیابی کے خودبخود اسباب پیدا کر دیئے۔

۵ر مارچ کی صبح چند رضاکار دفتر سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک انگریز افسر سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی جو چالیس سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ سامنے سے آ رہا تھا۔ یہ انگریز افسر رضاکاروں کو دیکھتے ہی مشتعل ہو گیا اور اس نے تلخ کلامی شروع کر دی۔ رضاکاروں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اس پر اس نے آگ بگولا ہو کر ان تمام رضاکاروں کو گرفتار کر لیا۔ حکومت کا یہ اقدام اس کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوا۔ کارکن تو یہ بات دل سے چاہتے تھے انہیں یقین تھا کہ ان کی کامیابی کی صورت یہی ایک واحد صورت ہے کہ اس موقع پر وہ کسی نہ کسی طرح گرفتار ہو جائیں وہ اس کے لیے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ حکومت کے اس عاقبت نااندیش افسر نے ایک غلط قدم اٹھا کر اپنی ناؤ خود اپنے ہاتھوں ڈبو دی۔

رضاکاروں کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں آناً فاناً پھیل گئی باقی رضاکار جو دفتر میں تھے انہوں نے یہ خبر سنی تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اب انہیں اپنی کامیابی کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے اور ان کے

ان کے مضمحل چہرے اس پر وقت غیبی مدد سے چمکنے لگے۔ وہ فوراً دفتر سے نکلے اور شہر میں گھوم کر ہڑتال کا اعلان کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر میں ایسی مکمل ہڑتال ہوئی جس کی نظیر نہیں ملتی تھی۔

حالات کی اس اچانک کروٹ نے حکومت بوکھلا گئی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور گرفتار شدہ رضاکاروں کو فوراً رہا کر دیا لیکن جو ہونا تھا ہو چکا تھا اور اب یہ تلافی بے سود تھی۔

رضاکاروں کی رہائی سے کارکنوں کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں حکومت اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو جائے اور ہڑتال ٹوٹ نہ جائے اس لیے انہوں نے دفتر کی چھت پر کھڑے ہو کر اعلان کرنا شروع کر دیا کہ آج اور کل شہر میں مکمل ہڑتال رہے گی اور کاروبار بالکل بند رہیں گے اس کا خوشگوار اثر ہوا اور ایک دن کے بجائے پورے دو دن شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔

پرنس آف ویلز ہندوستان میں جہاں جہاں پہنچے وہاں وہاں ہڑتالیں اور شدید مظاہرے ہوئے اب ۱۰ مارچ کو انہوں نے پشاور آنا تھا حکومت اس کے لیے تمام شہر کو سجا رہی تھی، خصوصاً چوک یادگار اور گور گھٹڑی کو خوب سجایا گیا چوک یادگار پر شاہی دربار کے انعقاد کا انتظام کیا گیا اور اسے دلہن کی طرح آراستہ و پیراستہ کیا گیا شہر میں فوج اور پولیس گشت کر رہی تھی حکومت نے دیہات سے نوابوں اور جاگیرداروں کے مزارعین کو منگوا کر جلوس کے راستے میں دونوں طرف کھڑا کر دیا تاکہ احتجاج کی صورت معلوم نہ ہو بلکہ استقبال کی شان ظاہر ہو

۱۰ مارچ کو توپوں کی سلامی کے بعد پرنس آف ویلز نہایت سادہ لباس میں ۱۱ بجے دن چوک یادگار میں پہنچا۔ فوجی بینڈ کے بعد راسئے بہادر مہر چند کھنہ نے ایڈریس پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ اچانک [illegible] نے ہجوم میں کھڑے کھڑے ایک نعرہ خلاف

نعرہ لگایا

مہاتما گاندھی کی جے

بس پھر کیا تھا اس آواز کے ساتھ ہی گویا در و دیوار سے گاندھی کی جے کے نعروں کی صدا آنے لگی اب ہر طرف سے اس زور شور سے نعرے بلند ہوئے کہ زمین و آسمان گونجنے لگے ہجوم نے بے قابو ہو کر توڑ پھوڑ شروع کر دی اور آن کی آن میں تمام آرائش تباہ و برباد کر ڈالی، پرنس آف ویلز کو بمشکل تمام بچا کر وہاں سے گورنمنٹ ہاؤس پہنچایا گیا۔ پولیس نے حالات پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن عوام کے اس بپھرے ہوئے سیلاب کو روکنا اس کے بس میں ممکن نہ تھا

پرنس کے جانے کے بعد ۱۱ مارچ کو تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دے کر حکومت نے عام گرفتاریاں شروع کر دیں تمام رضاکاروں کو چھ چھ مہینے قید کی سزائیں دی گئیں جن میں مصطفیٰ غالب بشیر صدیقی، غلام حسین، غلام محمد، آغا بزرگ شاہ، عبدالعزیز خوش باش، فضل رحیم وغیرہ شامل تھے۔

اللہ بخش یوسفی صدر، آغا لعل بادشاہ سرپرست، سیٹھ عمر بخش اور محمد عثمان سر عسکر کو دو دو سال عبدالکریم کو ڈیڑھ سال اور غلام ربانی سیٹھی اور حاجی کرم الٰہی مرحوم کو ایک ایک سال قید سخت کی سزا کا حکم سنایا گیا

انگریزی تعلیم کی مخالفت
۱۹۲۳ء

یہ ہنگامہ ابھی سرد نہ ہوا تھا کہ ہندوستان سے انگریزی تعلیم کی مخالفت کا طوفان اُمڈ پڑا۔ مسلمانوں میں یہ تحریک بہت پرانی تھی انگریزوں نے اس ملک کا اقتدار سنبھالا تو اپنی زبان کو رواج دینے اور اپنے ڈھب کی تعلیم رائج کرنے کی کوشش شروع کر دی یہ چیز بہت حد تک غلامی کی زنجیروں کو مستحکم بنانے کی غرض سے ہو رہی تھی تاہم مسلمان علماء نے انگریزی تعلیم کی یکسر

مخالفت کر کے قوم کو نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہ پہنچایا ۔ ہمسایہ قوم نتیجے کے طور پر ہم سے تعلیمی میدان میں بہت آگے نکل گئی اور اس کی وجہ سے مسلم قوم کو زندگی کے ہر شعبے میں پسماندگی کا شکار ہونا پڑا ۔

سر سید مرحوم نے سب سے پہلے مسلمانوں کی اس غلطی کو بُری طرح محسوس کیا اور نہ صرف انہیں تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے عمر بھر جدوجہد کی بلکہ ہندوستان میں علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈال کر مسلمان قوم پر احسانِ عظیم کیا ۔ سرحد میں صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم بالکل سر سید مرحوم کے صحیح پیرو تھے انہوں نے ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ کالج پشاور کی داغ بیل رکھ کر صدیوں کی جہالت زدہ اور پسماندہ قوم کو علم و عقل کی روشنی سے آشنا کیا ۔

اپنے اپنے وقتوں میں عاقبت نااندیش لوگوں نے ان حضرات کی شدید مخالفت کی لیکن اپنی تمام انگریز دوستی کے باوجود ان کے دل میں اپنی قوم کا درد موجود تھا اور ان کی پسماندگی کا انہیں شدید احساس تھا اور یہ حقیقت ہے کہ ان حضرات نے جو اپنے اپنے علاقوں میں تعلیمی ادارے قائم کرنے کا عظیم کام انجام دیا ہے کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔

ہجرت کی تحریک کی طرح اب انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تحریک بھی قوم کے نادان دوستوں کی کمزور اور غلط قوتِ فیصلہ کا نتیجہ تھی جس نے قوم کے نوجوانوں کو بے پناہ نقصان پہنچایا ۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان دنوں ملک کے تمام سربرآوردہ لیڈر اور فہمیدہ راہنما جیلوں کی آہنی سلاخوں کے پیچھے زندگی گذار رہے تھے اور باہر کوئی بھی ایسا شخص موجود نہ تھا جو لوگوں کی صحیح راہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو ۔ نتیجہ یہ کہ عوام میں ذہنی انارکی پھیل گئی اور جس کا جی چاہا لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے نت نئے راگ الاپنے لگا ۔

سرحد میں یہ غلغلہ بلند ہوا تو تمام نوجوان درس گاہوں کو چھوڑ کر باہر آ گئے ۔

عبدالقیوم خان بیرسٹر ایٹ لا، محمد خان، ملک امیر عالم اعوان، ڈاکٹر سید عبداللہ، فضل حق شیدا اور دوسرے سینکڑوں جذباتی نوجوان کالجوں اور سکولوں کو خیرباد کہہ کر ملکی سیاست میں حصہ لینے کے لیے میدان میں کود پڑے۔

ان طلبا میں سے ملک امیر عالم اعوان کو گرفتار کر کے حکومت نے تین سال کے لیے جیل بھجوا دیا۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی سرکردہ طلبا کو کڑی سزائیں دی گئیں۔ جو بے شمار طلبا تعلیم چھوڑ چکے تھے یہ طوفان تھمنے کے بعد اُن میں سے بعض نے دوبارہ اپنی تعلیم مکمل کر لی لیکن اکثر ہمیشہ کے لیے محروم رہ گئے۔

انجمن اصلاح الافاغنہ
باچا خان کی رہائی ۱۹۲۴ء

بادشاہ خان پشتون قوم کی اصلاح کا جذبہ لے کر اُٹھے تھے وہ سیاسیات میں آنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے بلکہ اس میدان سے الگ تھلگ رہ کر محض سوشل خدمات کے متمنی تھے حالات نے انہیں سیاست میں الجھا دیا لیکن یہ ایک وقتی اور ہنگامی حادثہ تھا۔ ۱۹۲۴ء میں جیل سے رہائی کے بعد وہ پھر اپنے اصلاحی پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے اگرچہ خلافت کمیٹی سے انکا رابطہ ضرور تھا لیکن انہوں نے سیاسی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لینا چھوڑ دیا اور ۱۹۲۱ء میں اتمان زئی میں جو آزاد مدرسہ قائم کیا تھا اور جس تعلیمی اور اصلاحی مہم کا آغاز کیا تھا اُسے آگے بڑھانے اور پھیلانے کے لیے "انجمن اصلاح الافاغنہ" کی بنیاد رکھی۔ میاں احمد شاہ بیرسٹر اور پشتو کے مشہور آتش نوا شاعر محمد اکبر خان خادم مرحوم آپ کے دست راست تھے جن کی معیت میں آپ نے اس بے جگری سے کام کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ شب و روز کے دوروں، تقریروں اور انتھک محنت سے آپ بہت حد تک پشتون قوم کی مروجہ

قبیح رسوم کو مٹانے، ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے اور ان کے دلوں میں حصول علم کی جوت جگانے میں کامیاب ہو گئے۔ اتمان زئی کے علاوہ بہت سے دوسرے دیہات میں بھی قومی مدرسے قائم کئے گئے جنہیں ہزاروں بچے تعلیم پاکر نکلے اور آگے چل کر قومی کاموں میں انہوں نے نام پیدا کیا چنانچہ باچا خان کا ہونہار لڑکے غنی خان اور مشہور قومی کارکن ماسٹر عبدالکریم نے اسی آزاد قومی مدرسے میں تعلیم پائی۔

ان مدرسوں میں نہایت دور دراز سے بچے تعلیم حاصل کرنے آتے اور کچھ اس انداز سے ان کی تعلیم و تربیت کی جاتی جس سے ان کے دل میں آزادی کی لگن وطن کی محبت اور قومی خدمت کا جذبہ پیدا ہو کتابی علم کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت کا بھی خاص خیال رکھا جاتا اور انہیں عملی زندگی کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ان مدرسوں کا انتظام وانصرام نہایت عمدہ تھا اور یہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ اب تک ہندو مسلم یک جان دو قالب ہو کر ملک کی جنگ آزادی میں حصہ لے رہے تھے انگریز کی حکمت عملی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔ بالکل ناکام نظر آرہی تھی یہاں تک کہ سرحد جیسے خالص مسلم صوبے میں بھی ہندو مسلم اتحاد کی اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ یہاں خلافت کمیٹی کے سب سے پہلے جنرل سکریٹری سردار گوربخش سنگھ تھے یہاں کانگرس کمیٹی کی تشکیل ہو جانے پر بھی گو بظاہر خلافت اور کانگرس دو الگ الگ تنظیمیں تھیں لیکن دونوں جماعتیں یوں مل جل کر کام کر رہی تھیں جیسے وہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہوں دونوں کا مقصد ایک، پروگرام ایک اور لائحہ عمل ایک تھا اور اس لیے دونوں میں بے مثل اشتراک تھا۔

لیکن آخر انگریز اپنی پھوٹ ڈالو۔ کی پالیسی میں کامیاب ہو کر رہا۔ ہندوستان میں

سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک شروع کر دی جو اس دیوار کی پہلی اینٹ تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کھڑی کی گئی اور متحدہ قومیت کا جذبہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا شدھی کی تحریک تعصب کی بنیادوں پر رکھی گئی جس نے دونوں فرقوں کے دل نفرت کے زہر سے بھر دیئے مسلمانوں نے اس کے جواب میں تبلیغ کی تحریک شروع کی نتیجہ کے طور پر جگہ جگہ دونوں فرقوں میں تصادم ہونے لگا اور وہ ایک دوسرے سے دُور ہوتے گئے

ان تحریکوں سے سرحد کے عوام کا متاثر ہونا بھی لازمی تھا اب ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ مسلمان بحیثیت مسلمان اور ہندو بحیثیت ہندو سوچنے پر مجبور ہوا۔ آپس میں کھچاؤ پیدا ہونے لگا ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔

یہ فرقہ وارانہ تعصب کا سیلاب کچھ اس زور سے آیا کہ عوام کے علاوہ بڑے بڑے سُوجھ بُوجھ رکھنے والے سیاسی رہنما بھی اس سے نہ بچ سکے اور اسی رو میں بہنے لگے لیکن اس کے باوجود ابھی اس سیلاب سے سرحد کا خطہ پوری طرح متاثر نہ ہونے پایا تھا خصوصاً سیاسی حلقے تو اس دیوانگی سے ابھی تک محفوظ تھے اور وہ حسب معمول نہ صرف مل جل کر کام کر رہے تھے بلکہ انہوں نے ملکی فضا سے اس زہر کو دُور کرنے اور عوام کے ذہن صاف کرنے کے لیے انتھک کام کیا اور حتی الوسع لوگوں کو اس مسموم رجحان سے بچانے کی کوششیں کرتے رہے

باچا خان کی کانگرس کے کلکتہ اجلاس میں شمولیت
۱۹۲۵-۲۶ء

سنہ ۱۹۲۵ء میں صوبہ سرحد کے تمام سیاسی رہنما اور رضا کار رہا ہو کر جیلوں سے باہر آئے تو سب نے متفقہ طور پر مل کر پراونشل کانگرس کمیٹی کو مضبوط کرنے کی ٹھانی اس کا دفتر قصہ خوانی بازار پشاور میں مسجد قاسم علیخان کے متصل

قائم کیا گیا اور نئی تشکیل میں صدر علی گل خان اور سیکرٹری آغہ سید قاسم شاہ صاحب مقرر ہو گئے۔ اب اس میں بڑی کثرت سے قومی رضاکار شامل ہو گئے انہی دنوں ملک امیر عالم اعوان نے پشاور سے قومی تحریکوں کی خدمت کے لیے "ترجمان سرحد" کا اجرا کرنا چاہا لیکن حکومت نے اجازت نہ دی تو انہوں نے ایک سال بعد ۱۹۲۶ء میں یہی اخبار راولپنڈی سے جاری کیا جو بعد میں پشاور منتقل کر دیا گیا اور آج تک نہایت باقاعدگی سے جاری ہے۔

پراونشل کانگرس کو مضبوط بنانے کے لیے صوبے کے مختلف حصوں میں جلسوں کی مہم شروع کی گئی جس میں آغہ لعل بادشاہ مرحوم اللہ بخش یوسفی پیر اوخان ڈیرہ اسماعیل خان سردار رام سنگھ آنند بنوں ٹیل رام گنگا رام آف ڈیرہ، غلام رسول سواتی آف ہزارہ، ملک امیر عالم خان، حکیم عبدالجلیل، پنڈت امیر چند بمبال، سردار ملاپ سنگھ، سردار گورمکھ سنگھ، اور عبدالکریم ڈاکی نہایت سرگرمی سے حصہ لینے لگے اور انہوں نے اپنے طوفانی دوروں سے صوبے میں نئی زندگی پیدا کر دی۔

رضاکاروں کی تعداد کافی بڑھ گئی اور کانگرس کا دفتر منتقل ہو کر بازار کلاں نزد گھنٹہ گھر پشاور میں آ گیا۔

۱۹۲۶ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے سرحد سے پہلی دفعہ ڈیلی گیٹوں کا ایک وفد روانہ کیا گیا جس میں مولوی محمد اسحاق، علی گل خان سید قاسم خان، عبدالعزیز، خوش باش وغیرہ شامل تھے۔

ان ہی دنوں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا سالانہ اجلاس پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں کلکتہ میں ہونے والا تھا اس کے ساتھ ہی آل انڈیا خلافت کمیٹی کا اجلاس بھی کلکتہ

میں ہونا قرار پایا۔ اس لیے کہ اس وقت کانگرس کمیٹی اور خلافت کمیٹی کا چولی دامن کا ساتھ تھا، چنانچہ سرحد میں دونوں جماعتوں نے ان جلسوں میں شرکت کی تیاریاں پورے زور شور سے شروع کر دیں۔

خلافت کمیٹی کے مندرجہ ذیل نمائندے چنے گئے۔

حاجی عبدالرحیم، چچا عبدالکریم، آغا سید لعل بادشاہ، آغا چمن بادشاہ

ان کے ہمراہ بتیس رضاکاروں کا ایک جیش بھی روانہ ہوا جس کے انچارج حاجی کرم الٰہی مرحوم تھے اس جیش میں پہلوان محمود، پہلوان فقیر محمد، احمد شفیع عرف اچھو، پہلوان پیر بخش اور بہت سے دوسرے رضاکار شامل تھے۔

کانگرس کے منتخب ڈیلی گیٹ مندرجہ ذیل تھے

علی گل خان، سید قاسم جان، خان میر ہلالی، عزیز خوش باش

چنانچہ خلافت اور کانگرس کے وفود جو ستر آدمیوں پر مشتمل تھے ایک ہی ٹرین میں ایک ساتھ کلکتہ روانہ ہوئے اور وہاں اپنے ہم وطن پشاوریوں نے ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔

اس اجلاس میں شمولیت کے لیے دوسرے دن باچا خان بھی جا پہنچے۔ اس وقت تک وہ کانگرس جماعت سے وابستہ نہیں تھے اور نہ ہی وہ اس اجلاس میں مدعو کیے گئے تھے بلکہ محض ایک تماشائی کی حیثیت سے اس اجلاس کی کارروائی دیکھنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ چنانچہ پشاوری مندوبین کے ہمراہ ان جلسوں میں باقاعدہ شریک ہوتے رہے۔

اس موقع پر پنڈت موتی لال نہرو نے بحیثیت صدر کانگرس کے اپنی مشہور رپورٹ "نہرو رپورٹ" کے نام سے پیش کی جس پر ملک میں خاصا ہنگامہ برپا ہوا اور مسلمانوں کا احتجاج

نے اتنا طول کھینچا کہ آخر کانگریس کو مجبور ہو کر اس رپورٹ کو واپس لینا پڑا۔

ڈاکٹر خان صاحب میدان سیاست میں
۱۹۲۷ء

افغانستان کے حالات انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث روز بروز ابتر ہوتے جا رہے تھے وہاں سے بڑی تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں جن سے اہل سرحد میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی اس موقع پر سرحد خلافت کمیٹی نے افغانستان میں ایک طبی وفد ہلال احمر کے نام سے بھیجنے کا فیصلہ کیا اس کے لیے وسیع پیمانے پر چندہ جمع کیا گیا اور ڈاکٹر خان صاحب (جو ان دنوں قصہ خوانی پشاور میں ڈاکٹری کی دوکان کرتے تھے) سے درخواست کی گئی کہ وہ اس وفد کی قیادت قبول کریں جسے ڈاکٹر صاحب نے منظور کر لیا اس طرح ڈاکٹر خان صاحب سب سے پہلی دفعہ عوام کے سامنے آئے۔

اس تحریک میں باچا خان نے بھی شمولیت کی اور دوسرے کارکنوں کے ساتھ مل کر دوڑ دھوپ میں حصہ لیتے رہے حاجی جان محمد مرحوم نے ہلال احمر کو دو لاریاں پیش کیں اور عام لوگوں نے بھی جیب جی کھول کر مالی امداد دی۔ اس وقت لوگوں میں قربانی کا ایسا جذبہ تھا کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ اس کی مثال اس واقعہ سے ملتی ہے کہ اس موقع پر میاں جعفر شاہ اور ان کے بھائی فاروق شاہ میں اس بات پر تنازعہ ہو گیا کہ انہیں سے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ وہ مشن کے ساتھ جائے اور دوسرا بھائی گھر پر رہے۔ چنانچہ جب معاملہ بڑھنے لگا تو کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ میاں جعفر شاہ وفد کے ہمراہ جائیں اور چھوٹا بھائی میاں فاروق شاہ چار ہزار روپے چندہ دیں پشاور کے سینکڑوں نوجوانوں کی درخواستیں آ رہی تھیں خصوصاً طلبا ٹوٹے پڑتے تھے۔ ڈاکٹر خان صاحب کو وفد کے اراکین کے انتخاب کا اختیار حاصل تھا وہ صرف ان لوگوں کا انتخاب کرتے جو

اُن کے لیے مفید ثابت ہو سکیں آخر وفد کی روانگی کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے لیکن روانگی سے چند دن پہلے بدقسمتی سے افغانستان کو ایک نئے انقلاب سے دوچار ہونا پڑا۔ اس انقلاب میں انگریزوں کا ہاتھ تھا امان اللہ خان والیٔ افغانستان کی آزادہ روی اور آزاد خیالی کو وہ اپنے لیے خطرے کی گھنٹی سمجھ رہے تھے اس لیے اُسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے اس کے خلاف کابل میں بغاوت کرا دی۔ یہاں تک کہ اسے بھاگ کر قندھار میں پناہ لینی پڑی۔

ان حالات میں ہلال احمر کے طبی وفد کو حکومت نے پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا اور آخر حکام اس شرط پر رضامند ہوئے کہ اگر امان اللہ خان خود خواہش ظاہر کریں تو مشن کو جانے کی اجازت دے دی جائے گی اس مقصد کے لیے باچا خان اور میاں جعفر شاہ نے اپنی خدمات پیش کیں تاکہ قندھار جا کر امان اللہ خان سے اجازت حاصل کریں اتمانزئی کے لوگوں نے انہیں نہایت شاندار طریقے سے رخصت کیا اللہ بخش یوسفی صاحب سرحد افغانستان تک انہیں الوداع کرنے گئے جب یہ حضرات (بلوچستان) سبی سٹیشن پر پہنچے تو انہیں پولیس نے گاڑی سے اتار کر دوسری گاڑی کے ذریعے (اٹک) جلیب آباد پہنچا دیا۔ انہوں نے دوبارہ بلوچستان میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن پھر واپس کر دیئے گئے اور صاف طور پر بتا دیا گیا کہ اس راستے سے جانے کی اجازت حکومت نہیں دے سکتی۔

انجمن ہلال احمر میں باچا خان نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا انہوں نے دورے کئے تقریریں کیں، چندے جمع کئے اور جب وہ میاں جعفر شاہ کی معیت میں بلوچستان کے راستے امان اللہ خان سے طبی وفد کی اجازت حاصل کرنے کے لیے افغانستان جانے لگے

نے خود اس کے کئی ایڈیشن چھاپ کر مختلف ذرائع سے تقسیم کئے اور مسلمانوں کے ذہن اس قدر مسموم کر دیئے کہ وہ کانگرسی مسلمانوں کو بھی ہندو کہہ کر پکارنے لگے۔

اسوقت لاہور میں راجپال قتل ہو چکا تھا اور ہندوستان میں ہندو مسلم اختلافات کی بنا پڑ چکی تھی لیکن ابھی تک سرحد کا خطہ اس شر سے محفوظ تھا اگرچہ گورنمنٹ کے پیدا کردہ بعض غیر اہم عناصر اختلافات پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور مثبت کام کرنے والوں پر نکتہ چینی کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود اس وقت تک یہاں کی فضا فرقہ وارانہ زہر سے پاک و صاف اور خوشگوار تھی کیونکہ لوگوں میں تعلیم بہت کم تھی اور پشاور اور اس کے مضافات کے لوگ سیاسی شعور سے یکسر عاری تھے اور تمام کہستانی وادیوں کی آبادی دنیا کے ہنگاموں سے بالکل بے خبر تھی۔

انہی دنوں یہاں ایک پشتون رہنما سامنے آیا جو "فخر قوم میاں" کے نام سے مشہور تھا وہ کاکا خیل میاں تھا اور کاکا صاحب کے گاؤں کا رہنے والا ایک ذہین و فطین شخص تھا وہ فرنٹیر ریگولیشن کے تحت کئی دفعہ گرفتار ہوا اور قید و بند کی سختیاں جھیلیں۔
یہی وہ شخص تھا جس نے کانگرس تحریک کو سب سے پہلے سرحدی دیہات میں متعارف کرانے کی کوشش کی۔ میاں صاحب نہایت اولوالعزم اور ایثار پیشہ انسان تھا اور اسے صوبہ سرحد کی سیاسی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی اس کا دوسرا ساتھی تحصیل مردان موضع تورو مایار کا رہنے والا تھا بڑا زمیندار تھا اور باوقار و باوجاہت شخص تھا۔ ضلع مردان کے دیہات میں کانگرس تحریک پھیلانے کا فخر اسے حاصل تھا۔

تیسرا نوجوان صنوبر حسین مہمند آف گگے وسے تھا جس نے دیہاتوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا اور چار سال تک انتھک کام کیا۔

زرو خیز کے لوگ کچھ سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے یہ علاقہ نوباڑگی اور لنڈی خانہ تک پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے ۱۹۲۰ء کی ہجرت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خان آف پرا اور دوسرے بااثر لوگوں اور تیراہ کے افریدیوں کے ساتھ پشاور کے لوگوں کا ساتھ دیا پھر ۱۹۳۰ء میں جلیانوالہ باغ کے حادثے کے بعد پشاور میں جو تحریک شروع ہوئی اس میں ان لوگوں نے کافی دلچسپی لی اور سامنے آکر انگریزوں کا مقابلہ کیا

ہمند قبیلہ میں چونکہ حاجی صاحب ترنگزئی خود موجود تھے لہذا اس علاقے میں کچھ کچھ سیاسی رجحان پایا جاتا تھا کیونکہ حاجی صاحب وقتاً فوقتاً انگریزوں کے خلاف جہاد کرتے رہتے تھے۔ چمرکنڈ میں جو مجاہدین تھے وہ بھی سیاسی تحریکوں سے بہت حد تک باخبر تھے ......

وزیرستان کے لوگوں میں بہت بعد میں اس وقت کسی قدر سیاسی شعور پیدا ہوا جب انگریزوں نے ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور مسلسل بمباری سے ان کے علاقے کو تاخت و تاراج کیا

تعلیم کی کمی کے باوجود پشتون قوم کی ذہنی حس بہت تیز تھی وہ بہت جلد معاملہ کی تہ کو پہنچ جاتے اور اپنے رہنماؤں کے خیالات کو اخذ کر لیتے اور اس پر فوراً عمل کرنا شروع کر دیتے اور معمولی سی اطلاع پر ہڑتال اور جلسے جلوس کے لیے فوراً تیار ہو جاتے۔

مولانا محمد علی کی آمد کی خبر یہاں پہنچی تو ان کے جلوس کے لیے پورے زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ یہ جلوس صوبہ سرحد میں سب سے پہلا بے مثال جلوس سمجھا جاتا ہے جس میں بلامبالغہ لاکھوں انسانوں نے شرکت کی یہاں تاریخی اعتبار سے تین جلوس ایسے خیال کئے جاتے ہیں جن کا جواب نہیں ملتا۔

پہلا ۱۹۲۷ء میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا جلوس

دوسرا ۱۹۳۱ء میں باچا خان کا جلوس

نومبر ۱۹۲۵ء میں قائداعظم محمد علی جناح کا جلسہ "مسلم لیگ کانفرنس" کے موقع پر مولانا محمد علی مرحوم کے استقبال میں ہر مکتۂ نظر کے لوگوں نے نہایت جوش وخروش سے حصہ لیا۔ بے شمار خوبصورت دروازے بنائے گئے اور شہر کو دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا۔ یہ ایک میل لمبا جلوس تھا جس میں گھڑ سوار، اونٹ سوار، سائیکل سوار اور سینکڑوں باوردی رضاکاروں کے علاوہ ہندو، سکھ، مسلمان بچے بوڑھے مرد وزن شریک تھے اور آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بیتاب نظر آتے تھے راستے میں جگہ جگہ شربت کی سبیلیں لگی تھیں اور پھولوں کی بارش ہو رہی تھی جلوس کا ایک سرا کابلی دروازہ اور دوسرا گھنٹہ گھر کے پاس تھا کئی لوگ پاؤں کے نیچے آ کر کچلے گئے۔ غرض پورے چار گھنٹوں میں یہ عظیم الشان جلوس اسلامیہ کلب بیرون کابلی دروازے پہنچ کر ختم ہوا۔

جلوس کے بعد رات کو نمک منڈی پشاور کے چوک میں ایک جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد علی نے تقریر کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ سرحد سے یا قبائلی علاقوں سے غیر مسلموں کا اخراج نہ کیا جائے کیونکہ ہندو ہمارے بھائی ہیں ہماری جنگ انگریز سے ہے جو ایک طاقتور دشمن ہے اور اپنے ملکی بھائیوں سے مل کر ہم نے یہ جنگ لڑنی ہے انہوں نے کہا جو لوگ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ ملک قوم کے دشمن ہیں اور انگریزوں کے ایجنٹ ہیں اور وہ لوگ محض اپنے ذاتی مفاد کے لیے غلامی کی زنجیروں کو مستحکم کر رہے ہیں۔

جلسہ نہایت کامیاب رہا، فرقہ پرست عنصر کو اس وقت تو مخالفت کی جرأت نہ ہوئی لیکن بعد میں انہوں نے مولانا محمد علی کے خلاف ایک طوفان برپا کر دیا ان پر ہندوؤں کا ایجنٹ اور اسلام دشمن کے الزامات لگائے گئے۔ اگلے روز مولانا واپس چلے گئے لیکن جاتے وقت حکومت کے فرقہ وارانہ پروپیگنڈے کی وجہ سے لوگوں نے انہیں اس عقیدت سے رخصت نہ کیا

جس طرح ان کا استقبال کیا تھا۔

اس کے دو ماہ بعد پشاور میں آغا لعل بادشاہ صاحب کی کوششوں سے جمعیت العلماء ہند کا ایک ہنگامہ خیز اجلاس ہوا جس کی صدارت مولانا سید سرور شاہ صاحب نے کی جو اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے یہ جلسہ شاہی مہمان خانہ بیرون بجوڑی گیٹ منعقد ہوا جلسہ تین دن تک ہوتا رہا اس جلسے میں مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علیخاں نے بھی شرکت فرمائی۔

ان دنوں ملک میں سائمن کمیشن کی آمد کا غلغلہ تھا آل انڈیا کانگرس اس کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر چکی تھی حکومت سرحد جمیعت العلماء کی کانفرنس کے حق میں تھی خصوصاً صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم نے چیف کمشنر پشاور کو مشورہ دیا کہ یہ کانفرنس حکومت کے حق میں مفید رہے گی کیونکہ علماء کرام کانگرس سے اختلاف رکھتے ہیں۔

اس جلسہ میں باچا خان نے شرکت نہیں کی البتہ ان کے دو لڑکوں عبدالولی خان اور عبدالغنی خان نے جلسہ میں اپنی پشتو نظمیں پڑھیں جلسے کی آخری رات مولانا محمد علی مرحوم کی آخری تقریر ابھی جاری تھی کہ انہوں نے تقریر کے دوران میں سائمن کمیشن کے واقعات کو دہرا کر لوگوں پہ بڑا اثر ڈالا اور حکومت کے تمام منصوبوں پہ پانی پھیر دیا۔ انہوں نے آل انڈیا کانگرس کے بائیکاٹ کے ریزولیوشن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس رسوائے عالم کمیشن کے خلاف سرحد کے لوگوں کو بے پناہ مظاہرے کر کے دنیا پر ثابت کر دینا چاہیے کہ وہ انگریز سامراج کو پسند نہیں کرتے اور ان کی چالاکیوں اور دھوکے بازیوں سے بخوبی واقف ہیں اور ملک کی آزادی کے لیے وہ تمام ہندوستان کے ساتھ ہیں۔

ان تمام علماء کرام کو سرحد کے مشہور مقامات کی سیر کرائی گئی خصوصاً مولانا ظفر علی خان کو خیبر کی سیر کرائی گئی خیبر سے واپسی پر علی مسجد کے قریب موٹر پنکچر ہو گئی اتنی دیر میں مولانا

نے ایک نظم کہی جس کا ایک شعر تھا

پاس خیبر بھی ہے اور اس میں علی مسجد بھی
دور کیوں جاتے ہو مرحب سے یہیں بات کرو

درۂ خیبر والوں کو جب مولانا کی آمد کا پتہ چلا تو لوگ جمع ہونے لگے کہ زمیندار آگیا ہے کیونکہ زمیندار ان دنوں بہت مقبول تھا اور اس اعتبار سے وہ مولانا کو بھی زمیندار کہنے لگے۔

اس وقت "رنگیلا رسول" کا پروپیگنڈا حکومت نے پوری قوت سے سرحد میں شروع کر دیا تھا کیونکہ یہاں کانگرس کو عروج حاصل تھا اور حکومت فرقہ وارانہ پروپیگنڈے کے ذریعے کانگرس کا زور توڑنا چاہتی تھی۔

اسی موقع پر سرحد میں پہلی دفعہ جمعیت العلماء ہند کی شاخ قائم کی گئی جس نے ملکی سیاسیات میں قابل قدر پارٹ ادا کیا اور قومی جماعتوں سے ہمیشہ آزادی وطن کی تحریکوں میں پورے تعاون کا ثبوت دیا۔

اس وقت پشاور میں مولانا عبدالقیوم پوپلزئی اور مولانا امام شاہ جمعیت العلماء کے سرگرم کارکن ہیں جو بارہا قید و بند کے مراحل سے بھی گزر چکے ہیں۔

انقلاب افغانستان

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں تحریک آزادی شروع ہوئی اور سیاسی جدوجہد نے زور پکڑا تو افغانستان کے عوام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لوگوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف انتہائی نفرت پیدا ہو چکی تھی امیر حبیب اللہ کی انگریز دوستی افغانستان کے باشندوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی چنانچہ اس کے خلاف ملک میں جا بجا سازشیں ہونے لگیں اور آخر امیر حبیب اللہ خان والئے افغانستان کو جلال آباد میں قتل کر دیا گیا۔

امیر حبیب اللہ کے قتل کے ساتھ ہی افغانستان میں انقلاب آ گیا اس وقت نادر خان جلال آباد میں نائب سالار تھا انہیں گرفتار کر کے کابل بھیج دیا گیا کیونکہ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ حبیب اللہ خان کا قتل نادر خان کے ایماء سے عمل میں آیا ہے ادھر افغانستان کے تخت کے دو دعویدار تھے ایک نصر اللہ خان جو امیر حبیب اللہ خان کا حقیقی بھائی تھا اور دوسرا حبیب اللہ خان کا بیٹا امان اللہ خان ۔

نصر اللہ خان نے جلال آباد اور امان اللہ خان نے کابل میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، ملک کا نوجوان طبقہ امان اللہ خان کے ساتھ تھا کیونکہ وہ ایک روشن دماغ، وطن پرست اور انگریز دشمن نوجوان تھا - امان اللہ خان کو اپنے معلم خاص اور مشہور سپہ سالار محمود طرزی کی حمایت بھی حاصل تھی اس لیئے وہ کامیاب ہو گیا اور نصر اللہ خان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا ۔

امان اللہ خان نے تخت پر بیٹھتے ہی نادر خان کو اس شرط پر رہا کر دیا گیا کہ وہ حکومت کا فرمانبردار رہے گا - نادر خان کو اپنے عہدے پر بحال کر دیا گیا اور اسکے بھائی ہاشم خان کو حاکم اعلیٰ بنا دیا گیا ۔

چونکہ امان اللہ خان ایک روشن خیال حکمران تھا اس لیئے وہ قبائل کو منظم کرنے، انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے نجات پانے اور ملک میں جمہوری حکومت قائم کرنے کے حق میں تھا اس لیئے اس نے تخت و تاج سنبھالتے ہی انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور اس طرح ملک میں خوب ہر دلعزیزی حاصل کر لی، نادر خان کی کمانڈ میں تل پر حملہ کر دیا گیا، مطالبہ یہ تھا کہ افغانستان کو سیاسی آزادی دی جائے حملہ کے بعد تل پر نادر خان نے قبضہ کر لیا یہ قبضہ تین دن رہا انگریز گھبرا گئے اور امان اللہ خان کی تمام شرائط منظور کر لیں

جب امان اللہ خان کے خلاف اسے تخت سے ہٹانے کے لیے انگریزوں نے ایک عجیب پر اسرار سازش کی تو اس وقت امان اللہ خان کا حامی سمت مشرقی میں میر زمان خان تھا جو کنٹر صافیوں کا سب سے بڑا خان تھا وہ شاہی امداد کے لیے جلال آباد پہنچا، ادھر مہمند قبیلہ کے تمام امان اللہ خان کے حامی بھی جلال آباد پہنچ گئے میر زمان خان کے پاس بہت بڑا لشکر تھا لیکن بعض اسباب کی بنا پر وہ جلال آباد پر قابض نہ ہو سکا۔

افغانستان کی بغاوت، بچہ سقو کے نام سے شروع ہوئی اور سارے افغانستان میں پھیل گئی حتیٰ کہ فوج بھی باغی ہوگئی کیونکہ انگریزوں نے نہایت ہوشیاری سے بعض زر خرید علماء کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور امان اللہ خان اور ملکہ ثریا کی آزادی خیال اور بے راہ روی کے ثبوت میں ان کی فرضی برہنہ تصویریں بھاری تعداد میں تمام قبائلی علاقے میں تقسیم کرائی گئیں اور رسوائے عالم انگریز مخبر کرنل لارنس نے عالم دین کا روپ دھار کر امان اللہ خان کے خلاف کفر کے فتوے حاصل کئے اور انہیں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چھپوا کر قبائلی علاقوں میں تقسیم کیا اور تمام افغانوں کو اس کے خلاف متحد کر دیا۔

جب مرکز کمزور نظر آیا اور اپنے آس پاس بغاوت کے شعلے منڈلاتے دکھائی دیئے تو امان اللہ خان بھاگ کر قندھار چلا گیا ادھر جلال آباد میں میر زمان خان حملہ کرتے ہوئے مارا گیا اور وہاں شنواریوں کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ امان اللہ خان نے علی احمد جان کو جلال آباد میں سمت مشرقی پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا لیکن اس نے وہاں جاتے ہی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور تتر بتر فوج اور عوامی لشکر کو جمع کر کے کابل پر حملہ کرنا چاہا لیکن مخالف فریق نے اسے راستے ہی میں شکست فاش دی لشکر منتشر ہوگیا اور وہ گرفتار ہو کر بچہ سقو کے ہاتھوں توپ سے اڑا دیا گیا۔

اب امان اللہ خان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنی جان بچا کر لے جائے چنانچہ وہ مجبور ہو کر قندھار سے بمبئی پہنچ گیا اور وہاں سے روم جا کر دم لیا۔

اسی اثنا میں نادر خان فرانس سے پشاور پہنچ گیا اس نے قبائل میں جا کر لشکر جمع کیا اور کابل پر حملہ کر کے بچہ سقہ کو شکست فاش دے کر اُسے پھانسی پر لٹکا دیا اور تخت و تاج پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

یہ کابل کی بغاوت کے مختصر واقعات ہیں جن کا اظہار اسلیے ضروری تھا کہ اس پس منظر کو سمجھے بغیر سیاسی تحریکوں کی بہت سی باتوں کو پوری طرح ذہن نشین نہیں کر سکتے کیونکہ قریبی ہمسائیگی کی وجہ سے افغانستان کے لوگ ہم سے اور ہم اُن سے کافی متاثر ہوتے رہے ہیں پھر انگریز حکمران کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ہندوستان کیطرح افغانستان بھی شکار ہوتا رہا ہے کیونکہ اس کی آزادی و خود مختاری انہیں کسی طرح گوارا نہ تھی اور وہ اُسکے سر صورتمیں اپنا خانہ زاد بنا کر رکھنا چاہتے تھے

سائمن کمیشن کی آمد

۱۹۲۸ء میں برطانوی پارلیمینٹ نے ہندوستان میں سائمن کمیشن بھیجا جو یہاں کے حالات کا جائزہ لے اور عوام کے مطالبات معلوم کر کے حکومت کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اس کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور اس کے خلاف وسیع طور پر مظاہروں کی تیاریاں ہونے لگیں

صوبہ سرحد میں اس وقت کانگرس کو عروج حاصل تھا اور خلافت کمیٹی کے زعماء بھی ہر قومی تحریک میں کانگرس کے ہمنوا تھے چنانچہ سرحد کانگرس کمیٹی اور خلافت کمیٹی دونوں سائمن کمیشن کے خلاف مظاہروں کے لیے نہایت سرگرمی سے تیاریاں کرنے لگیں

حکومت سرحد ان سرگرمیوں سے لاعلم نہ تھی اس نے کانگرس کو شکست دینے کے لئے کبھی کانگرس اور خلافت میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو کبھی خود کانگرس میں ہندو مسلم سوال پیدا کر کے انتشار پیدا کرنا چاہا۔

کچھ عرصہ پہلے "رنگیلا رسول" کتاب کی اشاعت سے پنجاب میں فرقہ وارانہ ہوا چل پڑی تھی اور مختلف مقامات پر ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے تھے اب اسی حربے کو سرحد میں استعمال کرنے کے لیے حکومت نے پشتو انگریزی اور اردو زبانوں میں اس رسوائے عالم کتاب کی کئی ہزار جلدیں خود چھپوا کر صوبہ سرحد کے طول و عرض اور قبائلی علاقے میں تقسیم کرائیں اور مسلمان علماء کو ہندوؤں کے خلاف ابھار کر مسلم عوام کو کانگرس سے الگ کرانے پر ابھارا اور اپنے زر خرید ایجنٹوں اور اخباروں کے ذریعے بے پناہ پروپیگنڈا کیا اور ہندوؤں میں دہشت پھیلائی کہ پٹھان انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے اس لیے وہ یہاں سے نکل جائیں اور مسلمانوں کو شہ دی کہ جس قوم کے فرد نے ہمارے رسولؐ کی توہین کی ہے اس کے افراد کو ہم اپنے مسلم اکثریت کے صوبے میں ہرگز نہیں رہنے دیں گے۔

کلکتہ میں کانگرس کا سالانہ اجلاس ختم ہوا اور سرحدی رہنما واپس آئے تو مہاتما گاندھی اور مہادیو ڈیسائی بھی ان کے ہمراہ اسی ٹرین سے لوٹ رہے تھے انہوں نے آخنہ لعل بادشاہ، امین گل خان اور چچا عبدالکریم سے ملکی سیاست پر کھل کر باتیں کیں، گاندھی جی نے دوران گفتگو میں بتایا کہ افغانستان میں عنقریب بغاوت کرا دی جائے گی اور امان اللہ خان کو تخت سے ہٹا کر انگریز اپنے ڈھب کے کسی آدمی کو وہاں حکمران بنائیں گے انہوں نے کہا کابل کی آزادی سے ہندوستان متاثر ہو رہا ہے اس لیے ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ امان اللہ خان شکست نہ کھائے کیونکہ یہ چیز ہمارے حق میں بہت بری ہوگی یہ پیشین گوئی گاندھی جی نے افغانستان کے انقلاب سے چھ مہینے قبل کی تھی جو ان کی فراست اور سیاسی شعور کی دلیل تھی اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی رہنما افغانستان میں انگریزوں کی سازش سے بے خبر نہ تھے۔

جب امان اللہ خان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا تو علمائے دین کی جماعت معہ چند سیاسی کارکنوں کے آزاد قبائل میں جانے کے لیے تیار کی گئی تاکہ لوگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کیا جائے اور امان اللہ خان کے خلاف شورش فرو کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس جماعت کی قیادت آغا سید لعل بادشاہ کے سپرد تھی یہ پارٹی ضلع پشاور کے چند سربرآوردہ علماء کو ساتھ لے کر گندھاو روانہ ہو گئی ان کے ساتھ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، رحیم بخش غزنوی، حاجی اکرم خان آف دیہہ بہادر اور بعض دوسرے نوجوان شامل تھے انہوں نے قبائلی علاقہ میں جا کر حتی الوسع امان اللہ خان کے حق میں فضا ہموار کرنے کی کوشش کی ...... امان اللہ خان کے جلاوطن ہونے کے بعد سقاوی حکومت قائم ہوئی تو اس کا ایجنٹ ہام دین چارہ کاری پشاور میں مقرر کیا گیا اس کے آتے ہی یہاں سقہ شاہی کے خلاف اس قدر جلسے جلوس اور مظاہرے ہوئے کہ امان گورنمنٹ کے ٹریڈ ایجنٹ سردار عبدالحکیم خان نے رشہ پا کر اسے چارج دینے سے انکار کر دیا اور اسے مناجی پسند نہ کیا جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ سقہ گورنمنٹ کا ٹریڈ ایجنٹ بریگیڈیر جان محمد کے گھر پر مقیم ہے تو ایک بہت بڑے ہجوم نے ان کے مکان پر جا کر مظاہرہ کیا یہاں تک کہ جاب کے احتجاج پر بریگیڈیر نے اسے اپنے مکان سے نکال کر خان بہادر کرم الٰہی کے مکان پر پہنچا دیا چنانچہ ایک دن نیا ٹریڈ ایجنٹ خان بہادر کے پاس ان کے مکان پر بیٹھا تھا کہ لوگوں نے دھاوا بول دیا اور اسے ہلاک کرنا چاہا لیکن فوراً پولیس افواج اور اسسٹنٹ کمشنر موقع پر پہنچ گئے اور اسے کہیں مکانوں سے گزار کر نکالا گئے ہجوم نے بالاخانہ کے شیشے اور دروازے توڑ دیئے اس شورش کے سلسلہ میں دوسرے روز عبداللہ ... ر خوشحال باش اور محمد شفیع المیو گرفتار کر لیے گئے لیکن عدالت نے عدم ثبوت کی بنا پر رہا کر دیا

گاندھی جی کا کہا سچ نکلا اس انقلاب سے متحدہ ہندوستان کی تحریک آزادی بہت

حد تک متاثر ہوئی خصوصاً سرحد پر تو اس کا شدید اثر پڑا۔ انگریز سامراج اس طرف سے پورا اطمینان حاصل کر کے سرحد کی تحریک آزادی کو کچلنے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ۱۹۳۰ء میں قصہ خوانی میں انگریزوں کو نہتے عوام کے خون سے ہولی کھیلنے کی جرأت اس لیے ہوئی کہ ہمسایہ ملک انقلاب کی وجہ سے کمزور ہو چکا تھا

اس زہریلے پروپیگنڈے کے باوجود حکومت کے منصوبے پورے نہ ہو سکے اور جب سائمن کمیشن نے سرحد کی سرزمین پر قدم رکھا تو حکومت کی تمام پیش بندیاں دھری کی دھری رہ گئیں اور سرحد کا کونہ کونہ "سائمن گو بیک" کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا اور قدم قدم پر ہزاروں لاکھوں انسانوں نے سیاہ جھنڈیوں "انقلاب زندہ باد اور ہندوستان آزاد" کے نعروں سے وہ بے مثال مظاہرہ کیا کہ حکومت سخت پریشان ہوگئی اور دوسرے ہی روز کمیشن کو اپنا باقی پروگرام منسوخ کر کے واپس جانا پڑا۔

نوجوان بھارت سبھا کا قیام ۱۹۲۹ء

اب کانگرس میں ایک اور انقلاب آیا۔ ہندوستان اور پنجاب میں انتہا پسند نوجوان عنصر نے "نوجوان بھارت سبھا" کی بنیاد ڈالی۔ یہ خبر سرحد پہنچی تو یہاں بھی بعض نوجوان جن میں عبدالرحمان ریا، عبدالعزیز خوش باش، حاجی عبداللہ نکھی گر، فضل الٰہی اور صنوبر حسین شامل تھے اس جماعت کے قیام کے متعلق سوچنے لگے، آخر انہوں نے مصلحتاً بھارت کا لفظ حذف کر کے اس جماعت کا نام "نوجوانان سرحد" تجویز کیا اور آل انڈیا نوجوان بھارت سبھا سے اس کا الحاق کرنے کا فیصلہ کیا۔

رات کی تاریکی میں ایک خفیہ میٹنگ عبدالعزیز خوش باش کے گھر میں طلب کی گئی بارہ بجے شب میٹنگ کی کاروائی شروع ہوئی سید میر بادشاہ آف موسیٰ زئی کو اس نئی انقلابی جماعت

کا آرگنائزر مقرر کیا گیا صدر صنوبر حسین اُف گگ ولہ نائب صدر ماسٹر شیر علی سیکرٹری عبدالرحمان ریا نائب سیکرٹری چونی لال خزانچی عبدالعزیز خوش باش اور مجلس عاملہ کے اراکین محمود، حاجی عبداللہ اور فضل الہی منتخب کیے گئے۔ جماعت کا پرچم سُرخ تھا اور اس پر درانتی ہتھوڑے کے نشان تھے اس کا دفتر گھنٹہ گھر (پشاور) کے سامنے ایک بالاخانہ پر قائم کیا گیا اس کا پروپیگنڈا اتنا وسیع طور پر کیا گیا کہ مختصر عرصہ میں سینکڑوں نوجوان ممبر بن گئے کانگرس سے اس کا تصادم نہ تھا اس لیے کہ دونوں کے مقاصد ایک تھے بلکہ اکثر اراکین تو کانگرس کے بھی ممبر تھے

اس جماعت کو اتنا فروغ ہوا کہ آل انڈیا بھارت سبھا نے اس کا الحاق کر کے پشاور میں اس کی صوبائی تنظیم بھی کر دی گئی جس کے جنرل سیکرٹری روشن لال مقرر ہوئے عبدالرحمان ریا کو ڈسٹرکٹ کا صدر بنا دیا گیا نائب صدر قطب الدین اور سیکرٹری بہاری لال چُنے گئے مجلس عاملہ کے اراکین میں رام سرن نگینہ، عبدالغفور آتش بخشی خیر چند اور اللہ بخش برقی شامل تھے۔ جلد ہی اس کی شاخیں ہزارہ اور بنوں میں بھی قائم ہو گئیں

باچا خان کی کانگرس کے لاہور اجلاس میں شمولیت ۱۹۲۹ء

۱۹۲۹ء کے آخر میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہونا قرار پایا جس میں شمولیت کی تیاریاں ہونے لگیں اس موقع پہ نوجوان بھارت سبھا سرحد کے تمام اراکین کانگرس کے والنٹیروں میں شامل ہو کر لاہور پہنچے۔ کانگرس کا اصلی تھے دار محمد عثمان تھا لیکن لاہور جانے کے لیے عارضی طور پر حاجی کرم الہی کو کمانڈر مقرر کیا گیا اور غلام ربانی سیٹھی جنرل آفیسر کمانڈر آف آل انڈیا والنٹیر کور نیشنل کانگرس کمیٹی کے باڈی گارڈ مقرر ہوئے۔

تمام رضا کار دو دن پہلے لاہور پہنچ گئے ان دنوں سرحد کانگرس کمیٹی کے کرتا دھرتا

آغہ سید لال بادشاہ مرحوم تھے جنہیں تمام اراکین اور رضا کاروں کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا وہ جو بھی کہتے سب فوراً سر تسلیم خم کر دیتے جب چاہتے ہڑتال کرا دیتے، جلسے جلوس غرض تمام انتظامات اور تمام کام ان کے مشورے اور حکم سے ہو رہا تھا۔ وہ عوام میں بھی بیحد ہر دلعزیز تھے لوگ ان کی پرستش کرتے اور ان کی آواز سارے صوبے کی آواز سمجھی جاتی

کانگرس کے رضا کار جو لاہور بھیجے گئے ایک سو سے زیادہ تھے اور تمام اراکین ملا کر تین سو کے لگ بھگ بنتے تھے ان دنوں لاہور میں خلافت کمیٹی کا اجلاس بھی ہو رہا تھا لیکن اہل سرحد نے بعض اختلافات کی بنا پر اس میں شرکت نہ کی بلکہ جو چند ایک سرحدی ڈیلی گیٹ خلافت کمیٹی کے اجلاس میں شمولیت کے لیے گئے تھے وہ بھی مولانا شوکت علی کے رویّہ سے ناراض ہو کر چلے آئے اور کانگرس کے اجلاس میں شریک ہو گئے۔

سرحدی والنٹیروں کے جیش کے ساتھ چار کپتان تھے جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ مفتی بشیر احمد ٹریفک انچارج ۲۔ سردار کاہن سنگھ ڈرل انچارج

۳۔ وزیر محمد راشن انچارج ۴۔ حافظ فضل محمود نظم و نسق کا انچارج

والنٹیر کور میں چند ایک غیر مسلم نوجوان بھی تھے ......

بخشی فقیر چند، چونی لال، جوالا داس، حکیم چند، ہرنام سنگھ، گوربچن سنگھ، موتی لال

سرحدی رضا کاروں کو مین گیٹ کا چارج دے دیا گیا۔ اس وقت لاہور میں نیلی پوشوں کا بڑا زور تھا اور کانگرس کے لیے جلوس نکالنا مشکل تھا بلکہ انہیں اپنے جلسہ میں بھی مخالفوں کی طرف سے گڑبڑ کا خطرہ تھا۔ سرحدی رضا کاروں نے بعض حضرات کی مخالفت کے باوجود جرأت سے کام لے کر پنڈت جواہر لال نہرو کی آمد سے دو روز پہلے ایک جلوس نکالا جو تمام شہر میں سارا دن گھومتا رہا لیکن کسی کو مزاحمت کرنے کا حوصلہ

نہ ہوا۔ اس جرأت مندانہ اقدام سے سرحدی رضاکاروں کی خوب تعریفیں ہونے لگیں

اس اجلاس میں لارڈ ارون پر بم پھینکنے کے خلاف گاندھی جی نے رزولیوشن پیش کیا جو بنگالیوں کی مخالفت کے باوجود پاس ہوگیا۔

باچا خان نے مع اپنے رفقا کے اس اجلاس میں بھی انفرادی طور پر شرکت کی کیونکہ اس وقت تک وہ کانگرس میں شامل نہیں ہوئے تھے۔

یہ اجلاس بڑا ہنگامہ خیز تھا اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔

باچا خان نے مع اپنے رفقا کے اس اجلاس میں بھی انفرادی طور پر شرکت کی کیونکہ اس وقت تک وہ کانگرس میں شامل نہیں ہوئے تھے۔

اس اجلاس میں کانگرس نے پہلے پہل مکمل آزادی کا رزولیوشن پاس کیا جس نے انگریز حکمرانوں کے گھر میں صفِ ماتم بچھادی۔

اس موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو نے افغانی صافہ سر پہ رکھ کر رضاکاروں کے ساتھ رقص کیا اور پشاور کے کانگرسی رہنماؤں نے پہلی دفعہ باچا خان کو آل انڈیا کانگرس کے رہنماؤں سے متعارف کرایا۔

لاہور کے اس ہنگامہ خیز اجلاس میں بنگال اور پنجاب کے انتہا پسندوں سے سرحد کے نوجوان مل کر بے حد متاثر ہوئے اجلاس کے اختتام پر چند حضرات وہاں ٹھہر گئے اور بھگت سنگھ اور دت کا مشہور مقدمہ سنتے رہے۔

جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں کانگرس اور بھارت سبھا کے سرحدی رہنما اور رضاکار واپس پشاور پہنچے۔ اس وقت سرحد کانگرس کمیٹی اور نوجوان بھارت سبھا اپنے شباب پر تھیں انہوں

نے بڑے بڑے ہنگامہ خیز جلسے کئے۔ نوجوان بھارت سبھا نے فروری ۱۹۳۰ء میں اپنے ایک عظیم الشان جلسے کا صدر باچا خان کو بنایا اس جلسے میں عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شریک ہوئے اور انہوں نے ولولہ انگیز تقریر کی۔

افغان یوتھ لیگ ۱۹۲۹ء

باچا خان ۱۹۲۴ء میں جیل سے رہا ہو کر اپنے اصلاحی کاموں میں لگ گئے "انجمن اصلاح الافاغنہ" کی بنیاد ڈالی گئی اور سیاست سے الگ تھلگ رہ کر آزاد قومی مدرسوں کے قیام اور غیر شرعی اور غیر اسلامی رسومات کی روک تھام کے لیے انہوں نے انتھک جد و جہد شروع کر دی۔ سیاسی دنیا میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک اتنے ہنگامے گذرے لیکن انہوں نے کسی میں بھی حصہ نہ لیا نہ ہی انہوں نے اب تک کانگرس کمیٹی سے اپنا تعلق قائم کیا اور نہ ہی کسی اور سیاسی جماعت سے منسلک ہوئے۔ آل انڈیا کانگرس کے سالانہ جلسوں میں وہ شریک ہوتے رہے لیکن ممبر یا ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف تماشائی کی حیثیت سے ....

حقیقت تو یہ ہے کہ باچا خان اس وقت تک کانگرس کے پوری طرح حامی نہیں تھے وہ پشتون قوم کے شدید مذہبی رجحان کے پیش نظر ایک خالص اسلامی تحریک چلانا چاہتے تھے اور اس میں بھی وہ صرف اپنی پشتون قوم کی ترقی اور سربلندی کے لیے کام کرنا چاہتے تھے اس لیے کہ انہیں اس قوم کی پس ماندگی اور جہالت کا شدید احساس تھا وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے لوگ پشتونوں سے زندگی کے ہر شعبے میں بہت آگے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ جب تک ان کی قوم دوسری قوموں کے برابر نہ ہو جائے تعلیم یافتہ، مہذب اور باشعور نہ ہو جائے اس وقت تک وہ اپنی تحریک کو صرف اسی خطے تک محدود رکھیں اور پشتونوں کی تنظیم کو ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بالکل جدا رکھ کر اپنی تمام کوشش

اس مشن کو پورا کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ وہ یہی جذبہ ہے کہ میدان عمل میں آئے تھے اور اس پر ثابت قدم بھی رہے لیکن جہاں کہیں ملک و قوم پر کوئی سخت وقت آیا تو قربانی دینے میں وہ کسی سے پیچھے بھی نہیں رہے بلکہ ہر نازک موقع پر دو قدم آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پیش کیا۔

وہ پیر روخان خوشحال خان خٹک اور حاجی صاحب ترنگ زئی کے پیرو تھے اور انہی کے نقش قدم پر چلنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ ان کی تحریک اسی روشن تحریک کی آواز بازگشت بھی جس کا آغاز سولہویں صدی کے وسط میں مجاہد اعظم پیر روخان نے کیا اور جس کی باگ ڈور سترہویں صدی عیسوی میں خوشحال خٹک اور ۱۹۱۲ء میں حاجی صاحب ترنگ زئی نے سنبھالی۔

اسی لیے اپنی تحریک کے آغاز میں انہوں نے مسلمان سے خریدو کا نعرہ بھی لگایا' غیر اسلامی رسوم ترک کرنے کا سلوگن بھی دیا اور ہندوؤں کے بائیکاٹ کا پرچار بھی کیا۔ لیکن جس وقت متحدہ طور پر مل کر کام کرنے کا موقع آیا تو انہوں نے مل کر کام بھی کیا لیکن اپنی جداگانہ حیثیت کو وہ کبھی ختم کرنے پر تیار نہیں ہوئے کانگرس سے یک تالب ہو کر کام کرتے رہے جب بھی اپنی تنظیم کا نام جدا ہی رہا۔ اس کے علاوہ جہاں تک کانگرس کے پروگرام کا تعلق ہے جہاں اس سے انہیں اتفاق ہوا وہاں تک چلے اور جہاں اتفاق نہ رہا الگ ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں جب کانگرس نے جنگ عظیم میں انگریزوں کی حمایت کرنا چاہی تو انہوں نے کانگرس سے استعفیٰ دے دیا اور اپنی جماعت کے ساتھ الگ ہو کر کھڑے ہو گئے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کانگرس کی کورانہ تقلید نہیں کرتے رہے۔

یہی وجہ تھی کہ قیام پاکستان کے بعد کانگرس کمیٹی سے انہوں نے اپنا تعلق توڑ دیا اور اپنی

نئی مملکت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنے لگے اور اپنی ابتدائی تنظیم "خدائی خدمتگار" کو پھر زندہ کرکے اس مہم کے لیے اپنی سرگرمیاں وقف کردیں جو پشتون قوم کی اصلاح کے لیے انہوں نے ابتدا میں شروع کی تھی لیکن حکومت پاکستان نے بعض غلط فہمیوں کی بنا پر اس تنظیم کو خلاف قانون قرار دے دیا اور آپ کو ایک طویل عرصہ تک جیل کی چار دیواری میں محبوس رہنا پڑا۔

آل انڈیا کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور سے واپسی پر باچا خان نے نہایت شدت سے پشتون قوم کی تنظیمی ضرورت کو محسوس کیا۔ کانگرس کے اجلاس میں آپ نے نوجوان ہندو لڑکیوں کو رضاکاروں کے لباس میں پریڈ کرتا ہوا دیکھا تو آپ بے حد متاثر ہوئے چنانچہ واپسی پر آپ نے اپنی ایک تقریر میں یہ قصہ بیان کیا اور لوگوں سے کہا کہ ہمارے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہاں تو عورتیں میدان عمل میں نکل آئی ہیں اور منظم طور پر کام کر رہی ہیں اور ادھر ہم ابھی تک خواب غفلت میں پڑے ہیں۔

چنانچہ آپ نے یکم ستمبر ۱۹۲۹ء کو اتمان زئی میں ایک عظیم الشان جلسہ بلایا جس کی صدارت خوشحال خان باریکاب نے کی میاں احمد شاہ نے جلسے کا مقصد بیان کیا اور اسی جلسہ میں "افغان یوتھ لیگ" کی تشکیل عمل میں لائی گئی جس کے زیر اہتمام پوری سرگرمی سے دیہات میں تنظیم کا کام شروع کر دیا گیا اس جماعت کے صدر عبدالاکبر خان اور سیکرٹری میاں احمد شاہ مقرر ہوئے۔

خدائی خدمتگار تحریک

کا

پہلا دور

خدائی خدمت گار تحریک کا پہلا دور
۱۹۳۰ء

صوبہ سرحد کی سیاسی تاریخ میں ۱۹۳۰ء کا سال کئی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔

۱۔ یہ سال سرحد میں کانگریس کے عروج کا سال تھا

۲۔ اس سال یہاں باچا خان نے اپنی مشہور جماعت خدائی خدمت گار کی بنا ڈالی

۳۔ اس سال ماہ اپریل میں یہاں قصہ خوانی فائرنگ کا رسوائے عالم حادثہ پیش آیا

۴۔ اس سال تمام ملک کی تحریک آزادی سمٹ کر صوبہ سرحد میں آگئی اور یہاں اندھا دھند گرفتاریاں کی گئیں۔

باچا خان ستمبر ۱۹۲۹ء میں "افغان یوتھ لیگ" کی بنیاد ڈال چکے تھے اس کے لیے آپ نے جنوری ۱۹۳۰ء میں باقاعدہ طور پر رضاکاروں کی بھرتی شروع کر دی لیکن ان رضاکاروں کی تنظیم کا کوئی علیحدہ نام بھی ہونا چاہیے تھا چنانچہ نہایت سوچ بچار کے بعد قاضی عطاء اللہ مرحوم کی تجویز پر اس تنظیم کا نام "خدائی خدمت گار" رکھا گیا۔

باچا خان نے ۱۶، ۱۷ اپریل ۱۹۳۰ء کو کسان کانفرنس کے نام سے انجمن اصلاح الافاغنہ

کی سالانہ تقریب پر اتمان زئی میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا اس اجلاس میں بلا تفریق صوبہ سرحد کی تمام سیاسی جماعتوں کو دعوت دی گئی اور نہایت وسیع انتظامات کئے گئے اس کے صدر خوشحال خان آف ضلع مردان تھے یہ ایک یادگار تاریخی اجلاس تھا جس میں صوبہ سرحد کے طول و عرض سے لاکھوں انسانوں نے شرکت کی کانگرس کمیٹی، نوجوان بھارت سبھا اور خلافت کمیٹی کے رضاکاروں اور رہنماؤں کے علاوہ ہزاروں عوام بھی اس جلسے میں شریک ہوئے

اس کے منتظم باچا خان، محمد اکبر خان خادم، میاں احمد شاہ بیرسٹر، میاں عبداللہ اور میاں جعفر شاہ تھے۔ سب سے پہلے اعلان کیا گیا کہ اس تحریک کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں

اس اجلاس میں باچا خان نے اپنی اصلاحی تحریک انجمن اصلاح الافاغنہ یا افغان جرگہ کو چلانے کے لیے رضاکار بھرتی کرنے کی مہم شروع کی اور ان رضاکاروں کا نام "خدائی خدمتگار" تجویز کیا ان کی وردی نسواری رنگ کی تجویز ہوئی جس سے دھوکا کھا کر بعد میں حکومت نے انہیں سرخ پوش کہنا شروع کیا اور بالشویک تحریک سے اس کا رشتہ جا ملایا حالانکہ وقتاً فوقتاً تحریک کے رہنما حکومت کی اس غلط فہمی کی نہایت واضح الفاظ میں تردید بھی کرتے رہے۔

یہ جماعت بعد میں کانگرس میں مدغم کر دی گئی۔ ان خدائی خدمت گاروں کا حلف نامہ جو پشتو میں شائع ہوا یہ تھا جو ۱۹۳۲ء میں مرتب کیا گیا۔

میں خدا کو حاضر ناظر اور شاہد گردانتا ہوا اور اس کی ذات پاک پر یقین کرتے ہوئے حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ ذیل اصولوں پر کاربند رہوں گا۔

۱۔ میں اپنا نام خدائی خدمت گاری کے لیے صداقت اور ایمان داری سے پیش کرتا ہوں

۲۔ میں اپنی جان مال اور آرام ایمان داری کے ساتھ اپنی قوم کی خدمت اور وطن کی آزادی کے لیے قربان کروں گا۔

۳۔ میں خدائی خدمت گاروں میں ایسے پیسے بھیجنے جو تحریک کے لیے نقصان یا کمزوری کا باعث ہوں نہیں بناؤں گا

۴۔ میں کسی دوسری جماعت کا ممبر نہیں بنوں گا اور جنگ آزادی میں معافی نہیں مانگوں گا نہ ہی ضمانت دوں گا۔

۵۔ میں اپنے افسر کا ہر جائز حکم ہر وقت ماننے کو تیار رہوں گا۔

۶۔ میں عدم تشدد کے اصول پر ہمیشہ کاربند رہوں گا۔

۷۔ میں تمام مخلوق خدا کی ایک ہی طرح خدمت کروں گا میرا نصب العین وطن کو آزاد کرانا ہوگا۔

۸۔ میں ہمیشہ نیک اور اچھے عمل پر کاربند رہوں گا۔

۹۔ میں اپنی خدمت کے بدلے کسی چیز کی طمع یا لالچ نہیں کروں گا

۱۰۔ میری تمام کوششیں خدا کی رضا کے لیے ہوں گی نمائش کے لیے نہیں ہوں گی

اس سے پہلے باچاخان کے ذہن میں عدم تشدد کا تصور نہیں تھا یہ چیز انھوں نے گاندھی جی سے حاصل کی اور سب سے پہلے اس فلسفے سے وہ اس وقت روشناس ہوئے جب ۱۹۳۰ء میں انہیں گرفتار کر کے گجرات جیل بھیج دیا گیا جہاں انہیں بڑے بڑے کانگرسی لیڈروں کے ساتھ رہنے اور ان کے خیالات کو سمجھنے کا موقع ملا اس کے بعد ہی انھوں نے اپنی جماعت کو کانگرس میں مدغم کرنے کا اعلان کیا اور اس کے بعد ہی وہ عدم تشدد پر سختی سے کاربند ہوئے۔ چنانچہ مندرجہ بالا حلف نامہ خدائی خدمت گاروں کے لیے ۲۷ اگست ۱۹۳۰ء میں مرتب کیا گیا۔ ابتدا میں اس قسم کا کوئی حلف نامہ نہیں تھا۔

"خدائی خدمت گار" دراصل افغان جرگہ کے رضا کاروں کی تنظیم کا نام تھا لیکن یہ

نام اتنا مقبول ہوا کہ یہ جماعت ہی خدائی خدمت گار کہلانے لگی۔

اتمان زئی کے اس عظیم الشان جلسے میں بادشاہ خان نے نہایت موثر تقریر کی اور پشتون قوم کی تنظیم کے لیے لائحہ عمل مرتب کرتے ہوئے "خدائی خدمتگار" کے نام سے رضا کاروں کی بھرتی کا اعلان کیا۔ سینکڑوں لوگوں نے اس وقت رضا کاروں میں اپنے نام لکھوائے۔

چونکہ بادشاہ خان خدائی فرمانبرداری کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں اسی لیے انہوں نے رضاکاروں کی تنظیم کے لیے خدائی خدمت گار کا نام تجویز کیا لیکن حکومت نے اس جماعت کو کچلنے کے لیے بہانہ بنا کر ان کی سرخ وردی کے باعث انہیں "سرخ پوش" کا نام دے بالشویکوں سے ان کا رشتہ ملایا اور اس طرح ان پر بے پناہ تشدد کرنے کے لیے "وجہ جواز" ڈھونڈ نکالی باچا خان کہتے ہیں "پہلے ان رضا کاروں کا سفید کھدر کا لباس تھا لیکن وہ جلدی میلا ہو جاتا تھا اس لیے تجویز ہوا کہ قمیضوں کو گیرو رنگ دیا جائے اس رنگ کو سرخ کہنا بالکل غلط ہے اور نہ اسے سویٹ روس کے سرخ رنگ سے کوئی مناسبت ہو سکتی ہے۔"

ایک اور موقع پر باچا خان نے ایک دوست کے خط کا جواب دیتے ہوئے خدائی خدمت گار تحریک کی تشریح یوں کی

"آپ نے مجھ سے خدائی خدمت گار تحریک کے متعلق دریافت کیا ہے یہ بات بہت زیادہ تشریح طلب ہے لیکن چند لفظوں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سچا خدائی خدمت گار وہ ہے جو بغیر کسی لالچ کے بنی نوع انسان کی ترقی کے لیے خدمت کرے لیکن مجھے افسوس ہے کہ اس پاک تحریک کی حقیقت سے عام ہندوستانی اور خاص طور پر مسلمانانِ ہند نا واقف ہیں۔"

شروع میں یہ تحریک جو کچھ بھی تھی لیکن آخر میں خدائی خدمت گار تحریک کسی ایک فرقے

تک محدود نہیں رہی بلکہ اس میں تمام سرحدی باشندے شامل تھے اس میں سکھ ہندو خدائی خدمتگار کے کیمپوں میں شامل ہوتے رہے ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں -

شو بھارام کی مروت، اکنور بھان کلاچی، ہنبل داس، گنیش داس بہادر پور، بھگوان داس مکی مروت، نانک چند کوہاٹ، کالو رام بنوں، گھربی چند پشاور، اور ہر دیال کوہاٹ، رام سنگھ پشاور، گوربچن سنگھ پشاور، لالہ کشن چند پشاور ان غیر مسلم خدائی خدمتگاروں کے ساتھ باچا خان کی کئی تصویریں موجود ہیں -

اس وقت پشاور شہر میں کانگرس کی بنیاد پڑ چکی تھی لیکن اس کی سرگرمیاں شہری حدود تک محدود تھیں -

شروع میں خدائی خدمت گاروں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی لیکن اپریل ۱۹۳۰ء میں باچا خان کی گرفتاری کے بعد ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی بس مدت میں یہ تحریک اتنی وسعت اختیار کر گئی کہ حکومت بوکھلا گئی مردوں کے علاوہ عورتیں بچے بوڑھے نہایت ذوق شوق سے اس تحریک میں شامل ہوتے سرخ کپڑے پہنتے اور حکومت کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے لیے پروانہ وار اپنی جان نثار کرتے -

خدائی خدمت گاروں کی تنظیم نہایت اعلیٰ پیمانے پر کی گئی اور اگر بہت جلد وہ حکومت کے تشدد کا شکار نہ ہوتے اور انہیں تربیت کا موقع ملتا تو یہ تنظیم نہایت کارآمد ثابت ہوتی انہیں باقاعدہ قواعد سکھائی جاتی فوجی تربیت دی جاتی اور میلوں پیدل چلنے اور دوڑنے کی مشق کرائی جاتی -

۱ - ان کے ہفتہ وار اور ماہانہ کیمپ قائم کئے جاتے جہاں وہ ستو اور پانی پر کئی کئی دن گزارتے -

۳ - انہیں بے مزد خدمت خلق کا درس دیا جاتا -

۴ - ملک وطن کی راہ میں جاں نثاری کی تعلیم دی جاتی -

۵ - انہیں ہر قسم کی سختی اٹھانے کے لیے تیار کیا جاتا -

کانگرس کی عدم تعاون کی تحریک میں خدائی خدمت گاروں نے سرحد میں قربانی کے وہ نمونے پیش کئے جن کی مثال متحدہ ہندوستان میں نہیں ملتی - انگریزوں نے ان کی بڑھتی ہوئی تعداد اور مضبوط تنظیم سے گھبرا کر انہیں کچلنے کا تہیہ کر لیا اور ان پر ایسے ایسے انسانیت سوز مظالم کئے جن کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں -

گھروں کی تلاشیاں لی جاتیں،

عورتوں کی بے عزتی کی جاتی

کھڑی فصلیں جلا دی جاتیں

مار مار کر ان کے حلیئے بگاڑ دیئے جاتے

گالیاں دی جاتیں

ننگا کر کے ان کے جلوس نکالے جاتے

ان پر دانہ پانی بند کر دیا جاتا -

ان کے منہ پر تھوکا جاتا

ان کے منہ کالے کر کے شہروں اور گاؤں میں پھرایا جاتا

ان کی بیٹیوں بہنوں اور بیویوں سے ان کی آنکھوں کے سامنے ناروا سلوک کیا جاتا

ان کے معصوم بچوں کو اذیتیں دی جاتیں

ان پر گندگی پھینکی جاتی

یہ اور اس قسم کی اور کتنی ہی ایسی شرمناک حرکتیں کی جاتیں جو تہذیب و تمدن کے دعویدار انگریز حکمرانوں کے لیے ہمیشہ کلنک کا ٹیکہ بنی رہیں گی۔

لیکن خدائی خدمت گاروں کے آہنی عزائم میں کوئی فرق نہ آتا وہ ہزاروں کی تعداد میں پروانہ وار شمع آزادی پر اپنی جان چھڑکتے، صفیں کی صفیں چھلنی ہوتی اور ان کی جگہ دوسری صفیں تن جاتیں ایک چراغ بجھتا اور ہزار دیئے روشن ہو جاتے

جب ظلم و ستم کی انتہا ہو گئی اور یہ تحریک ختم ہونے کے بجائے اور زور شور سے ابھرنے لگی، جب رضاکاروں پر جیلوں کی وسعتیں تنگ ہو گئیں تو حکومت نے عاجز آکر گرفتاریاں بند کر دیں۔ پولیس کو آرڈر ملا کہ ان کی سرخ وردیاں چھین کر انہیں برہنہ حالت میں چھوڑ دو۔ خدائی خدمت گاروں نے یہ صورت حال دیکھی تو سرخ رنگ سے اپنے جسموں کو رنگنا شروع کر دیا۔ پولیس سرخ وردی اتارتی تو نیچے سے سرخ کھال نکل آتی اور رضاکار قہقہے لگاتے ہوئے کہتے یہ تو لو اگر اس کھال کو بھی کھینچ لو تو جسم کے اندر ہمارے دل کو بھی سرخ پاؤ گے

اس تحریک کو کچلنا کوئی آسان کام نہ تھا انگریز سامراج نے اپنے تمام آزمودہ حربے استعمال کر ڈالے اور آخر نہایت اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا اذیت ناک جسمانی سزاؤں کے علاوہ رضاکاروں کی عزت و ناموس پر دن دہاڑے حملے کئے گئے لیکن جب کسی طرح بھی رضاکاروں کے حریت پرستانہ جذبے میں کوئی فرق نہ آیا تو حکومت نے تنگ آکر سرخ رنگ پہ کنٹرول کر دیا اور دیاتیں پہ سرخ رنگ بیچنا جرم قرار دے دیا اس واقعہ کو پشتو کے ایک ٹپے میں نہایت خوبی سے سمویا گیا ہے۔ ایک رضاکار محبوب مجبوراً سفید کپڑے پہنے ہوئے ہے اس کے چہرے پر اداسی جھلکتی ہے محبوبہ یہ صورت حال برداشت نہیں کر سکتی اور کپڑے رنگنے کے لیے محبوب کو اپنے خون کی پیشکش کرتی ہے۔

دَ جا هو رنگ دَ سپين نيده شي
خُماد دیو غوشه ورکه دچه رنگ شينه

(تیرا لباس سفید ہے، میرے خون میں اسے ڈبودے کہ سرخ ہوجائے)

پھر خبروں پر ایسا بلیک آوٹ کیا گیا کہ یہاں عوام پر قیامتیں گزر گئیں اور بیرونی دنیا کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی اور جب ایک عرصہ کے بعد یہ خبریں باہر پہنچیں تو حکومت کے ان وحشیانہ مظالم کے خلاف ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اخبارات چیخ اٹھے اور خود انگریزوں کی پارلیمنٹ میں حکومت کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی گئی۔

جب حکومت کو ہر طرف سے ندامت اٹھانا پڑی تو اس نے اپنے اس بہیمانہ تشدد کو جائز قرار دینے کے لیے سرکاری طور پر رضاکاروں پر من گھڑت اور بے بنیاد الزامات عائد کئے اور صوبہ سرحد کے چیف کمشنر نے مئی ۱۹۳۰ء میں یہ اعلان شائع کیا۔

"اپنے گاؤں میں کانگرس کے ان رضاکاروں کو مت آنے دو جو سرخ قمیض پہنے ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو خدائی خدمت گار کہتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ گاندھی کے چیلے ہیں وہ بالشویکوں کا سا لباس پہنتے ہیں اور یہاں بھی وہ طوائف الملوکی پیدا کرنا چاہتے ہیں جو بالشویکوں نے روس میں کی ہے"

۱۹۳۲ء میں مادر ایلون اپنے مختصر قیام کے دوران میں ان واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں یہاں کے بعض حکام سے ملے جنہوں نے خدائی خدمتگاروں پر جو الزامات لگائے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ بعض پولیس افسروں کی توہین کی گئی اور ان سے بد کلامی کی گئی

۲۔ ان کی موٹروں پر پتھراؤ کیا گیا اور گوبر پھینکا گیا۔

۲۔ کوہاٹ میں پتھر اور اینٹیں پھینکی گئیں جس سے مشتعل ہو کر حکام نے گولی چلائی ممکن ہے ان میں ایک آدھ الزام درست بھی ہو لیکن اس وقت چونکہ تحریک کے تمام ذمہ دار رہنما گرفتار ہو چکے تھے اس لیے اس قسم کے امکانات پیدا کرنیکی ذمہ داری دراصل حکومت پر عاید ہوتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض سرخ پوشوں نے معافی مانگ کر رہائی حاصل کی۔ اتنی بڑی تحریک میں اگر چند ایک رضاکاروں نے ایسا کیا بھی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حالانکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ جیلوں میں رضاکاروں سے نہایت انسانیت سوز سلوک کیا گیا انہیں بید زنی کی شدید سزائیں دی گئیں اور ہر طرح معافی مانگنے کے لیے پورا دباؤ ڈال کر اور نہایت عجیب و غریب چالیں چل کر انہیں مجبور کیا گیا لیکن اس کے باوجود کوئی رضاکار بھی اس کے لیے تیار نہ ہوا۔

خدائی خدمت گاروں کے بے مثل استقلال کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ حاجی شاہ نواز خان نے جو بابا جان کے عم زاد بھائی تھے، ضمانت داخل کر کے رہائی حاصل کی لیکن ان کے عزیز اور عام پشتون انہیں نفرت اور حقارت سے دیکھنے لگے اور انہیں دوبارہ جیل جانے کے لیے مجبور کیا لیکن اس غیور انسان نے جیل جانے کی بجائے اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کرلی اور اس مضمون کا خط اس کی جیب سے ملا

"میری بدنامی اور ذلت کا داغ دوبارہ جیل جانے سے نہیں بلکہ موت ہی سے دور ہو سکتا ہے"

اس طرح سید داؤد شاہ جو ممتاز خدائی خدمت گار تھے ۱۹۳۱ء میں وہ جیل میں تھے کہ ان کے بوڑھے والد نے ان کی ضمانت داخل کر کے انہیں رہا کرا دیا۔ مگر مرنے سے پہلے

اپنے بیٹے کو دیکھ سکیں لیکن داؤد شاہ کو اپنی رہائی پر اتنی ندامت ہوئی کہ باہر آتے ہی خودکشی کر لی۔

ڈاکٹر خان صاحب کے بیٹے عبیداللہ خان کی ایک دفعہ ۴۰ گھنٹوں کی اور دوسری دفعہ ۶۰ گھنٹوں کی بھوک ہڑتالیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ جن رضاکاروں کا کردار اتنا بلند تھا ان پر معافی مانگنے کا الزام کہاں تک قرین قیاس ہو سکتا ہے۔

تشدد کے الزامات میں بھی حقائق کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ پشتون قوم کے غیرت مند افراد عدم تشدد پر اس حد تک کاربند تھے کہ ماؤں بہنوں کی بے عزتی اور بے آبروئی پر بھی محض تحریک کے تحفظ کی خاطر پولیس پر ان کے ہاتھ نہ اٹھے بلکہ وہ نہایت صبر و تحمل سے یہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے اگر اس نازک ترین موقع پر وہ تشدد پر آمادہ نہ ہو سکے تو بھلا عام حالات میں ان سے یہ توقع کیونکر کی جا سکتی ہے۔

۲۳ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء
قصہ خوانی فائرنگ کا حادثہ فاجعہ

۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کا خون آشام دن متحدہ ہندوستان کی تاریخ آزادی کا ایک خونیں باب ہے برطانوی سامراج کے دو سو سالہ عہد حکومت میں یہ رسوا کن واقعہ ہمیشہ یادگار رہے گا جب کہ سرحد کے غیور باشندوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر اس انگریز کی عظیم الشان قوت سے ٹکر لی جس کی مملکت میں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔

ہندوستان میں گاندھی جی نے نمک بنانے کی تحریک شروع کی اور سول نافرمانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ پراونشل کانگریس کمیٹی نے اپریل کے دوسرے ہفتے شاہی باغ پشاور

میں کانگرس کے پروگرام کے مطابق نمک بنانے کا اعلان کیا جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔

علی گل خان نمک بنانے والوں کے رہنما تھے موضع پبی سے شورہ مٹی لا کر اُسے بھگویا گیا اور جوش دے کر ھمر تک ایک پاؤ نمک تیار کیا گیا عصر کے وقت تک وہاں بیس ہزار لوگوں کا اجتماع ہو چکا تھا اس نمک کی پوڑیاں بنا کر نیلام کی گئیں جو سو سو دو دو سو روپے میں لوگوں نے خریدیں اس طرح صوبہ سرحد میں سب سے پہلے سول نافرمانی کا آغاز ہوا۔

بہت سے رہنما جو اس وقت کانگرس میں شامل نہیں ہوئے تھے انہوں نے بھی اس جلسے میں شرکت کی پشاور کے جواں سال مشہور سیاسی کارکن مسٹر رحیم بخش غزنوی نے ایک نہایت پر جوش تقریر کی جس میں اُس نے کہا۔

"میں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں مانتا اور اعلان کرتا ہوں کہ میں آج سے باغی ہوں"

اس جلسہ کے ایک ہفتہ بعد ۲۰ اپریل ۱۹۳۰ء کو اتمان زئی میں افغان جرگہ کی طرف سے ایک کسان کانفرنس کے نام سے عظیم الشان اجتماع ہوا جس میں تمام سیاسی انجمنوں کے علاوہ ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور خدائی خدمت گار کے نام سے رضاکاروں کی تنظیم کا فیصلہ کیا گیا اس جلسہ میں تقریروں کے علاوہ ایک پشتو مشاعرہ بھی ہوا۔ گل احمد شاکر کا ایک مصرع تھا ؎ جنگ دا آزادی لہ همیشه زلمی ورتلے دی

جس کا ترجمہ ہے۔ (آزادی کی جنگ کیلئے ہمیشہ نوجوان میدان میں آئے ہیں)

اس مشاعرے میں صوبے کے تمام پشتون شعراء نے حصہ لیا اور سارے صوبے میں ایک آزادی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے فوراً بعد ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کا تاریخی حادثہ وقوع پذیر

رہنما اور تمام سیاسی رہنما اور کارکن گرفتار کر لیے گئے۔

پراونشل کانگرس کمیٹی نے ۲۰ اپریل ۱۹۳۰ء کو پشاور میں شراب خانوں پر پکٹنگ کر کے سول نافرمانی کی باقاعدہ تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اسی اثنا میں بابا چا خان نے جو ان دنوں افغان جرگہ کے سربراہ تھے اور اس وقت تک کانگرس سے وابستہ نہ ہوئے تھے پراونشل کانگرس کمیٹی سے درخواست کی کہ وہ ۲۰ اپریل کو اتمان زئی میں کسان کانفرنس منعقد کر رہے ہیں جس میں کانگرس کے تمام رہنما اور رضا کار شامل ہو کر اسے کامیاب بنانے کی کوشش کریں کانگرس کمیٹی نے بابا چا خان کی درخواست منظور کرتے ہوئے اس کانفرنس میں شمولیت منظور کر لی اور اپنی سول نافرمانی کی تاریخ کو ملتوی کر دیا۔

اس کانفرنس کے اختتام پر ۲۱ اپریل کو پراونشل کانگرس کے اجلاس میں دوبارہ سول نافرمانی کے لیے ۲۳ اپریل کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اور سید الاحرار آغا لال بادشاہ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، مولانا خافیر بابائی، ڈاکٹر گھوش، غلام ربانی سیٹھی، ابراہیم بخش غزنوی، علی گل خان، اللہ بخش برقی، عبدالرحمان ریا، ایجر رام گمنتی، صنوبر حسین فہمند، پیرا خان اور کشن لال دیوان پر مشتمل ایک وفد کمیٹی منتخب کی گئی جس میں کانگرس اور بھارت سبھا دونوں کے نمائندے شامل تھے۔

کانگرس کمیٹی اور بھارت سبھا نے پورے زور شور سے سول نافرمانی کی تیاری شروع کر دی انہی دنوں کاکا صنوبر حسین کی تجویز پر مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کو بھارت سبھا میں شامل کیا گیا اور انہیں صدر منتخب کیا گیا جس سے بھارت سبھا میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی اور عوام میں اس جماعت کا وقار بڑھ گیا۔

کانگرس نے سول نافرمانی کے لیے اپنی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب ایک خفیہ میٹنگ

میں کیا لیکن حکومت کو اس کی بھنک پڑ گئی اور اس نے اس دستے کو قبل از وقت گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت کے فیصلے کے مطابق نصف شب کو انہیں ان کے گھروں پر گرفتار کیا جانے والا تھا لیکن یہ اطلاع ۲۲ر اپریل کو ۲ بجے کانگریس کے دفتر میں پہنچ گئی۔ اور جماعت نے اپنی ایک ہنگامی میٹنگ میں فیصلہ کیا کہ حکومت کے منصوبے کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ رضاکار رات کو گرفتاری نہ دیں اور پروگرام کے مطابق دن کے وقت اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کریں لیکن جماعت کے اس فیصلے کی اطلاع تمام رضاکاروں کو بروقت نہ پہنچائی جا سکی اور انہیں ۲۲ اپریل کی رات کو ان کے گھروں سے بیک وقت پولیس نے چھاپہ مار کر گرفتار کر لیا۔

ان میں سے صرف دو نوجوان رضاکار غلام ربانی سیٹھی اور اللہ بخش برقی نے رات کو گرفتاری نہ دی اور انہیں ۲۳ر اپریل کی صبح کو پراونشل کانگریس کمیٹی کے دفتر واقعہ گھنٹہ گھر پشاور سے پولیس کی ایک مسلح گارد نے آکر گرفتار کیا۔ گرفتاری کے بعد پولیس انہیں پاپیادہ موجودہ میونسپل کمیٹی کی طرف لے چلی جہاں پولیس کی لاری کھڑی تھی راستے میں لوگ ساتھ ہوتے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اچھا خاصہ جلوس بن گیا۔

میونسپل کمیٹی کے پاس پہنچتے ہی پولیس نے رضاکاروں کو لاری میں بٹھانا چاہا لیکن بے قابو ہجوم نے لاری کے ٹائر کاٹ دیئے ہجوم کا جوش و خروش دیکھ کر پولیس کے اوسان خطا ہو گئے۔ رضاکاروں نے پولیس کو مشورہ دیا کہ وہ انہیں چھوڑ دیں وہ خود کابلی تھانے پہنچ جائیں گے پولیس نے اسی میں عافیت دیکھی ان کی ہتھکڑیاں کھول دیں اور اپنی جان بچا کر چلی گئی۔

غلام ربانی سیٹھی اور اللہ بخش برقی دونوں رضاکار بیس ہزار افراد کے جلوس کی قیادت

کرتے ہوئے کابلی تھانے پہنچے اور تھانے میں داخل ہو کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا لیکن اس وقت قصہ خوانی میں تھانے کے سامنے عوام کا بے پناہ ہجوم جمع ہو چکا تھا لوگ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور رضاکاروں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے ہجوم نے بے قابو ہو کر تھانے پر پتھراؤ بھی شروع کر دیا بعض سمجھدار لوگوں نے ہجوم کو سمجھا بجھا کر منتشر کرنے کی کوشش کی اور قریب تھا کہ معاملہ رفع دفع ہو جاتا لیکن پولیس افسران نے صورت حال سے گھبرا کر ڈپٹی کمشنر کو فوج بھیجنے کے لیے ٹیلیفون کر دیا اچانک پہلی آرمرڈ کار نہایت تیز رفتاری سے کابلی دروازے میں داخل ہوئی اور ڈرائیور کی لاپرواہی سے تمام منڈی پشاور کا ایک نوجوان لدہ وسونہی رام کو کچلتی ہوئی گزر گئی اس حادثے نے جلتی پر تیل کا کام کیا لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھے ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور جوش انتقام میں بے قرار نظر آنے لگے۔

چار آرمرڈ کاروں کے بعد ایک فوجی افسر موٹر سائیکل پر آتا دکھائی دیا جسے عبدالرحمن مانی نے تیز دھار تبر کے ایک ہی وار سے وہیں ڈھیر کر دیا۔ دوسری طرف سید علاؤالدین نے ایک آرمرڈ کار کے پٹرول کی ٹینکی کھول کر اسے آگ لگا دی جو اپنے ڈرائیور سمیت وہیں جل کر خاک ہو گئی اب معاملہ کافی حد تک بگڑ چکا تھا گورا فوج نے اپنے محکوموں کی یہ جرأت برداشت نہ کی اور …… اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی ہجوم آہنی دیوار کی طرح ڈٹا ہوا تھا بعض لوگوں نے تو اپنی بندوقوں سے گولی کا جواب گولی سے دینے کی بھی کوشش کی لیکن آخر کب تک مشین گنوں، سٹین گنوں، لوئس گنوں اور بندوقوں کی بے پناہ فائرنگ نے لوگوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا …… لیکن بھاگنے پر بھی کہیں پناہ نہ مل سکی۔ گورے سپاہیوں نے گلی کوچوں اور گھروں میں لوگوں کا تعاقب کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قصہ خوانی کے وسیع بازار میں کشتوں کے پشتے لگ گئے اور ہر طرف میدان کارزار کا نقشہ نظر آنے لگا۔

سینکڑوں بے گناہ انسان خاک و خون میں لوٹ رہے تھے ہر طرف لاشوں کے انبار لگ ہوئے تھے اور خون کی ندیاں رواں تھیں ۔

فائرنگ ۱۱ بجے دن شروع ہوئی اور یہ سلسلہ مسلسل چار گھنٹوں تک یعنی ۳ بجے دن تک جاری رہا ، فوج تمام شہر پر قابض ہو جانا چاہتی تھی لیکن تین بجے تک وہ بمشکل تمام چوک یادگار کے پاس پہنچی اور ٹاؤن ہال پر قبضہ جما لیا ۔ شہر میں مارشل لا نافذ کر دی گئی لیکن دوسرے ہی روز ڈپٹی کمشنر کو اطلاعیں آنے لگیں کہ قبائل پر اس واقعہ کا شدید ردِ عمل ہوا ہے اور وہ غم و غصہ سے بے قابو ہو کر پشاور پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں ان اطلاعات نے حکام کو بد حواس کر دیا اور انہوں نے تیسرے دن شہر سے فوج ہٹا لینے کا فیصلہ کیا ۔ فوج ہٹا لینے سے شہر کی مسموم فضا پر نہایت خوشگوار اثر پڑا ۔ حالات معمول پر آنے لگے اور کاروبار چلنے لگا یہ تین دن عجیب طرح گذرے ۔ شہر سے فوج ہٹانے کے بعد پولیس نے انتظام سنبھالنے سے معذوری ظاہر کی اب شہر کا انتظام کانگرس کے رضاکاروں کے ہاتھ میں تھا ، وہی ٹریفک کنٹرول کر رہے تھے اور دوسرا تمام کام بھی انہوں نے ہی سنبھال رکھا تھا یہ دن اس خوش اسلوبی سے گذرے کہ کیا مجال جو ذرا بھی گڑبڑ پیدا ہوئی ہو ، روز بروز حالات معمول پر آ رہے تھے لیکن شہر کی فضا بدستور سوگوار تھی لوگوں کے دل غم و رنج سے بھرے ہوئے تھے اور ہر طرف ایک اداسی برس رہی تھی ۔

یہاں گڑھوالی فوج کا ذکر ضروری ہے جسے دوسرے دن گورا فوج چارج دینے لگی تو اس نے چارج لینے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ ہم نہتے شہریوں سے مقابلہ کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہیں چنانچہ ان سے ہتھیار رکھوائے گئے اور بمبئی پہنچا کر فوجی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں ۱۰ برس سے ۱۴ برس تک سنگین سزائیں دی گئیں

اس انسانیت سوز واقعہ نے بیرونی دنیا میں حکومت برطانیہ کو بہت بدنام کیا اور اس کا وقار خاک میں مل گیا اس حادثے میں شہید ہونے والوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہے جن کی لاشیں کچھ تو جلادی گئیں اور کچھ نہایت پُراسرار طریقے سے حکومت نے لاریوں میں بھر کر دریابُرد کر دیں۔

حقیقت میں یہ انہیں شہداء کے مقدس خون کا اثر تھا جس نے انگریز سامراج کے قدم اکھیڑ دیئے اور وہ اس ملک کو آزادی دینے پر مجبور ہوا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کے حادثہ فاجعہ میں جن شمع حرّیت کے پروانوں نے اپنی جانیں نثار کیں ان کی تعداد بلاشبہ سینکڑوں تک پہنچتی ہے لیکن جس پُراسرار طریقے سے حکومت نے ان شہداء کی لاشوں کو ٹھکانے لگایا اس کی وجہ سے شہیدوں کی صحیح تعداد کا تعین مشکل ہے اور اُن کے نام اور پتے معلوم کرنا تو ناممکنات سے ہے تاہم جن شہیدوں کے نام مختلف ذرائع سے مہیا ہو سکے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ بابو عبدالصمد خان محلہ نو جوڑی ملازم پی ڈبلیو ڈی پشاور

۲۔ عبدالحکیم خان نانبائی کریم پورہ پشاور

۳۔ محمد عثمان ولد نظام الدین سبزی فروش محلہ گندی ویڑہ پشاور

۴۔ سردار دکھا سنگھ پکہ گلی پشاور

۵۔ اکرم خان ولد غفور خان سواتی محلہ دفتران پشاور

۶۔ موتی لال سرا سیہ پشاور

۷۔ فضل رحمان ولد داؤد تکیہ ملنگان پشاور

۸ - نذیر احمد طالب علم جماعت ششم عمر ۱۲ سال گور کھٹری پشاور

۹ - عبدالجلیل ولد داؤد محلہ جٹاں پشاور

۱۰ - ولی محمد ولد جبہ خان ہوتی مردان

۱۱ - ملنگ شاہ ولد احمد شاہ محلہ گگڑاں پشاور

۱۲ - قمر گل ولد خان گل گلاب خانہ پشاور

۱۳ - سوبھا سنگھ ہوتی مردان

۱۴ - جوگندر لال بنوں

۱۵ - سدھیر کشن پکہ گلی پشاور

۱۶ - کرشن چندر نوشہرہ کلاں

۱۷ - اوتار سنگھ شربت فروش جوگن شاہ پشاور

۱۸ - منظفر علی مسافر

۱۹ - شاد محمد مسافر

۲۰ - افسر علی شاہ مسافر

۲۱ - عبدالمجید ولد رحیم بخش گلاب خانہ پشاور

۲۲ - پیر محمد ولد محمد زرین گلاب خانہ پشاور

۲۳ - محمد عالم ولد فضل نور سرائے عبدالطیف پشاور

۲۴ - گل محمد ولد غلام جیلانی گندی ویڑہ پشاور

۲۵ - صفدر ولد جمال موضع کچاوڑی

۲۶ - مستقیم ولد نامعلوم محلہ گگڑاں پشاور

۲۷ - عبداللہ جان ولد نامعلوم مسافر

۲۸ - پہلوان گل ولد نامعلوم مسافر

۲۹ - گل رحمان ولد شیر دل محلہ گگڑاں پشاور

۳۰ - گل خان ولد نامعلوم نمک منڈی پشاور

۳۱ - محمد اشرف ولد نامعلوم نمک منڈی پشاور

۳۲ - غلام جان ولد جمعہ خان موضع شیخان

۳۳ - داؤد میاں ولد نامعلوم موضع ہزار خوانی

۳۴ - رمضان ولد نامعلوم نمک منڈی پشاور

۳۵ - فضل دین ولد محمد بخش ضلع ہزارہ

۳۶ - محمد افضل ولد نامعلوم مسافر

۳۷ - فضل محمد ولد نور محمد سرائے شہباز پشاور

۳۸ - آغا محمد ولد عمر بخش ڈبگری پشاور

۳۹ - محمد دین ولد نامعلوم کچی محلہ پشاور

۴۰ - دلاور ولد نامعلوم مسافر

۴۱ - اکرم ولد نامعلوم مسافر

۴۲ - غفور ولد نامعلوم موضع ہزار خوانی

۴۳ - زائد اللہ ولد نامعلوم مسافر

۴۴ - کریم شاہ ولد داؤد شاہ ڈھکی نعل بندی پشاور

۴۵ - مداح ولد نامعلوم ڈھکی نعل بندی پشاور

۴۶ ۔ عبدالاحد ولد محمد محلہ جگلہ پشاور

۴۷ ۔ فقیر محمد ولد نامعلوم محلہ بھوانی داس پشاور

۴۸ ۔ عبدالغفار ولد نامعلوم علاقہ گنج پشاور

۴۹ ۔ دادگل ولد نامعلوم سوڑے زئی

۵۰ ۔ ملنگ ولد نامعلوم علاقہ گنج پشاور

۵۱ ۔ شاہ افضل ولد نامعلوم موضع نوتھہ

۵۲ ۔ سید محمد ولد نامعلوم علاقہ پنڈی گھیپ

۵۳ ۔ سواتی خان مسافر

۵۴ ۔ مستقیم ولد فضل سکنہ چینی پایان

۵۵ ۔ رام چند مسافر

۵۶ ۔ لال سنگھ مسافر

۵۷ ۔ بلونت سنگھ ولد شیر سنگھ جگہ گلی پشاور

ان کے علاوہ ۲۰ لاشیں ہسپتال والوں نے ہسپتال میں دفنا دیں اور ۴ شہیدوں کی لاشیں جن میں ایک عورت بھی تھی مختلف دیہات کے لوگ اٹھا کر لے گئے اور ساڑھے پانسو کے قریب زخمی صوبے کے مختلف ہسپتالوں میں داخل کئے گئے ۔

کانگرس کے رضاکار جو لاشیں اٹھا کر لے گئے وہ کانگرس کے دفتر واقع محلہ خداداد منڈی بیری موچی پورہ میں پڑی تھیں جو انہی مقامات پر مسجدوں اور خانقاہوں وغیرہ میں دفنا دی گئیں اور کچھ شہر سے باہر قبرستانوں میں دفنائی گئیں بعض غیر مسلموں کی لاشیں جلا دی گئیں ۔

۳۰ اپریل کے حادثے کی خبر جب باچا خان کے کانوں تک پہنچی تو وہ اپنے چار ساتھیوں عبدالاکبر خان خادم، سرفراز خان میاں احمد شاہ اور شاہ نواز خان (جنہوں نے بعد میں خودکشی کر لی) کے ہمراہ حالات معلوم کرنے کی غرض سے پشاور روانہ ہوئے لیکن تھانہ ناگئی میں ہی انہیں گرفتار کر کے رسالپور لے جایا گیا جہاں خان بہادر قلی خان اسسٹنٹ کمشنر آف چارسدہ نے باچا خان کو فرانٹیئر کرائمز ریگولیشن کے تحت تین سال قید کی سزا دے کر گجرات جیل بھیج دیا۔

اسی دن ۴ بجے عصر عبدالرشید شہید کو گرفتار کر کے سزا دے کر گجرات پہنچا دیا گیا جو ملزم گرفتار ہو کر پشاور جیل پہنچے ان سے شہر کے حالات سن کر تمام قیدیوں نے سنٹرل جیل پشاور میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا چنانچہ وہاں سے سیاسی قیدیوں کو فوراً قلعہ بالا حصار پہنچایا گیا جہاں راتوں رات حاجی اکبر علی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انہیں مسٹر میلین اے ڈی ایم کے سامنے پیش کیا جس نے انہیں فرانٹیئر کرائمز ریگولیشن کے تحت بڑی سنگ دلانہ سزائیں دیں جس میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اور مسٹر رحیم بخش غزنوی کو نو نو برس کی سزا ہوئی جو سب سے بڑی سزا تھی یہ تمام قیدی پنجاب کے گجرات جیل میں منتقل کر دیئے گئے جو ان دنوں سارے ہندوستان کے سیاسی قیدیوں کے لیے سپیشل جیل مقرر تھا

گھڑوالی فوج کے انکار کے بعد گورا فوج اور پونا ہارس رسالہ سارے شہر میں تعین کیا گیا چونکہ اس واقعہ کے بعد ملک بھی بڑی مشتعل تھی اور قبائل سے بھی خطرناک خبریں آرہی تھیں اس لیے چیف کمشنر سر نارمل بولٹن نے فوجی جرنیل اور پولیس جرنیل آئی منگیر اور جنرل سٹاف فرانٹیئر کنسٹبری اور ڈپٹی مر کی مخالفت کے باوجود شہر سے فوج واپس بلالی اور مزید گرفتاریاں بھی بند کرا دیں جس کا کافی خوشگوار اثر پڑا چونکہ شہر کا انتظام پولیس نے بھی نہ

سنبھالا اس لیے کانگرس رضاکار نظم و نسق قائم کرنے میں لگے رہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا کو فوجی جنرل آفیسر کمانڈنگ این ڈبلیو ایف پی ۔ اُس میگر اور جنرل آفیسر پولیس نے مل کر خفیہ طور پر اطلاع دی کہ پشاور اس وقت باغی ہو چکا ہے اور یہاں سے فوج واپس کر کے ہماری توہین کی گئی ہے۔ تیسرے دن اچانک گورنمنٹ آف انڈیا کا فارن سیکرٹری معہ اپنے تمام عملے کے بذریعہ ہوائی جہاز پشاور پہنچا جس کی آمد سے یہاں کا چیف کمشنر بالکل بے خبر تھا۔ فارن سیکرٹری نے فوجی جرنیل اور پولیس جرنیل کے ساتھ آکر فوج اور پولیس کے ذریعے صبح صبح گورنمنٹ ہاؤس کو گھیر لیا اور چیف کمشنر سے استعفیٰ لے کر اُسے بمعہ اس کی بیوی کے سرکاری موٹر میں بٹھا کر راولپنڈی پہنچا دیا اور ریونیو کمشنر مسٹر لیٹی مر کو عارضی چیف کمشنر بنا دیا۔

چونکہ خبروں پر بلیک آؤٹ تھا اور باہر کے لوگ حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ اس لیے یہ تمام واقعات کانگرس اور بھارت سبھا کے رہے سہے ممبروں نے باہر پہنچانے کے انتظامات کئے ان واقعات کو مسٹر ایم چند نے بھارت سبھا کے دفتر میں بیٹھ کر قلم بند کیا اور عبدالعزیز خوش باش یہ ڈاک لے کر لاہور گیا جہاں آل پنجاب کانگرس کمیٹی کے سیکرٹری سردار دول سنگھ کو یہ خط بحفاظت تمام پہنچا دیا (یاد رہے کہ ان دنوں سرحد کانگرس کمیٹی پنجاب کے ماتحت تھی) اتم چند وہ شخص ہے کہ سبھاش چندر بوس کابل میں اس کے ہاں جا کر ٹھہرا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر اتم چند کو وہاں سے گرفتار کر کے منگوایا گیا اور قلعہ میں نظر بند رکھا گیا۔

اس خط کے پہنچتے ہی پنجاب اور ہندوستان کے اخبارات میں یہ واقعات شائع ہوئے اور سارے ہندوستان میں ایک طوفان مچ گیا کیونکہ اس وقت تک لوگ ان حالات سے بالکل بے خبر تھے۔

نیا چیف کمشنر مسٹر لیٹی مرنہایت سخت گیر انگریز تھا وہ فوجی اور پولیس جرنیل کا ہم خیال تھا اُس نے آتے ہی شہر کو پھر فوج کی حراست میں دے دیا اور عام گرفتاریاں شروع کر دیں چنانچہ یہ لوگ گرفتار کئے گئے۔

سردار عبدالرب نشتر، پیر بخش خان وکیل، عبدالعزیز خوش باش، سردار کاہن سنگھ، محمد عثمان قصوری، حاجی کرم الٰہی، ماسٹر امیر چند رنگین، سردار ملاپ سنگھ، آغا سید قاسم شاہ، وزیر محمد نجار، اتم چند، بخشی فقیر چند، اچرج رام، ماسٹر شیر علی، اللہ بخش یوسفی، ڈاکٹر گیلانی، مہاشہ کرشن ایڈیٹر فرانیٹر ایڈووکیٹ، مفتی میر احمد،

پیر بخش خان کو مسٹر میلن اے ڈی ایم نے ایک سال قید کی سزا دے کر ڈیرہ اسماعیل خان بھیج دیا باقی تمام رضاکاروں پر دفعہ ۱۲۱ باغیانہ ایکٹ کے تحت حاجی صاحب ترنگزئی اور قبائلیوں کو اُکسانے اور بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا ہر پندرہ دن بعد ریمانڈ لیا جاتا کیپٹن کاب نے انتہائی کوشش کی لیکن چھ ماہ تک کوئی مقدمہ ثابت نہ کر سکا آخر تعزیرات ہند ۱۷ و اور ۱۷ ب کے تحت دو سال سے چھ ماہ تک کی سزائیں دے کر انہیں جیل بھجوا دیا گیا

اس کے بعد کانگرس کمیٹی، نوجوان بھارت سبھا اور ان کی معاون جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا یہ حکم ایک پوسٹر کے ذریعے مشتہر کیا گیا اور اس طرح شہر میں وحشت اور ہراس پھیلانے کی کوشش کی گئی

گھڑوالی فوج

اے گھڑوالی فوج کے غیور سپاہیو

ہم تم پر سلام بھیجتے ہیں

تم نے نہتے عوام پر ہاتھ نہ اٹھا کر
غیرت و حمیت کا ایسا ثبوت پیش کیا
جس نے تمہاری قوم کا وقار دنیا کی نظر میں بلند کر دیا
اور آج تمہارا نام سنتے ہی ہمارے سر احترام اور عقیدت سے جھک جاتے ہیں
تم انگریز حکمرانوں کے معتوب بنے
تمہیں شدید سزائیں دی گئیں
تمہیں طرح طرح کی صعوبتوں میں مبتلا کیا گیا
آج تم زندہ ہو یا نہیں
لیکن تمہارا یہ کارنامہ قیامت تک زندہ رہے گا
اور ملک کی جنگ آزادی میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا
اور جب تک دنیا میں حریت پسند انسان موجود ہیں
تمہارے حضور ان کے سر احترام سے جھکتے رہیں گے
اے گڑھوالی فوج کے غیور سپاہیو
ہم تم پر سلام بھیجتے ہیں

گڑھوالی فوج کا بے مثل کردار انگریزوں کو عبرت دلانے کے لیے کافی تھا انہوں نے دوسرے دن پورے اتفاق سے اپنی بارکوں سے ڈیوٹی پر آنے سے انکار کر دیا اس فوج کو اسی دن معطل کر دیا گیا انہوں نے نہایت پرامن طور پر اپنا اسلحہ واپس کر دیا یہ فوج گروہ فوج کے زیر حراست رکھی گئی اور پھر تین دن کے اندر رات کو سپیشل ٹرین میں حویلیاں اور

یہاں سے کاکول پہنچا دیا گیا اور وہاں سے جا کر بارکوں میں بند کر دیا گیا پھر باقاعدہ فوجی قانون کے تحت کورٹ مارشل کیا گیا۔ تقریباً تین ماہ تک یہ بمبئی میں کورٹ مارشل رہے پھر انہیں ۱۰ سے بیس سال تک سنگین سزائیں دے کر مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا اور ان کی بقیہ کمپنیوں کو نوکری سے سبک دوش کر دیا گیا۔

گڑھوالی فوج کی پشاور سے روانگی کے دوسرے دن چوک یادگار پر ایک جلسہ نوجوان بھارت سبھا کی طرف سے منعقد ہوا جس میں ایک رزولیوشن کے ذریعے انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔

چونکہ ایک دن پیشتر شہیدان قصہ خوانی کی یادگار عاشق حسین فروٹ مرچنٹ نے نہایت خوبصورت تعمیر کی تھی لہٰذا اس جلسے کے بعد چالیس ہزار آدمیوں کا جلوس اس یادگار کی طرف روانہ ہوا اس جلوس میں بھارت سبھا کے کارکن یہ نظمیں پڑھ رہے تھے۔

شہیدوں کے مزاروں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہو گا

آزادی ہند کی خواہش کو مقبول خاص و عام کیا
دل اہل ستم کے دہل گئے جو دت بھگت نے کام کیا

یہ پہلا جلوس تھا جس نے ان شہیدوں کی یادگار پر پہنچ کر پھولوں کی چادریں چڑھائیں اور انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔

اس کے بعد عاشق حسین فروٹ مرچنٹ کو یہ یادگار بنانے کے جرم میں گرفتار کیا گیا اور

اُسے ایک رات نہایت پراسرار طریقہ سے فوج کی نگرانی میں لاکر اُسی کے ہاتھوں یہ یادگار مسمار کرائی گئی اور بعد میں اس پر مقدمہ چلا کر اُسے بھاری سزا دی گئی۔

قصہ خوانی میں شہیدوں کی یادگار دوبارہ کانگرس وزارت کے عہد میں تعمیر ہوئی اور بعد میں مسلم لیگ نے اپنی الگ یادگار اس کے ساتھ بنائی چنانچہ یہ دونوں یادگاریں آج بھی قصہ خوانی میں موجود ہیں۔

شہر میں رات کے چار بجے دوبارہ گورا فوج کو داخل کیا گیا۔ ڈھکی دالگراں پر درگاہی کے مکان میں آگ لگ گئی چھاؤنی سے فائر بریگیڈ کے ساتھ ہی فوج بھی آگئی۔ یہ فوج ہی سکاٹ لینڈ والی گورہ فوج تھی اس نے سارے شہر کی ناکہ بندی کر کے میونسپلٹی ٹاؤن ہال کو اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر بنایا اور پھر مزید گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔

۲۴ اپریل کو جب شام کے چار بجے فوج کانگرس کمیٹی سے سارا سامان لے گئی۔ تو اسی دن بھارت سبھا کے دفتر پر بھی چھاپہ مارا اس وقت اچرج رام گنج والا وہاں موجود تھا اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی فوج نے دروازہ توڑنا چاہا وہ دری میں تمام سامان باندھ کر اور تمام لٹریچر صندوق میں بند کر کے اوپر کوٹھے پر چلا گیا ادھر محلہ عبداللہ جان سوداگر چرم کے مکان میں اس کی بیوی امداد کے لیے تیار کھڑی تھی جسے اچرج رام نے یہ سامان دیا اور پھر اس عورت کی مدد سے خود نیچے اترا۔

فوج دروازہ توڑ کر بھارت سبھا کے دفتر میں آئی تو وہاں کچھ بھی نہ پایا۔ عبداللہ جان کے مکان کا راستہ محلہ خوشکی میں تھا اچرج رام نے مسز عبداللہ جان سے کہا کہ یہ بکس بہت قیمتی ہے یہ قومی امانت ضائع نہ ہونے پائے اس جواں ہمت عورت نے پہلے اچرج رام کو باہر نکالا پھر یہ صندوق چوک کاڈی خانہ میں عبدالرشید نجار کے مکان پر پہنچا کر چھپا دیا

یہ صندوق دو سال بعد جب سب لوگ رہا ہو کر آئے تو مسز عبداللہ جان نے بحفاظت جماعت کے حوالے کیا ۔

بھارت سبھا کے دفتر کے نیچے حافظ عبدالکریم ٹوپیاں بیچتا تھا اسے مارشل لا ختم ہونے کے دو مہینے بعد پولیس نے پکڑا اور کہا ان لوگوں کو شناخت کرو ...... اس نے جواب دیا جاننے کا کیا سوال ہے میں خود ان کا ممبر ہوں اس پاداش میں اسے چھ ماہ کیلئے جیل بھیج دیا گیا ۔

شہر میں جب دوبارا فوج داخل ہوئی اور جب ٹریفک سنبھالنے آئی تو والنٹیر کور کا سالار عبدالحکیم پھیل چوک یادگار میں ٹریفک ڈیوٹی دے رہا تھا وہ فوج کو بھی ہاتھ دیتا رہا یہاں تک کہ فوج نے اُسے اتنا پیٹا کر وہ ایک ہفتے بعد مرگیا ۔

یہ شخص ان پڑھ مگر مخلص کارکن تھا سب سے پہلے رولٹ بل کے جلوس میں شامل ہوا اور رولٹ بل کو رولٹ دین شہید سمجھ کر اس کا ماتم کرتا رہا ۔

قصہ خوانی فائرنگ کے اسباب

انگریزوں کو جب اس وحشیانہ اقدام پر ہر طرف سے مطعون کیا جانے لگا تو انہوں نے رہنما کاروں پر الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے متشددانہ رویّہ سے حکومت کو اس امر پر مجبور کیا ورنہ ایسا کرنے کا حکومت کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی ۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کانگرس عدم تشدد کی پابند تھی اور نوجوان بھارت سبھا کا دائرۂ عمل صرف مزدوروں اور کسانوں کی اصلاح تک محدود تھا اور کسی قسم کا تشدد بھی ان کے پروگرام میں نہیں تھا نہ ہی کسی جماعت کے رہنما کاروں نے فساد کرنے میں پہل کی بلکہ دراصل حکومت کی یہ تیار شدہ سکیم کا نتیجہ تھا جس کے وجوہات حسب ذیل تھے ۔

۱ - انگریز بھوری پر قبضہ کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے وطن دشمن لوگوں سے ساز باز کر رکھی تھی۔

۲ - وہ سابق صوبہ سرحد میں "خدائی خدمت گار" اور نوجوان بھارت سبھا کی تحریکوں کو کچلنا چاہتے تھے جن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے وہ خائف تھے۔

۳ - حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں جاہ طلب عملے کے درمیان رسہ کشی جاری تھی چنانچہ جب کوئی چیف کمشنر یا پولیٹیکل ایجنٹ تبدیل ہوتا تو وہ اپنے جانشینوں کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کرتا تاکہ وہ دوبارہ اس عہدے پر واپس آسکے چنانچہ صوبہ سرحد کے مختلف مقامات قصہ خوانی ہاتھی خیل انگر وغیرہ میں جتنے حادثے بھی ہوئے یہ سب پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے پیدا کردہ تھے بلکہ قبائلی علاقے کی تمام جنگیں بھی اسی بدنام محکمے کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھیں

۴ ملک میں بڑھتے ہوئے سیاسی رجحان اور حریت پسند تحریک کی روک تھام کیلئے حکومت متشددانہ اور استحصالی اقدام کرنے کا منصوبہ بنا چکی تھی تاکہ عوام کو خوف زدہ اور دہشت زدہ کر کے ان تحریکوں کی روک تھام کی جائے۔

۵ - انگریزوں کے دماغوں میں حکمرانی کا نشہ اور غرور اس انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو انسان بھی نہیں سمجھتے تھے چنانچہ جب یہ لوگ تن کر ان کے سامنے آگئے اور ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے اور انقلابی نعرے لگاتے ہوئے آزادی کا مطالبہ کرنے لگے تو یہ باتیں ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گئیں اور وہ مغلوب الغضب ہو کر وحشت و بربریت پر اتر آئے۔

۶ - انگریز حکمرانوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ شاید ملک میں صرف چند ایک لوگ ایسے ہیں

جو سیاسی شورش کے محرک ہیں اور اگر ان سرغنوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا تو یہ ہنگامہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اور تمام تحریکیں مٹ جائیں گی وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ان لوگوں کے پیچھے عوام کی اتنی بڑی اور مضبوط طاقت موجود ہے جسے مٹانا اُن کے بس کا کام نہیں۔

۱۹۳۰ء میں پشاور سنٹرل جیل کی حالت

صوبے کے طول و عرض شہروں اور دیہاتوں سے اتنی کثیر تعداد میں لوگ گرفتار ہو کر جیلوں میں پہنچ گئے کہ سرحد کے جیلوں کی وسعتیں ان پر تنگ ہو گئیں صرف پشاور سنٹرل جیل میں سیاسی قیدیوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۵۰۰ تھی جیل میں جگہ نہ رہی تو سیاسی قیدیوں کو پاؤں میں زنجیر لگا کر جیل سے باہر باندھنا شروع کر دیا گیا

یہ تحریک اس وسعت سے پھیلی کہ اس میں ایک نابالغ بچہ سجاول بھی اور ایک صد سالہ بوڑھا حریف بابا بھی گرفتار ہو کر جیل پہنچ گئے۔ حریف بابا اتنا ہی کمزور اور نحیف تھا جتنا وہ معصوم بچہ ..... اس تحریک میں جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم شخص موجود تھا یہ تحریک اتنی عوامی ہو چکی تھی کہ ایک معمولی چرس پینے والا فقیر دو بھی اور صوبہ سرحد کے سب سے بڑے عالم قاضی صاحب کرڈی والے بھی جیل چلے گئے کتنی ہی عورتیں بھی گرفتار ہوئیں اور دو ہیجڑے بھی جیل میں دیکھے گئے جن کے لیے جیل والوں کو بڑی مشکل پیش آئی کہ انہیں عورتوں کے احاطے میں رکھا جائے یا مردوں کے احاطے میں ..... یہ سب لوگ اپنی پوری میعاد اسیری گزار کر نکلے۔ اس وقت جیل سپرنٹنڈنٹ کیپٹن ہاروے ایک مدراسی شخص تھا اور انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات صوبہ سرحد کرنل

بڑا ڈے تھا کرنل بڑا سخت گیر، تند مزاج اور متعصب انگریز تھا اس کے دل میں جذبۂ انتقام کوٹ کوٹ کر بھرا تھا وہ ہر شخص کو بُری نظر سے دیکھتا اور سیاسی لوگوں سے خصوصاً حقارت آمیز سلوک کرتا۔

اس نے ڈاکٹر سی سی گھوش صدر کانگرس کمیٹی کو قلعہ میں جاکر کہا کہ تم لوگ سب کے سب بھیڑوں کے غول ہیں بھیڑیوں کا لباس پہن کر گھوم رہے ہو اور عدم تشدد کے پردے میں تشدد کر رہے ہو۔ ...... ڈاکٹر نے جواب دیا۔ آپ سیاست میں نہ الجھیں آپ سرکاری ملازم ہیں اپنا کام کریں آپ کی قوم بھیڑیوں سے بدتر ہے پہلے ان کی اصلاح کیجئے یہ سُنتے ہی وہ آگ بگولا ہو گیا اور ڈاکٹر گھوش کے سینے میں زور سے مُکا مارا۔

اس کے بعد سید قاسم جان کے پاس جا کھڑا ہوا اور اُن سے کہا تم کانگرس کے سیکرٹری نہیں ہندو مہاسبھا کے سیکرٹری ہو تم ہندو ہو کیونکہ ہندوؤں کے ساتھ شامل ہو۔ ......

انہوں نے کہا۔ ہندو ہمارے ہم قوم ہیں اور انگریزوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔

پھر ماسٹر شیر علی سے کہا۔ تم کمیونسٹ ہو روسیوں کے ایجنٹ ہو۔ ماسٹر نے کہا۔ تم کتے ہو، سؤر ہو۔ اس پر وہ بڑا برافروختہ ہوا اور ماسٹر صاحب کو خوب پٹوایا

یہ ظالم کرنل اگر کسی کو ہنستا دیکھ لیتا تو اُسے بلا کر بید لگواتا۔ ...... اُس نے نوعمر سجاول کو معافی مانگنے پر مجبور کیا اور جب اُس نے انکار کیا تو اسے بید لگانے کا حکم دیا۔ پہلے بید پر اُس نے چیخ ماری ۔ او خدا ......

اس پر کرنل نے قہقہہ لگا کر کہا۔ کہاں ہے تمہارا خدا جاؤ اسے بلاؤ کہ تمہیں مجھ سے آکر چھڑائے۔ ......

اس کے بعد اُس غیرت مند بچے نے کوئی آواز نہ نکالی بلکہ ہر بید پر اپنے بازو کو کاٹتا

رہا اور خون اُس کے گھٹنوں سے بہتا رہا۔

ایک دوسرا لڑکا جو تحصیل مردان کا رہنے والا تھا اور ایف اے کا طالب علم تھا اس سنگ دل کرنل نے محض معافی نہ مانگنے پر اُسے پورے تیس بید لگوائے جس سے اس بچے کی بصارت جاتی رہی۔

بید زنی کے لیے ڈیرہ اسماعیل خان سے دو میعادی قیدی منگوائے گئے جو اس فن کے ماہر خیال کئے جاتے تھے۔ بید لگانے والوں کو ایک خاص قسم کی وردی پہنائی جاتی جس میں اس کا چہرہ چھپا ہوتا تاکہ کوئی شناخت نہ کر سکے۔ ان بید زنوں پر مشقت معاف ہوتی اور انہیں اچھی خوراک دی جاتی اور وہ آزادی سے گھوم پھر سکتے تھے۔

جیل میں سیاسی قیدیوں کو کولھو، کراس، کمبل ملائی، مونجھ کٹائی اور چکائی کی ظالمانہ اور سخت ترین مشقتیں دی جاتیں اور معمولی باتوں پر سزا کے طور پر قید تنہائی اور چکی کی مشقت عام تھی۔

سردار عبدالرب خان نشتر جیل میں اکثر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ظفر علی خان کی یہ مشہور نظم گایا کرتے

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا ۔۔۔ باطل کا پارہ پارہ گریبان کر دیا
سر رکھ دیا رضائے خدا کی حریم پہ ۔۔۔ خنجر کو بھی حوالۂ شیطان کر دیا
اوراق جبر و جور و جفا کو بکھیر کر ۔۔۔ شیرازۂ سلطنت کا پریشان کر دیا
گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا

سردار عبدالرب خان نشتر، عبدالحی اور ماسٹر امیر چند بمبل نے چیف کورٹ

پشاور میں اپیل کی کہ ہمیں جو سزا ملی ہے وہ غیر آئینی ہے کیونکہ جماعتوں کو غیر قانونی قرار دینے سے پہلے ہم گرفتار کئے گئے ہیں اس وقت مسٹر فریزر چیف جج اور خان بہادر سعدالدین خان سب جج تھے بنچ نے اپیل منظور کرتے ہوئے ان ہر سہ حضرات کو رہا کر دیا لطف یہ کہ جس دن ان کی اپیل منظور ہو کر آئی تو ان کی رہائی میں صرف تین دن باقی تھے - ان کی رہائی کے تین دن بعد ان کے تمام ساتھی بھی رہا کر دیئے گئے لیکن انہیں لوگ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے کیونکہ جماعتی طور پر اپنی سزا کے خلاف اپیل نہ کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور انہوں نے اس فیصلے کی دیدہ و دانستہ خلاف ورزی کی تھی ۔

جب کانگرسی اور بھارت سبھائی رہنما گرفتار ہو کر سنٹرل جیل پشاور پہنچے تو رات کا وقت تھا صبح وہ ناشتہ کر رہے تھے کہ اللہ بخش برقی اور غلام ربانی سیٹھی بھی پہنچ گئے اور انہوں نے بتایا کہ ان کی گرفتاری پر شہر میں بڑا ہنگامہ ہو رہا ہے - ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے کہ قصہ خوانی میں فوج کی فائرنگ کی اطلاع آگئی یہ تمام سیاسی قیدی ایک خاص احاطے میں بند تھے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ جیل میں شور و غوغا مچ گیا قیدیوں کے ہجوم نے آتے ہی سیاسی قیدیوں کے احاطے کا دروازہ توڑ ڈالا اور انہیں کندھوں پر اٹھا کر باہر لے گئے سیاسی قیدی اپنے احاطے سے نکلے تو باہر ایک انقلابی کیفیت نظر آئی تمام بارکیں پھانسی کی کوٹھڑیاں، کارخانے کی کھڈیاں اور چکیاں توڑ دی گئیں تھیں اور جیل کا عملہ بھاگ کر باہر چلا گیا تھا ۔

جیل کے ان اخلاقی قیدیوں کی تعداد اڑھائی ہزار کے قریب تھی یہ سب بہ آواز بلند سیاسی قیدیوں سے کہنے لگے کہ آپ ہمارے جرنیل ہیں اور ہم آپ کی فوج ...... اب آپ حکم دیں تاکہ جیل کی چار دیواری توڑ کر ہم باہر نکلیں اور انگریزوں کے خلاف آخری

جہاد کریں

قیدیوں کے اس جذبہ سے بعض نوجوان سیاسی کارکن بہت متاثر ہوئے اور جذبات کی رو میں بہہ کر ان کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے لیکن چونکہ اس موقع پر آغا لعل بادشاہ جیسے جہاندیدہ اور سنجیدہ سیاسی رہنما موجود تھے اس لیے انہوں نے قیدیوں کے اس جذبے کی تعریف کرتے ہوئے عدم تشدد کی تلقین کی اور فرمایا کہ ہماری تحریک سارے ہندوستان سے وابستہ ہے اور تحریک کو ہمارے اس جذباتی اقدام سے کافی نقصان پہنچے گا۔ انہوں نے قیدیوں کو پرامن رہنے کی تلقین کی اور ہدایت کی کہ وہ جیل کے قواعد کے مطابق اپنے اپنے کام میں لگ جائیں اور تمام سیاسی کارکنوں کو ساتھ لے کر اپنے احاطے میں آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد پولیس کی بھاری جمعیت نے آکر تمام قیدیوں کو محاصرے میں لے لیا اور سیاسی قیدیوں کو فوراً وہاں سے نکال کر قلعہ میں پہنچا دیا جہاں سے سزائیں دے کر گجرات جیل پہنچایا اور وہاں سے مختلف قیدیوں کو مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا۔

پشاور پر آفریدیوں کا حملہ

پچھلے کسی باب میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ بہت سے سیاسی قیدیوں کو تو سزا دے کر گجرات بھیج دیا گیا لیکن کچھ سیاسی رہنما جن میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے

سردار عبدالرب خان نشتر

پیر بخش خان وکیل

صنوبر حسین خان مہمند

عبدالعزیز خوشباش

سردار کا بن سنگھ

محمد عثمان قصوری

حاجی کرم الٰہی

ماسٹر امیر چند رنگین

سردار ملاپ سنگھ

آغا سید قاسم جان

نذیر محمد نجار

اتم چند

بخشی فقیر چند

اچھرج رام

ماسٹر شیر علی

اللہ بخش یوسفی

ڈاکٹر گیلانی

مہاشہ کرشن

مفتی میر احمد و مصطفیٰ غالب

انہیں قلعہ میں ہی رکھا گیا کیونکہ ان کے خلاف باغیانہ ایکٹ کے تحت حکومت مقدمہ چلانا چاہتی تھی اور اس طرح چھ ماہ تک یہ قلعہ ہی میں رہے کیونکہ ان کے خلاف کوئی ثبوت مہیا نہیں ہو رہا تھا ان لوگوں کو میگزین کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رکھا گیا سخت گرمی کا موسم تھا اور یہ لوگ بلیک ہول میں بند تھے شہر میں افواہیں گرم

تھیں کہ انہیں گولی مار دی جائے گی ۔

۵ مئی کو ۶ بجے دن اچانک آفریدیوں نے پشاور شہر کے مال گودام پر حملہ کر دیا تمام رات طرفین کی طرف سے خوب زناٹے کی فائرنگ ہوتی رہی پروگرام یہ تھا کہ دوسری طرف سے مہمند بھی حملہ کر دیں گے اور انگریزوں کو انک پار بھگا کر صوبہ سرحد کے علاقے پر مکمل قبضہ کر لیں گے لیکن حکومت کو قبل از وقت اطلاع مل گئی اور اس نے پورے دفاعی انتظامات کر دیے ۔ شبقدر میں فوج بھیج کر مہمندوں کی روک تھام بھی کر لی گئی اور بعض ملت فروش لوگوں نے حکومت کے ایماء سے شبقدر میں جلسہ کر کے مہمندوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے حملہ کرنے کی جرأت کی تو یہاں کے عوام ان کا مقابلہ کریں گے چنانچہ مہمند جو یہاں کے عوام کی ہمدردی کے طور پر یہ اقدام کر رہے تھے ۔ یہ صورت حال دیکھ کر انہوں نے عین وقت پر اپنا ارادہ بدل دیا اور یہ سارا پروگرام ناتمام رہ گیا ۔

شہر کے لوگوں نے حملہ آور آفریدیوں کو نہ صرف پناہ دی بلکہ ان کی ہر طرح مدد بھی کی اور انہیں کھانا پہنچاتے رہے اور میگزین مہیا کرتے رہے ۔ ہندوستانی فوجی سپاہیوں اور پولیس نے بھی بڑی حمیت کا ثبوت دیا اور حتی الوسع غازیوں کی امداد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔

۳۱ مئی ۱۹۳۰ء کا حادثہ

بازار کلاں پشاور کی فائرنگ

۲۳ را پریل کے حادثے کو زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ ۳۱ رمئی کو ایک اور افسوسناک حادثہ پیش آیا اس وقت تمام سرحد کے سیاسی رہنما جیلوں میں تھے شہر میں مارشل لا نافذ تھی اور ابھی حالات معمول پر نہیں آنے پائے تھے۔

کابلی تھانے کے سامنے ٹاؤن ہال میں (موجودہ دفتر روزنامہ شہباز) فوجی گوروں کا بہت بڑا سنٹر تھا ۳۱ رمئی کو صبح کے وقت سردار گنگا سنگھ ایک سرکاری ملازم اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ تانگے پر کابلی دروازہ سے گذر رہا تھا کہ ٹاؤن ہال کی چھت سے ایک گورے نے نشے کی حالت میں بلا وجہ ان پر گولی چلا دی۔ سردار جی کے دونوں بچے وہیں مر گئے بیوی کی چھاتی میں گولی لگی لیکن وہ بچ گئی۔

یہ وحشتناک خبر آگ کی طرح فوراً سارے شہر میں پھیل گئی لوگوں کے دل جو پہلے ہی زخمی تھے غم و غصے سے بھر گئے اور وہ قصہ خوانی میں جمع ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے اور ان دونوں بچوں کی ارتھی کا جلوس نکالا گیا۔ جو شہر کے بڑے بڑے بازاروں سے ہوتا ہوا گورکھٹڑی تک پہنچا، اس جلوس کی قیادت حکیم عبدالجلیل ندوی کر رہے تھے جو نجانے کس طرح گرفتاری سے بچ گئے تھے۔

یہ جلوس تحصیل کے پاس پہنچا وہاں بھی گورہ فوج متعین تھی لیکن حکیم عبدالجلیل کے کہنے پر وہ پیچھے ہٹ گئے اور تحصیل کا دروازہ بند کر دیا۔ اب جلوس نیچے

کوچہ سیٹھیاں کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ایک گورہ فوج کا مسلح دستہ گھنٹہ گھر کی طرف سے آرہا ہے حکیم صاحب نے آگے بڑھ کر ان کے افسر سے کہا کہ یہ جنازہ ہم لے جا رہے ہیں اور ہماری کسی سے کوئی غرض نہیں آپ خاموشی سے گزر جائیے لیکن اس بد دماغ انگریز افسر نے کوئی پرواہ نہ کی اور جلوس پہ فائرنگ کا حکم دیدیا۔ اس فائرنگ میں ۱۱ آدمی شہید اور بیس زخمی ہوئے ۔ فوج نے بہانہ بنایا کہ ان سے بندوقیں چھیننے کی کوشش کی گئی حالانکہ یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ گولی چلانے کا تہیہ کر کے آئے تھے اور یہ حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی کے تحت فائرنگ کی گئی ۔

اس واقعہ کے بعد شہر میں کئی دن ہڑتال رہی زخمیوں کی مرہم پٹی ڈاکٹر خان صاحب کرتے رہے اور تمام شہیدوں کو گنج دروازے کے باہر قبرستان میں دفنایا گیا ان مرنے والوں میں دو ہندو بھی تھے ۔ اس کے بعد باقی تمام کارکنوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا ۔

ٹکر فائرنگ

۲۳ اپریل کو پشاور کے سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری اور قصہ خوانی فائرنگ کے ساتھ ہی سرحد میں جلسے جلوس ممنوع قرار دے دیئے گئے۔ ۵ مئی کو گاندھی جی گرفتار ہوئے۔ ۶ مئی کو خادم محمد اکبر، محمد عباس خان، سالار رب نواز، میاں جعفر شاہ اور غلام محمد خان لوند خوڑ نے میٹنگ کرکے فیصلہ کیا کہ اس حکم کو توڑا جائے

چنانچہ ۱۱ مئی ۱۹۳۰ء کو سول نافرمانی کا آغاز کرتے ہوئے لوند خوڑ میں انہوں نے پہلا جلسہ کیا جلسے سے پہلے ہی غلام محمد لوند خوڑ کو گرفتار کرکے تین سال قید کا حکم سنا دیا گیا جلسہ نہایت اہتمام سے ہوا جس میں میاں جعفر شاہ نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر شرکت نہ کی اس جلسے کے بعد مردان اور پشاور میں پورے زور شور سے سول نافرمانی شروع ہوگئی۔

۲۰ مئی ۱۹۳۰ء کو موضع ٹکر ضلع مردان میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں کارکنوں کی گرفتاری عمل میں آئی اسی ہنگامہ میں مسٹر مرفی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس مردان قتل ہوگئے اس جرم میں فوج نے اس تمام علاقے پر شدید گولہ باری کی جس سے ۷۰ افراد ہلاک اور ۱۵۰ شدید زخمی ہوئے۔ حکومت نے صرف اسی پہ بس نہیں کیا بلکہ ملک معصوم خان، جرنیل شمروز خان اور غلام محمد خان لوند خوڑ کے حجرے جلا دیئے گئے اور ان کے مکان اور دوکانیں لوٹ لی گئیں۔

چارسدہ فائرنگ

۲۸ فروری ۱۹۳۱ء

۲۸ فروری ۱۹۳۱ء کو اتمان زئی میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ ہجوم پر پولیس نے شدید لاٹھی چارج کیا لیکن خدائی خدمتگاروں کو وہ منتشر نہ کر سکی۔ یہ خدائی خدمتگاروں کا پرامن اجتماع تھا وہ نہایت بے ضرر سا جلسہ کر رہے تھے کسی سے ٹکر لینا یا حکومت سے الجھنا نہیں چاہتے تھے لیکن حکام چاہتے تھے کہ ڈرا دھمکا کر کسی طرح خدائی خدمتگاروں کو بھگا دیا جائے اور جلسے کو ناکام بنایا جائے۔ چنانچہ جب پولیس کو لاٹھی چارج سے کامیابی نہ ہوئی تو فوجی دستے کو فائرنگ کا حکم دیا گیا لیکن یہ آگ برساتی ہوئی گولیاں بھی خدائی خدمت گاروں کے آہنی عزائم کا مقابلہ نہ کر سکیں رضا کار اپنی جگہوں سے ایک انچ بھی نہ ہلے نتیجے کے طور پر بہت سے لوگ شہید اور زخمی ہوئے۔ اس کے علاوہ ضلع بنوں میں سپین تنگی کے مقام پر جولائی ۱۹۳۰ء میں ڈیرہ اسماعیل خان ۱۹۳۰ء میں ہکر کوٹ اور موضع ترغ ضلع کوہاٹ ۲۴ دسمبر ۱۹۳۱ء میں گرگی چلی موضع ترغ میں سینکڑوں آدمی کام آئے وہاں ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء کو تمام خدائی خدمت گار رہنماؤں کو گرفتار کر کے قلعہ بالا حصار میں محبوس کر دیا گیا جس کے خلاف ۲۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ایک عظیم الشان احتجاجی جلوس نکالا گیا اور انگریز حکومت نے فائرنگ کر کے اسے منتشر کرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر کاکا خوش حال خان، غلام حیدر، غلام محمد پراچہ اور خیر محمد جلالی وغیرہ کی گرفتاری عمل میں آئی۔

ہری پور جیل میں سیاسی قیدیوں سے بدسلوکی

ہری پور جیل اُس وقت زیر تکمیل تھا اس کی تکمیل سیاسی قیدیوں پر کی گئی، قیدی بڑھ گئے تو انہیں پاؤں میں زنجیریں ڈال کر جانوروں کی طرح باہر باندھ دیا جاتا۔ قیدیوں کو روٹی صرف ایک وقت دی جاتی انہیں بیدزنی کی سزائیں دی گئیں اور وہ شرمناک مظالم توڑے گئے کہ جن کے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔

رضاکاروں کو معافیاں مانگنے پر مجبور کیا جاتا اور طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتیں۔ انہیں چکی کی سخت مشقت دی جاتی، ان کے رہنماؤں کو قید تنہائی میں رکھا جاتا جیل کے اندر ان پر لاٹھی چارج کیا جاتا اور انہیں ایک دوسرے سے بات تک کرنے کی اجازت نہ دی جاتی۔

سخت سردی میں صرف ایک ایک کمبل دیا جاتا جس کی وجہ سے سینکڑوں قیدی بیمار ہو گئے اور طبی امداد نہ ملنے کے باعث کتنے ہی رضاکار نمونیہ کا شکار ہو کر وفات پا گئے۔

قیدیوں پر بے بنیاد الزام لگا کر انہیں اخلاق سوز سزائیں دی جاتیں، سخت سردی میں ٹھنڈے پانی کے تالاب میں غوطے دیئے جاتے، ننگا کر کے ان کی پٹائی کی جاتی، ان پر راشن بند کر دیا جاتا، گھنٹوں اُلٹا لٹکایا جاتا، کولہو کے آگے باندھا جاتا، اور شدید گرمی میں پانی کے لیے ترسایا جاتا۔

ان پڑھ رضاکاروں کو دھوکا دے کر معافی ناموں پر ان کے انگوٹھے لگوا لیے جاتے اور انہیں جیل سے نکال کر ان کے نام مشتہر کیے جاتے کہ انہوں نے معافی مانگ لی ہے،

باچا خان گجرات جیل میں

باچا خان کو گجرات جیل میں پہنچ کر پہلی دفعہ کانگرس تحریک سے وابستگی پیدا ہوئی، ان دنوں گجرات جیل ہندوستان بھر میں سیاسی قیدیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی وہاں آپ سے پہلے تقریباً ایک سو کانگرس کے بڑے بڑے رہنما موجود تھے جن میں سے ڈاکٹر انصاری، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا ظفر علیخان، عطاء اللہ شاہ بخاری، ٹھنکر لال بھنگیر، پانڈت سنت رام (پہلی دفعہ گجرات جیل میں گیتا باچا خان نے سنت رام ہی سے پڑھی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات سے مل کر آپ کو کانگرس تحریک کے مطالعہ اور کانگرسی رہنماؤں کو قریب سے دیکھنے اور انہیں سمجھنے کا موقع ملا۔ آپ نے وہاں نیشلسٹ مسلمانوں سے بھی تبادلۂ خیالات کر کے اپنے شکوک و شبہات رفع کئے اور ہندو سکھ لیڈروں سے بھی تعلقات پیدا کر کے ان کے تہذیب و تمدن اور مذہب کا مطالعہ کیا چنانچہ آپ خود فرماتے ہیں۔

"میں نے گیتا سب سے پہلے یہیں پڑھی اس کے علاوہ گرنتھ صاحب اور انجیل بھی پڑھی میرا خیال ہے کہ ان کی دوستی کا کم از کم اتنا حق مجھ پر ضرور تھا ان کی مقدس کتابوں کے متعلق کوئی علم نہ ہو تو میں ان کے خیالات اور ان کے جذبات کو پوری طرح کیسے سمجھ سکتا ہوں اور ان کی دوستی کی کیسے قدر سکتا ہوں مجھے تسلیم ہے کہ اس وقت گیتا میری سمجھ سے باہر تھی میں نے اسے بار بار پڑھا شاید مجھ میں اتنی استعداد نہ تھی کہ میں اسے سمجھ سکتا مجھے بعد میں انڈومان کے پنڈت جگت رام نے باقاعدہ گیتا پڑھائی انہیں اس سے خاص شغف تھا اور انہیں نے مجھے اس کا صحیح مفہوم سمجھایا"

یہی نہیں بلکہ آپ نے رواداری کے تحت گوشت کھانا بھی ترک کر دیا یہاں

تک کہ آپ کے دانت خراب ہو گئے اور ڈاکٹروں نے گوشت کھانے پر مجبور کیا تو ہفتہ میں ایک دفعہ کھانے لگے لیکن وہ بھی چھپ چھپا کر تاکہ ہندو سکھ دوستوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔

یہاں آکر آپ کی زندگی میں بڑا انقلاب آیا آپ کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور اپنی تحریک کو ہمہ گیر بنانے میں مدد ملی۔ آپ نے مہاتما گاندھی کی زندگی کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا اور اس کا اتنا اثر ہوا کہ آپ ان کی پیروی میں ہفتے میں ایک دن روزے بھی رکھنے لگے بلکہ ایک دن "مرن برت" بھی رکھتے، مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفے پر بھی آپ انہی دنوں کاربند ہوئے اور اسے ایسا اپنایا کہ آج تک اس سے سرِمو انحراف نہیں کیا۔

چونکہ آپ شروع ہی سے روحانیت کی طرف مائل تھے اس لیے مہاتما گاندھی کی زندگی کے روحانی پہلو نے آپ کو یہاں تک متاثر کیا کہ قریب قریب آپ نے اپنی زندگی کو گاندھی جی کی زندگی کا مکمل نمونہ بنا دیا۔

یہی چیز تھی جس کے پیش نظر آپ کو "سرحدی گاندھی" کہا جانے لگا آپ کے معتقد محبت سے آپکو اس نام سے یاد کرتے تھے لیکن مخالف طنزاً آپ کے نام کے ساتھ یہ خطاب لکھتے بلکہ بعض متعصب اخبارات تو آپکے ہندو ہو جانے کے متعلق من گھڑت اور بے سروپا افسانے مشہور کرتے رہے لیکن آپ جذباتی انسان نہیں بلکہ بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک ہیں آپ نے مخالفین کے اعتراضات کی کبھی پروا نہیں کی اور ہمیشہ وہی کیا جو صحیح سمجھا آپ اصول کے پکے اور ہٹ کے مضبوط ہیں اور اپنے اصولوں سے انہیں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی کبھی نہیں

ہٹا سکی۔

گاندھی جی کی پیروی کے باوجود آپ ہمیشہ ایک سچے مسلمان کی طرح اسلام کے احکامات پر سختی سے کاربند رہے اور کبھی کوئی ایسی راہ اختیار نہیں کی جو اسلام کے اصولوں کے منافی ہو۔ جب آپ کے برت پر مخالفین نے اعتراض کیا تو آپ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا

"جب پچھلے اگست میں مہاتما جی نے سات دن کا برت رکھا تو میں نے بھی سات دن روزہ رکھا اور شام کو صرف نمک ملا ہوا پانی پیتا تھا۔ یہ کہنا تنگ نظری ہے کہ عام طور پر جس طرح مسلمان روزہ رکھتے ہیں وہی صحیح روزہ ہے ہمارے رسول اکرمؐ نے اکثر دن اور رات متواتر روزے رکھے تھے میرا خیال تو یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے محض انسانی کمزوریوں کا لحاظ کرکے غروب آفتاب کے بعد کھانے پینے کی اجازت دے دی آنحضرتؐ کو کسی غذا کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اُن کا قول تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں روحانی غذا بھیجتا ہے عام انسانوں کو یہ غذا نہیں مل سکتی کیونکہ انہیں اس ایمان کی کمی ہوتی ہے جو اس کے لیے ضروری ہے۔"

باچا خان کی رہائی اور کانگرس میں شمولیت

۱۰ مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی ارون پیکٹ کے تحت ملک کے تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے لیکن برطانوی حکومت نے باچا خان کو رہا کرنے سے انکار کر دیا گاندھی جی دوبارہ لارڈ ارون سے جا کر ملے اور کہا اگر باچا خان کو رہا نہ کیا گیا

تو ہمارے اس معاہدے کو منسوخ سمجھا جائے ہم دوبارا جیل جانے کو تیار ہیں"

وائسرائے ہند لارڈ اروِن نے گاندھی جی کو بتایا کہ سُرخ پوش تحریک بالشویک تحریک ہے کانگرس سے اس کا کوئی تعلق نہیں اس لیے اس معاہدے کی رُو سے باچاخان کو اس وقت تک رہا نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ کانگرس میں اپنی جماعت کو مدغم کرنے کا اعلان نہ کریں اور تمہاری طرح عدم تشدد پر عمل پیرا نہ ہوں"۔

گاندھی جی نے یہ شرط منظور کر لی اور جیل میں باچاخان سے گفت و شنید کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ یہاں اس امر کی وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ چونکہ انگریز خدائی خدمت گار تحریک سے بہت خائف تھے اور ان کی بڑھتی ہوئی تنظیم کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اس لیے انہوں نے اس تحریک کو کچلنے اس کا نام و نشان مٹانے اور باچاخان کو عمر بھر کے لیے قید و بند میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس موقع پر صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم نے نہایت قابل قدر پارٹ ادا کیا آپ انگریز دوست ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کے ہمدرد اور ملک کی آزادی کے خواہاں بھی تھے انگریز سرکار میں آپ کو بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا اور برطانوی حکومت انہیں اپنا خاص آدمی جانتے ہوئے ان پر بہت اعتماد کرتی تھی اس لیے ان سے انگریز حکومت کی پالیسی کا کوئی راز پوشیدہ نہ تھا۔ آپ کو جب انگریزوں کی اس نیت کا پتہ چلا کہ وہ صوبے کی اتنی بڑی اور مضبوط سیاسی تنظیم کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں تو اپنی قوم کی بربادی کے تصور سے آپ بے چین ہو گئے اور آپ نے کسی نہ کسی طرح خدائی خدمت گاروں کے رہنماؤں تک یہ بات پہنچا دی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنی تحریک کو فوراً ملک کی کسی سب سے مضبوط جماعت میں مدغم کر دو کیونکہ انگریزوں کی نیت

ابھی نہیں وہ بڑے خوفناک ارادے رکھتے ہیں اور اگر ایک دفعہ یہاں اتنی بڑی تنظیم کو ختم کر دیا گیا تو پشتون قوم کے ساتھ ساتھ ملک کی تحریک آزادی کو بھی بے پناہ نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

باچا خان ہر چند اس وقت کانگرس کی طرف کافی حد تک مائل ہو چکے تھے لیکن وہ اپنی جماعت کو کانگرس میں مدغم کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھے ان کے دل میں شروع ہی سے اسلامی درد تھا اور وہ کانگرس سے خوشگوار دوستانہ تعلقات رکھتے ہوئے مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کے زبردست حامی تھے۔

چنانچہ جب سب سے پہلے انہیں جیل میں صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم کا پیغام پہنچا اور آپ نے خدائی خدمت گاروں پر حکومت کے بے پناہ تشدد اور ظلم وستم کی داستانیں اپنے ساتھیوں کی زبانی سنیں تو آپ نے باہمی صلاح مشورہ سے خدائی خدمتگار جماعت کے سربرآوردہ رہنماؤں کا ایک وفد مقرر کر کے اسے ہدایت کی کہ وہ جاکر مسلم لیگی رہنماؤں سے بات چیت کریں اور ممکن ہو تو خدائی خدمت گار جماعت کا آل انڈیا مسلم لیگ سے الحاق کر دیں۔ اس سلسلہ میں باچا خان کے حالیہ عدالتی بیان سے اس مسئلے پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

> ۱۹۳۰ء میں میں نے اپنے آپ کو گجرات سپیشل جیل میں محبوس پایا۔ یہ جیل اس وقت پنجاب کے سیاسی قیدیوں کے جیل کی حیثیت رکھتی تھی یہاں ہمارے ایک یا دو پرانے ساتھی ہم سے ملنے آئے اور انہوں نے ان مظالم کی افسوسناک داستانیں بیان کیں جو انگریزی حکومت ہماری قوم پر توڑ رہی تھی ان کی باتیں سن کر ہمیں بہت صدمہ پہنچا اور آپس میں

صلاح مشورہ کے بعد ہم نے اپنے دوستوں کو ہدایت کی کہ وہ دہلی، لاہور اور شملہ جائیں اور مسلم لیگ اور دوسری مسلم تنظیموں کے لیڈروں سے ربط قائم کریں انہیں ہم اپنا مسلمان بھائی سمجھتے تھے اور انہیں بڑی اُمید تھی کہ وہ اس خوفناک صورت حال میں ہماری مدد کریں گے کچھ عرصہ بعد میرے دوست واپس آگئے اور انہوں نے بتایا کہ مسلم لیگ ہماری مدد کے لیے تیار نہیں کیونکہ ہماری جنگ انگریزوں کے خلاف ہے اور مسلمان لیڈر انگریز سے لڑائی بھڑائی کے حق میں نہیں ہیں:

انہی دنوں جب کہ آپ مسلم لیگ کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے تھے گاندھی جی کے ایما سے علی گل خان اور میاں جعفر شاہ باچا خان کو کانگرس میں شمولیت کی دعوت دینے گجرات جیل پہنچے اس وقت وہاں آپ کے ساتھ میاں احمد شاہ بیرسٹر اور آغا لال بادشاہ بھی موجود تھے باچا خان کو گاندھی جی کا کانگرس میں شمولیت اور عدم تشدد پر عمل درآمد کرنے کا پیغام ملا تو آپ حالات کی نزاکت کے پیش نظر ان دونوں باتوں کو منظور کرنے پر مجبور ہو گئے کیونکہ ان کے لیے اس وقت اور کوئی چارہ کار نہیں تھا باچا خان نے منظوری دے دی تو ان ہر دو نامہ بر حضرات نے گاندھی جی کو جاکر یہ مژدہ سنایا جسے سنتے ہی وہ بہت خوش ہوئے اور فوراً لارڈ ارون وائسرائے ہند کو اطلاع دی کہ باچا خان کانگرس میں شامل ہو گئے ہیں اس لیے اب انہیں فوراً رہا کر دیا جائے چنانچہ سنٹرل گورنمنٹ نے آپ کی رہائی کے احکامات صادر کر دیئے

باچا خان کا تاریخی جلوس
۱۹۳۱ء

باچا خان رہا ہو کر گجرات سے موٹر میں لاہور گئے اور وہاں سے پشاور آئے جہاں آپ کا ایک ایسا عظیم الشان جلوس نکالا گیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

صوبہ سرحد کی تاریخ میں مولانا محمد علی مرحوم کے تاریخی جلوس ۱۹۲۷ء کے بعد یہ دوسرا یادگار جلوس تھا اٹک سے لے کر پشاور تک تمام راستے کو نہایت اہتمام سے سجایا گیا تھا اور پشاور شہر تو دلہن کی طرح آراستہ و پیراستہ تھا۔ صوبہ سرحد کے طول و عرض سے ہزاروں لوگ آپ کے استقبال کے لیے لاہور پہنچے اور جب آپ پشاور شہر میں داخل ہوئے تو بلاشبہ لاکھوں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر آپ کے ہمراہ تھا آپ سر سے ننگے کھدر کی قمیص پہنے ہوئے تھے راستہ میں جگہ جگہ آپ پر پھولوں کی بارش کی گئی اور اس قدر ہار پہنائے گئے کہ آپ کا موٹر پھولوں کے ہاروں سے لد گیا شہر میں سینکڑوں خوبصورت دروازے بنائے گئے تھے اور لوگوں کا ہجوم آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ٹوٹا پڑتا تھا۔ عوام کی عقیدت دیکھنے کے قابل تھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس دن صوبہ سرحد کے سب دیہاتوں اور شہروں سے تمام مرد و زن اور بوڑھے بچے امنڈ کر اس جلوس میں جمع ہو گئے ہیں باچا خان زندہ باد، انقلاب زندہ باد اور اسلام آزاد کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج رہی تھی اور آپ پوری عظمت کے ساتھ مسکرا کر دونوں ہاتھوں سے لوگوں کے سلاموں کا جواب دے رہے تھے۔

رہا ہونے کے بعد اسی سال ۱۹۳۱ء میں آپ نے آل انڈیا کانگرس کے اجلاس منعقدہ کراچی میں شرکت کی اور وہاں ملک کے نہایت اہم مسائل پر کانگرس

رہنماؤں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ اسی سال کے آخر میں مہاتما گاندھی کے صاحبزادے دیوداس گاندھی سرحد وارد ہوئے اور آپ کے گاؤں میں آپ کے پاس مہمان ٹھہرے ۔ وہ سوات اور آزاد قبائلی علاقہ دیکھنا چاہتے تھے لیکن آپ کو حکومت نے اجازت نہ دی کہ اپنے مہمان کو یہ علاقے دکھلائیں ۔

دیوی داس گاندھی کا سرحد میں عظیم الشان استقبال کیا گیا اور سرحد کے دورے میں جہاں جہاں بھی وہ گئے تحریک کا زور اور لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر حیران رہ گئے

باچا خان اور دیگر کانگرس رہنماؤں میں اختلاف

کانگرس میں خدائی خدمت گار تحریک کو مدغم کرنے سے صوبہ سرحد کی سیاسیات میں ایک انقلاب رونما ہوا جو یہاں کے سیاسی رہنماؤں میں گوناگوں اختلافات کا باعث بنا ایک طرف خدائی خدمت گار تحریک سے بہت سے مخلص کارکن کٹ کر علیحدہ ہوگئے تو دوسری طرف کانگرس کمیٹی سے شہری کارکنوں کا حلقہ بالکل الگ ہو گیا یہ دھڑے بندی انگریز حکمرانوں کے لیے مفید تھی اور ان کی نہایت گہری چال کا نتیجہ تھی انہوں نے اسے خوب ہوا دی اور دانستہ طور پر بعض جذباتی لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنا کر استعمال کرنے کی کوشش کرتے رہے ۔

سب سے پہلے ۱۹ اگست ۱۹۳۱ء کو باچا خان نے جب کانگرس اور خدمتگار جماعت کا یہ باہمی معاہدہ افغان جرگہ میں توثیق کے لیے پیش کیا تو غلام محمد لوند خوڑ نے ترمیم پیش کی کہ افغان جرگہ کو کانگرس میں کلی طور پر ادغام نہیں ہونا چاہیے بلکہ افغان جرگہ کی حیثیت قائم رکھتے ہوئے بھی کانگرس سے اپنی جماعت کا الحاق کرنا چاہیے کیونکہ افغان جرگہ کے پروگرام میں مذہبی رسوم کی اصلاح اور معاشرتی خرابیوں کا انسداد

شامل ہے اور کانگرس ایک نیشنل جماعت ہے اس لیے اس میں رہ کر ہمارے لیے اپنا یہ پروگرام چلانا دشوار ہو گا۔

غلام محمد لوند خوڑ کی اس ترمیم کی تائید میاں احمد شاہ جنرل سکریٹری افغان جرگہ، عبدالاکبر خان خادم صدر افغان جرگہ اور یمین جان خان مرحوم نے کی۔ اس پر ایک ہنگامہ خیز بحث ہوئی دوسری طرف باچا خان، ڈاکٹر خان صاحب اور قاضی عطاء اللہ مرحوم تھے۔ آخر میاں احمد شاہ نے کہا جب تک سالانہ جرگہ میں یہ تجویز پاس نہ ہو اس وقت تک اس پر عمل درآمد نہ کیا جائے باچا خان خود اپنی جماعت کی علیحدہ حیثیت قائم رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ گاندھی جی سے وعدہ کر چکے تھے اس لیے مجبور تھے دوسرا حالات و واقعات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اس وقت ایک ہوشیار جرنیل کی طرح وہ اپنا مورچہ بدل ڈالیں اور دشمن کو بالادستی کا موقع نہ دیں نیز وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کانگرس میں مدغم ہونے کے باوجود ان کی جماعت کی انفرادی حیثیت برقرار رہے گی کیونکہ اپنی جماعت پر ان کا پورا اثر و نفوذ تھا اور اس چیز کو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا لیکن فریق مخالف یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا چنانچہ جماعت میں دھڑے بندی پیدا ہو گئی اور میاں احمد شاہ بیرسٹر کی قیادت میں بائیں بازو نے باچا خان پارٹی سے الگ ہو کر افغان جرگہ کے نام سے ہی کام جاری رکھا اور کانگرس سے تعلق رکھنے کے باوجود اس میں ادغام پسند نہ کیا۔

دوسرا باچا خان کانگرس کو اپنانے کے بعد اس کا مرکز اپنے گاؤں اتمان زئی میں قائم کرنا چاہتے تھے ادھر پشاور شہر کے پرانے کانگرسی رہنما اس بات کے سخت مخالف تھے وہ ہر حالت میں اپنا اقتدار برقرار رکھنے پر مصر تھے اور پراونشل کانگرس کا مرکز پشاور جیسے مرکزی شہر میں ہی رکھنا چاہتے تھے۔

رفتہ رفتہ اس تنازعہ نے بہت طول کھینچا اور بعض خود غرض لوگوں نے اسے شہری اور دیہاتی رنگ دے کر نہایت افسوسناک حالات پیدا کر دیئے اور معاملہ آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی تک جا پہنچا مرکز کی طرف سے جمعیت سنگھ کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا گیا جس نے یہاں آ کر تمام کانگرسی کارکنوں کے بیانات قلمبند کرنے کے بعد ایک رپورٹ تیار کی جو مرکز کو پیش کر دی گئی۔ چنانچہ انہی دنوں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں سرحد پراونشل کانگرس کمیٹی کی دونوں پارٹیوں کے نمائندوں کو بمبئی بلایا گیا جس میں ایک فریق کیطرف سے باچا خان، میاں احمد شاہ بیرسٹر، امیر محمد خاں اور دوسرے فریق کیطرف سے آغا لعل بادشاہ، پیر بخش خان وکیل، حکیم عبدالجلیل اور نکودیوی نے شمولیت کی۔ یہ مقدمہ سننے کیلئے گاندھی جی، ڈاکٹر انصاری اور مہادیو ڈیسائی پر مشتمل ایک ٹربیونل مقرر کیا گیا تھا جس نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد آخر نکودیوی کے مشورے سے سرحد میں کانگرس کی باگ ڈور باچا خان کے ہاتھ میں سونپ دی۔

آل انڈیا کانگرس کے اس فیصلے سے پشاور شہر کے پرانے کانگرسی رہنما بہت ناراض ہوئے اور بمبئی سے واپس آتے ہی انہوں نے کانگرس سے اپنا تعلق توڑ دیا۔ اور باچا خان سرحدی جرگہ کے نام سے کانگرس کے لیے کام کرنے لگے کانگرس کا مرکز اتمان زئی میں قائم کیا گیا اور تمام صوبے میں اس کی شاخیں قائم کر کے اسے ایک مضبوط تنظیم بنا دیا گیا لطف یہ کہ اس کے باوجود باچا خان اور اس کی جماعت کے تمام کارکن سرخ پوش ہی کہلاتے رہے اور کانگرس میں شامل ہونے کے بعد بھی ان کا نام نہ بدل سکا۔

تیسری بار گرفتاری

سنہ ۱۹۳۱ء کے آخر میں ہندوستان میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا پروپیگنڈا شروع ہوا جو برطانوی حکومت کی طرف سے لندن میں منعقد کی جا رہی تھی اور جس میں صوبہ سرحد کو مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات

دینے کی پیش کش کی گئی تھی۔ کانگرس نے جماعتی طور پر اس کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے اور اس کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا اور اعلان کیا کہ ہم مکمل آزادی سے کم کوئی چیز بھی لینے کو تیار نہیں۔

باچا خان نے بھی کانگرس کے پروگرام کے مطابق اس کانفرنس کی مخالفت میں دورے کرنے اور پروپیگنڈا کرنا شروع کیا انہی دنوں حکومت نے باچا خان اور ان کے ساتھیوں کو جن میں ارباب عبدالغفور خان، ڈاکٹر خان صاحب اور غلام محمد خان لوند خوڑ بھی شامل تھے پھر گرفتار کر لیا اور سرحد میں سُرخ پوش کانگرس اور اس کی تمام شاخوں کو غیر قانونی جماعتیں قرار دے دیا۔ ان گرفتاریوں کے بعد سرحد میں باقاعدہ تحریک شروع ہو گئی اور تھوڑے ہی دنوں میں تقریباً دس پندرہ ہزار رضا کار گرفتار ہو کر جیلوں میں چلے گئے۔

ان کی گرفتاریوں کے بعد ۱۹۳۲ میں لندن راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہوئی جس میں مولانا محمد علی نے بھی شرکت کی اور سرحد کی نمائندگی کے لیے صاحبزادہ عبدالقیوم کو سرکاری طور پر منتخب کیا گیا اس کانفرنس میں صوبہ سرحد کو مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات دینے کا فیصلہ کیا گیا سرحد میں کانگرس اور سُرخ پوش جماعتوں نے ان اصلاحات کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ اور سول نافرمانی کرتے ہوئے دھڑا دھڑا جیل جاتے رہے حکومت نے ان پر بے پناہ تشدد کیا لیکن وہ مکمل طور پر عدم تشدد پر کاربند رہے چنانچہ صاحبزادے عبدالقیوم خان مرحوم کو صوبہ سرحد میں سب سے پہلا سرکاری وزیراعلیٰ نامزد کیا گیا۔

جیلوں میں سیاسی قیدیوں سے حکومت کا سلوک نہایت وحشیانہ تھا دسمبر جنوری کی کڑاکے کی سردی میں قیدیوں کو صرف ایک ایک کمبل دیا جاتا روٹی ایک وقت ملتی چنے اور دال بند کر دی گئی بیدزنی کی سزائیں بات بات پر دی جاتیں لوگ آئے دن بھوک

اور سردی سے مر رہے تھے علاج معالجے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

۲۹ جنوری ۱۹۳۲ء کو شدید بارش ہو رہی تھی کہ گورا فوج کی دو کمپنیاں آئیں اور جیل کا محاصرہ کر لیا اور تمام اہم ناکوں پر مشین گنیں نصب کر دیں پھر جیل کے تمام ملازمین اور کرنل بریڈے جنرل انسپکٹر جیل میں داخل ہوئے اور بلا وجہ تمام سیاسی قیدیوں کو پیٹنا شروع کر دیا پورے دو گھنٹوں تک یہ ظالمانہ مارپیٹ جاری رہی پھر دو سو سرکردہ سیاسی قیدیوں کو چکیوں میں بند کر دیا ان میں ڈاکٹر خان صاحب، غلام محمد خان لوند خوڑ، عبید اللہ خان سالار، رب نواز خان، سالار مرتضےٰ خان، ارباب عبد الغفور خان صدر، سرفراز خان، پیر شہنشاہ صدر پراونشل کانگرس وغیرہ شامل تھے چنانچہ پہلے دن امیر محمد خان جرنیل پڑانگ، پیر بادشاہ اتمان زئی اور غلام محمد لوند خوڑ وغیرہ چھ اشخاص کو تیس تیس بید کی سزا دی گئی یہ لوگ تین ماہ تک زخموں کی وجہ سے صاحب فراش رہے۔

ڈاکٹر خان صاحب اس تحریک میں پہلی دفعہ جیل گئے وہ عملی طور پر اب بھی سیاست میں کوئی خاص حصہ نہیں لے رہے تھے بلکہ محض باچا خان کا بھائی ہونے کی وجہ سے انہیں جیل جانا پڑا اور اس دفعہ باچا خان کا تقریباً تمام خاندان گرفتار کیا گیا باچا خان کے دونوں لڑکے اور ڈاکٹر خان صاحب کے لڑکے اور دوسرے تمام قریبی رشتہ داروں کو قید کی صعوبت جھیلنا پڑی۔

باچا خان کی رہائی نظر بندی اور گرفتاری

۱۹۳۴ء میں اپنی میعاد اسیری گذارنے کے بعد تمام سیاسی [illegible] رہا ہو کر آ گئے لیکن باچا خان اور ڈاکٹر خان صاحب کا پنجاب میں داخلہ ممنوع [illegible] دیا گیا جس کی خلاف ورزی وہ جماعتی فیصلے کے مطابق کرنے سے معذور تھے

چنانچہ یہ دونوں بھائی سیٹھ جمنا لال بجاج کی دعوت پر واردھا چلے گئے جہاں مہاتما گاندھی پہلے ہی سے ان کے مہمان کی حیثیت سے موجود تھے۔

یہاں باچا خان کی گاندھی جی کی صحبت میں رہنے اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی، اِدھر گاندھی جی بھی مدت سے باچا خان کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ کچھ دن گزارنے کے آرزومند تھے چنانچہ یوں کہنا چاہیے کہ آزادیٔ ہند کے ان دونوں رہنماؤں کے آپس میں مل بیٹھنے کی آرزو ایک اعتبار سے انگریز حکمرانوں نے باچا خان کی نظربندی کے احکام صادر کرکے خود ہی پوری کردی۔ اس کا اظہار گاندھی جی نے مہادیو ڈیسائی کی کتاب "دو خدائی خدمت گار" کے تعارف میں یوں کیا ہے۔

"میرا بہت جی چاہتا تھا کہ کچھ دن خان عبدالغفار خان کے ساتھ رہوں مگر کبھی اس کا موقع نہیں ملتا تھا پچھلے سال کے آخری مہینوں میں یہ آرزو پوری ہوئی، میری خوش قسمتی سے صرف خان صاحب ہی نہیں بلکہ اُن کے بڑے بھائی ڈاکٹر خانصاحب بھی ہزاری باغ جیل سے رہا ہوتے ہی میرے پاس چلے آئے بات یہ تھی کہ ان دونوں کو ۲۷ دسمبر ۱۹۳۴ء تک صوبہ سرحد میں داخل ہونے کی ممانعت ہوگئی تھی اور اس کی خلاف ورزی وہ کانگرس کے فیصلہ کی وجہ سے نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے جمنا لال بجاج کی دعوت قبول کرلی اور واردھا آگئے اس طرح مجھے ان سے کھُل کر ملنے کا موقع نصیب ہوا، جوں جوں اُن سے واقفیت بڑھتی گئی میرا دل ان کی طرف کھنچتا گیا ان کے خلوص اور صاف گوئی اور اُن کی انتہائی سادگی کا مجھ پر بہت

اثر ہوا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ انہوں نے سچائی اور عدم تشدّد کو مصلحت کی بنا پر نہیں بلکہ عقیدے کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ چھوٹے بھائی کو میں نے مذہبی جوش سے بھرا ہوا پایا مگر وہ تنگ نظر نہیں ہیں بلکہ صلح کل مسلک رکھتے ہیں ان کی سیاست اگر کچھ ہے تو وہ مذہب پر مبنی ہے اور ڈاکٹر خانصاحب کو تو سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں شـ

وار دھا میں گاندھی جی اور بادشاہ خان کی صحبتیں کس نوعیت کی تھیں اس کے متعلق مہادیو ڈیسائی لکھتے ہیں۔

"واردھا کے اس چند روزہ قیام سے ان دونوں بھائیوں اور گاندھی جی اور جمنا لال بجاج میں ایک خاص اخوت اور روحانی تعلق پیدا ہو گیا ان میں کوئی سیاسی گفتگو نہ ہوتی تھی البتہ روحانی صحبتیں اکثر رہا کرتی تھیں جن میں وہ خاموشی سے بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے یہاں کے سب رہنے والے اس سے بہت متاثر ہوئے خان عبد الغفار خان روز صبح آشرم میں جاتے اور گاندھی جی سے تلسی داس کی رامائن سنا کرتے تھے اس کے علاوہ وہ اکثر صبح و شام کی پرارتھنا میں بھی شریک ہوتے اور کہتے یہ نغمہ میری روح کو معمور کر دیتا ہے۔"

ایک مرتبہ انہوں نے پیارے لال جی سے کہا "مہربانی فرما کر اسے اردو میں لکھ دیجئے اور اس کا اردو ترجمہ بھی کر دیجئے۔"

ایک جگہ ڈاکٹر خانصاحب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"بڑے بھائی نے پورے گیارہ سال انگلستان میں گزارے اور وہاں بہترین تعلیم حاصل کی لیکن اکثر اپنی گفتگو کے دوران میں بار بار وہ ذہنی

پہاڑیوں اسی ندی اور اسی چھوٹے سے جزیرہ کا ذکر کرتے جہاں انہوں نے اپنا ایک عزلت خانہ بنا رکھا ہے، اور جہاں مہاتما جی کو کبھی اپنا مہمان بنانے کی انہیں بڑی آرزو ہے وہ مہاتما جی سے کہا کرتے "وہاں آپ کا آشرم ہوگا ہمارے نزدیک اس سے زیادہ پُرسکون اور خوشگوار مقام نہیں مل سکتا پشاور کی ساری وادی میں پھلوں کی افراط ہے اور یقین کیجئے وہاں آپ کا وزن بڑھ جائے گا"

وہ اکثر اپنے گنے کے کھیتوں کا تذکرہ کیا کرتے گایوں کے اس خالص دودھ کا جس سے وہ صرف مکھن نکالا کرتے اور بھینس کے اس گاڑھے دودھ کا جسے وہ اور کاموں میں لاتے تھے۔

باچا خان نے ہزاری باغ جیل سے نکلتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو گاندھی جی کے سپرد کر دیں گے اور جو کچھ وہ کہیں گے وہی کریں گے۔ باچا خان وہاں بھی آرام سے نہ بیٹھے اور بنگال اور صوبہ جات متحدہ کے دورے کرتے رہے، لیکن یہ سب کچھ گاندھی جی کے مشورہ سے بلکہ اُن کے بتائے ہوئے پروگرام کے تحت ہی کیا گیا ہے وہ جہاں بھی گئے گاندھی جی سے اجازت لے کر گئے بلکہ یہ بھی پوچھ کر گئے انہیں وہاں جا کر کیا کہنا چاہیے۔

انہی دنوں حکومت نے اسمبلی کے انتخابات کا اعلان کیا اتمان زئی میں اس مسئلے کے متعلق ایک غیر رسمی میٹنگ طلب کی گئی کیونکہ سرحد کو پہلے پہل سنٹرل اسمبلی میں نمائندگی مل رہی تھی۔ اس میٹنگ میں غلام محمد خان لوند خوڑ، اسعد اللہ خان اور صدر سرفراز خان پر مشتمل ایک وفد مقرر ہوا جو وارد ھا جا کر خان برادران سے مشورہ کرنے کے بعد

ڈاکٹر خان کو اسمبلی میں کھڑا ہونے پر آمادہ کرے۔

یہ وفد وارد ھا پہنچا تو باچا خان نے گاندھی جی سے مشورہ کے بعد منظوری دے دی وفد کے اراکین مصر تھے کہ ڈاکٹر خانصاحب حکومت سے اجازت لے کر انتخاب لڑنے کے لیے خود سرحد جائیں اور باچا خان بھی ان کا ہمنوا تھا لیکن گاندھی جی نے صلاح نہ دی اس لیے یہ ارادہ ترک کردیا گیا۔

ڈاکٹر خانصاحب غائبانہ طور پر الیکشن لڑ کر سنٹرل اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔

۱۹۳۵ء میں ہندوستان کو صوبجاتی آزادی مل گئی تو ڈاکٹر خانصاحب اور باچا خان پر سے اپنے صوبے میں داخل نہ ہونے کی پابندی بھی اٹھالی گئی۔ ڈاکٹر خانصاحب تو پابندی اُٹھنے کے بعد اپنے وطن آ گئے لیکن باچا خان اس پابندی اُٹھنے سے چند دن پہلے ہی آل انڈیا سودیشی نمائش بمبئی کی رسم افتتاح میں ایک باغیانہ تقریر کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے۔

آپ نے تین مہینے اور دس دن نظر بندی کے ایام گذارے اور پھر گرفتار ہو کر بمبئی پہنچے جہاں آپ کو مزید تین برس قید کا حکم سنایا گیا چنانچہ یہ پوری قید کاٹنے کے بعد اگست ۱۹۳۷ء میں پورے ساڑھے چھ برس کے بعد آپ کو اپنے وطن عزیز صوبہ سرحد کی سرزمین پر قدم رکھنا نصیب ہوا۔

اس گرفتاری کے وقت آپ نے اہل سرحد کے لیے یہ پیغام چھوڑا:

"میری گرفتاری سے مشتعل ہو کر پٹھانوں کو کوئی مذموم حرکت نہ کرنا چاہیے بلکہ بڑے سکون کے ساتھ یہ خبر سننا چاہیے اور بیٹھ کر اپنے اندرونی اختلافات مٹانے کی ٹھنڈے دل سے کوشش کرنا چاہیے

مجھے افسوس ہے کہ ہم پر طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں اور ہمیں اس کا موقع نہیں دیا جاتا کہ ہم ان کی تردید کر سکیں ایک سرکاری اعلان میں میرے صوبہ کو وحشی صوبہ کا لقب دیا گیا ہے لیکن حکومت کو یہ کہنا زیب نہیں دیتا کیونکہ اس نے سیدھے سادے جاہل پٹھانوں میں تعلیمی اور معاشرتی اصلاح جیسے غیر سیاسی کام کا بھی کون سا موقع دیا"

اور آخر میں اپنے میزبانوں سے رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"مجھے بالکل یقین ہے کہ یہ سب خدا کی مرضی کے ماتحت ہو رہا ہے جب تک اس نے مجھ سے باہر کام لینا چاہا باہر رکھا اب اس کی مرضی ہے کہ میں جیل کے اندر سے خدمت کروں تو جیل جا رہا ہوں جس میں وہ خوش ہے اس میں میں بھی خوش ہوں۔"

ہزاری باغ سے رہائی کے بعد سے لے کر دوبارہ گرفتاری تک ایام نظر بندی کے حالات آپ نے خود رسالہ پختون میں اپنے قلم سے لکھے ہیں ترجمہ درج ذیل ہے۔

"جب ۱۹۳۴ء میں مجھے اور میرے بڑے بھائی ڈاکٹر خانصاحب کو ہزاری باغ جیل سے رہا کیا گیا تو بظاہر ہم جیل سے رہا کر دیئے گئے تھے لیکن یہ ایک عجیب رہائی تھی ہمیں نہ تو اپنے صوبے اور نہ پنجاب میں داخل ہونے کی اجازت تھی ہماری رہائی کے متعلق ہندوستان کے طول و عرض سے مبارک باد کے خطوط موصول ہونے شروع ہوئے ابھی ہم ہزاری باغ سے روانہ ہونے نہ پائے تھے کہ سیٹھ جمنا لال بجاج کا تار ملا جس میں انہوں نے ہماری رہائی پر خوشی کا اظہار فرمایا تھا اور یہ بھی تحریر کیا تھا کہ چونکہ آپ اپنے وطن نہیں جا سکتے اس

لیے واردھا آنے کی دعوت دی جاتی ہے اور یہاں ہی سکونت اختیار کریں
مہاتما گاندھی بھی واردھا میں تھے اور اس کے علاوہ ہندوستان میں کسی
ہندو اور مسلمان کی طرف سے ہمیں کوئی دعوت نہیں ملی تھی اس لیے ہم نے واردھا
جانے کا ارادہ کر لیا۔

ہزاری باغ سے شانتی نکیتن نزدیک تھا وہاں میرا لڑکا عبدالغنی پڑھتا تھا اس
لیے میں نے پسند کیا کہ پہلے شانتی نکیتن جاکر اپنے لڑکے سے ملاقات کروں لیکن
ابھی ہم تیار ہی ہو رہے تھے کہ پروفیسر عبدالباری تشریف لائے اور مجبور کیا کہ
پہلے پٹنہ جاؤں اور اس کے بعد عبدالغنی سے ملنے شانتی نکیتن غرض ہم پٹنے
پہنچے ریلوے سٹیشن پر ہمارے جیل کے ساتھی بابو راجندر پرشاد اور دیگر اصحاب
استقبال کے لیے موجود تھے رات کو ایک عظیم الشان جلسہ ہوا صبح کو ہم گیا نہ چلے
گئے وہاں غریبوں کے ایک جلسے میں شامل ہوا اس کے بعد شانتی نکیتن گئے
یہاں شاعر ٹیگور اور اس کے کالج کے پروفیسروں سے بات چیت کی کالج اور
کالج کے طلبا کو دیکھا، رات عبدالغنی کے پاس گذاری صبح کو عازم پٹنہ ہوئے وہاں
سے الہ آباد اور الہ آباد سے واردھا پہنچے۔ گاندھی جی سے ملاقات ہوئی۔
تھوڑے دنوں کے بعد آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں مولانا
ابوالکلام آزاد نے مجھ سے ارشاد کیا کہ مسلمانان بنگال عموماً اور کلکتہ کے پشاوری
دوکاندار بالخصوص آپ کی آمد کی آرزو رکھتے ہیں میں نے منظور کر لیا لیکن گاندھی
جی کو منظور نہ تھا ان کا خیال تھا کہ حکومت پھر مجھے گرفتار کر لے گی لیکن مولانا
کے اصرار پر راضی ہو گئے اور بنگال جانے کی اجازت دے دی ہم عازم

کلکتہ ہوئے ایک بہت بڑا مجمع ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا نہایت احترام سے ہمیں کلکتہ لے جایا گیا جہاں کلکتہ کارپوریشن نے ہمیں ایڈریس پیش کیا چند روز کلکتے میں اپنے پٹھان بھائیوں کے مہمان رہے۔

میری خواہش تھی کہ میں بنگال کے مسلمانوں کو دیکھوں میں نے چند جلسوں میں اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا مگر کلکتہ کے مسلمان اس سلسلہ میں میری امداد کے لیے تیار نظر نہ آئے میرا ارادہ مضبوط تھا آخر ایک بنگالی مسٹر میر ویجل چند گھوش جو کانگریس کے ایک سرگرم رکن تھے میری امداد کے لیے تیار ہوئے میں کلکتہ سے اپنے دوستوں کے ہمراہ ایک علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ ڈاکٹر خان صاحب برائے تکمیل کاغذات الیکشن کلکتہ میں رہے میں نے اس علاقے کا حال دیکھا اگرچہ تمام باشندوں کے حالات اچھے نہ تھے مگر مسلمانوں کی حالت خاص طور سے بری تھی چند روز ہم نے اس علاقے میں گذارے بمبئی جلد واپس جانا تھا اس لیے بنگال کا دورہ ختم کیا۔ کلکتہ سے واردھا آیا اور واردھا سے بمبئی ...... مسلمانانِ بنگال کی قابلِ رحم حالت نے میرے دل اور دماغ پر کافی اثر کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ان کی خدمت کروں گا اور اس سلسلے میں گاندھی جی سے بھی مشورہ کیا انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا اور امداد کا بھی وعدہ فرمایا۔

ان دنوں میری تمام توجہ بنگال کے غریب لوگوں کی طرف تھی جن کے کچھ حالات میں نے بچشم خود دیکھے تھے میں نے ارادہ کیا کہ ۸ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو بنگال پہنچوں حکومت کی طرف سے ہماری نقل و حرکت پر کڑی نگرانی کی جا رہی تھی وہ ہماری

سرگرمیوں کو برداشت نہ کر سکتی تھی بنگال کے ہندوؤں کی بیداری کی وجہ سے حکومت کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ جب حکومت کو یقین ہوا کہ میں بنگال جانے والا ہوں اور کسی صورت سے بھی نہیں رُک سکتا تو ۸ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو مجھے واردھا میں گرفتار کر لیا اور بذریعہ ریل بمبئی پہنچایا بغاوت کے الزام میں میرے خلاف مقدمہ چلایا گیا ۔ میری بغاوت یہ تھی کہ دل میں مظلومان بنگال سے ہمدردی رکھتا تھا اور ان کے لیے میرے سینہ میں محبت اور خدمت کا جذبہ تھا ۔"

باچا خان کا دوسرا تاریخی جلوس
۱۹۳۷ء

باچا خان ۱۹۳۷ء میں اپنی تقریباً سات سالہ قید اور نظر بندی کے بعد اپنے وطن مالوف لوٹے تو یہاں آپ کا عظیم الشان استقبال کیا گیا ۔ اٹک سے لے کر پشاور تک جگہ جگہ خوبصورت دروازے بنائے گئے اور دو رویہ رضاکاروں کے دستے آپ کو سلامی دینے کے لیے ایستادہ کئے گئے ۔ بیسیوں سپاسنامے پیش کئے گئے جن میں آپ کو خراج تحسین ادا کیا گیا ۔

یہ عظیم الشان جلوس جب پشاور شہر میں داخل ہوا تو یہاں لاکھوں انسانوں نے آپ کو خوش آمدید کہی ہر طرف سے پھولوں کی بارش ہو رہی تھی اور اپنے محبوب رہنما کو دیکھ دیکھ کر لوگ نہال ہو رہے تھے ۔ صوبہ سرحد کے تمام دیہات سے لوگ اُمڈ پڑے تھے جلوس ایک میل لمبا تھا اور اس میں موٹریں سائیکل اونٹ اور ریڑھوں کی قطاریں تھیں پشاور شہر کی آرائش قابل دید تھی قدم قدم پر شاندار دروازے بنے ہوئے تھے دوکانیں اور مکان آراستہ و پیراستہ تھے اور حد نظر تک انسانوں کا بے پناہ ہجوم نظر آتا تھا ۔

صوبہ سرحد میں کانگرس کی پہلی وزارت

وسط اگست ۱۹۳۶ء میں بمبئی سے تین برس قید گزار کر آپ رہا ہوتے ہی سیدھا وادھا پہنچے چونکہ ابھی آپ کو سرحد میں اپنے داخلے کے متعلق پابندی ہٹائے جانے کی حکومت کی طرف سے کوئی اطمینان بخش اطلاع نہیں ملی تھی اس لیے آپ پہلے سرحد جانے کی بجائے گاندھی جی کے مشورے سے اہالیان کراچی کی دعوت منظور کرتے ہوئے کراچی روانہ ہوئے کراچی جاتے ہوئے آپ جب لاہور سٹیشن پر پہنچے تو اہل لاہور نے سٹیشن پر آپ کا نہایت شاندار استقبال کیا اور پریس کے نمائندوں نے آپ کو گھیر کر آپ پر سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی ۔

کیا یہ درست ہے کہ سرحد اسمبلی کے ۲۵ ممبروں نے گورنر سرحد کو صاحبزادہ عبدالقیوم کی منسٹری کے خلاف عدم اعتماد کی چٹھی لکھی ہے ؟

آپ سرحد کے زیادہ نزدیک ہیں میں مدت سے کوسوں دور بیٹھا ہوں لیکن اس کے باوجود آپ نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے حالانکہ سرحد کے حالات سے آپ لوگوں کو زیادہ واقفیت ہونی چاہیے بہرحال میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے چند معززین سرحد سے ملاقات کی ہے اور انہوں نے اس خبر کی تصدیق کی ہے ۔

اگر وہاں آپ کی پارٹی یعنی خدائی خدمت گاروں کی اکثریت ہو جائے تو آپ اُسے کانگرس کی وزارت بنانے کی اجازت دیں گے ؟

جہاں تک کولیشن وزارت کا تعلق ہے اس کا فیصلہ ورکنگ کمیٹی کرے گی ہم ورکنگ کمیٹی کے روبرو صرف تجویز پیش کر سکتے ہیں۔

آپ کس قسم کی وزارت قائم کریں گے؟

میں چاہتا ہوں کہ موجودہ کساد بازاری اور غربت کے پیش نظر ایک ایسی وزارت قائم کی جائے جو بالکل سادہ اور فقیرانہ ہو اور عوام کی فلاح و بہبود کا خیال رکھے۔

آپ سرحد کب جا رہے ہیں؟

جب مجھ سے پابندی ہٹا لی گئی تو میں فوراً سرحد چلا جاؤں گا اور اپنے دوستوں سے ملوں گا۔

کیا آپ مہاتما گاندھی کو بھی ہمراہ لے جائیں گے؟

ہاں اگر اجازت مل گئی تو ......

کیا آپ پنجاب کے مسلمانوں کے لیے کوئی پیغام دیں گے؟

میں اس وقت کوئی پیغام دینا نہیں چاہتا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مسلمان بھاری تعداد میں جنگ آزادی کی غرض سے کانگرس میں شامل ہوں کیونکہ ملک کی نجات مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد میں ہے میں بہت جلد پنجاب کا دورہ کروں گا اور یہاں کے لوگوں کی نبضیں ٹٹولوں گا۔

اس کے بعد آپ نے اخبارات سے شکایت کی کہ جب وہ بنگال گئے اور وہاں تقریر کی تو اسے ہندو اخباروں نے کچھ اور مسلم اخباروں نے کچھ شائع کیا اور ان کی تقریر

کا مفہوم ہی غائب ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس پر اخبارات کے نمائندوں نے آپ کو یقین دلایا کہ آئندہ آپ جو کچھ فرمائیں گے وہ کچھ شائع ہو گا۔ آپ نے انہیں مندرجہ ذیل الفاظ نوٹ کرائے۔

"میں چاہتا ہوں کہ سرحد میں کانگرس وزارت ہو لیکن میں جانتا ہوں کہ وہاں کے عوام کی زندگی کا معیار بہت اونچا نہیں اور ملک میں بھوک بہت ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ وزارتیں فقیرانہ زندگی بسر کریں اور بھوکی قوم کی مدد کریں"

باچا خان ۲۴ اگست ۱۹۳۸ء کی صبح کراچی پہنچے وہاں گھنٹہ بھر تک آپ اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے رہے آپ نے سرحد کی قبائلی جنگ اور اغوا کی وارداتوں کے متعلق فرمایا کہ یہ وارداتیں محض سیاسی ہیں ان کا ہندو مسلم مسئلہ سے کسی قسم کا تعلق نہیں اصل بات یہ ہے کہ سرحد کے مسائل کو بیرونی لوگوں کے لیے سمجھنا مشکل ہے حکومت اس صوبے کو فوجی بنانا چاہتی ہے اس لیے اسے باقی ہندوستان سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

انہوں نے فرمایا اخبارات کو سرحد کے معاملات پر فرقہ وارانہ نکتہ خیال سے نظر نہیں ڈالنی چاہیے میں نے حکومت کے سامنے یہ سکیم پیش کی تھی کہ وہ مجھے پانچ سال تک سرحد میں آزادی سے کام کرنے کی اجازت دے نیز قبائل کو عام تعلیم دلائے اور ان کے لیے صنعت و حرفت کا میدان کھول دیا جائے لیکن حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی کارروائی کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اس پیشکش کے بدلے مجھے گرفتار کر لیا اگر حکومت سرحد میں قیام امن کی

خواہشمند ہے تو مجھے اپنی سکیم کے مطابق کام کرنے کی اجازت دی جانی چاہیئے۔

انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ۔ اگر مجھے کانگریس کی صدارت پیش کی گئی تو میں صدر بننے سے انکار کر دوں گا،

اُسی دن دام باغ کراچی میں ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب فرماتے ہوئے آپ نے کہا

"پٹھان اگرچہ غیر تعلیم یافتہ ہیں لیکن وہ عملی سیاستدان ہیں مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنے اختلافات کو خیرباد کہہ دینا چاہیے اور سب کو خدائی خدمت گار بن کر کانگریس میں شامل ہوکر اسے مضبوط بنانا چاہیے اور اس طرح قومی خدمت کا ثواب حاصل کرنا چاہیے"

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا اجرا ہوتے ہی ۱۹۳۶ء میں صوبہ سرحد کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح ایک ذمہ دار حکومت بنانے کا حق مل گیا پہلی بار صوبے میں الیکشن کیا گیا جس میں جماعتی فیصلے کے مطابق پراونشل کانگریس کمیٹی صوبہ سرحد نے بھی حصہ لیا۔ اس وقت باچا خان بمبئی جیل سے رہا ہو کر دہلی میں مقیم تھے اور ابھی انہیں صوبہ سرحد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ لیکن صوبائی حکام کے دلوں میں کانگریس اور خدائی خدمتگاروں کے متعلق وہی پرانا نفرت کا جذبہ ابھی تک موجود تھا حکومت کو کانگریس کی کامیابی کسی طرح بھی منظور نہ تھی اور نہ ہی وہ اسے برسر اقتدار آتا دیکھ سکتی تھی چنانچہ دھاندلی اور بددیانتی کے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے گئے حکومت نے خوانین، سرکاری ملازمین اور دوسرے تمام سرکار پرست لوگوں سے مل کر کانگریس کا مقابلہ کیا لیکن انکے باوجود انہیں بُری طرح شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور جب نتیجہ سامنے آیا تو مختلف پارٹیوں کی

پوزیشن یہ تھی ۔

کانگرس پارٹی

۱ عبداللہ خان

۲ عبدالعزیز خان

۳ ارباب عبدالغفور خان

۴ عبدالغفور خان

۵ ارباب عبدالرحمان خان

۶ اکبر علی خان

۷ امیر محمد خان

۸ قاضی عطاء اللہ خان

۹ لالہ بھنجو رام

۱۰ فقیرا خان

۱۱ ڈاکٹر سی سی گھوش

۱۲ لالہ حکم چند

۱۳ میاں جعفر شاہ

۱۴ لالہ جمنا داس

۱۵ ڈاکٹر خان صاحب

۱۶ محمد افضل خان

۱۷ پیر محمد کامران

۱۸ سمین جان خان

۱۹ زرین خان

مسلم نیشنلسٹ پارٹی

۱ نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان

۲ خان بہادر سعد اللہ خان

۳ خان صاحب عبدالمجید خان

۴ نوابزادہ اللہ نواز خان

۵ خان صاحب اسد اللہ خان

۶ عزیز اللہ خان

۷ کیپٹن نواب باز محمد خان

۸ فیض اللہ خان

۹ پیر سید لال شاہ

۱۰ ملک الرحمان خان

۱۱ سردار محمد اورنگ زیب خان

۱۲ نوابزادہ محمد سید خان

۱۳ نواب محمد ظفر خان

۱۴ لفٹننٹ محمد زمان خان

۱۵ نصر اللہ خان

۱۶ میاں ضیاء الدین

ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی

۱ رائے بہادر مہر چند کھنہ

۲ سردار اجیت سنگھ

۳ رائے بہادر لالہ چمن لال

۴ رائے بہادر لالہ ایشر داس

۵ سردار جگت سنگھ

۶ رائے صاحب لالہ کنور بھان

۷ رائے صاحب پرمانند

۸ رائے بہادر لالہ روچی رام

ڈیموکریٹک پارٹی

۱ خان محمد سرور خان

۲ خان صاحب راجہ عبدالرحمان خان

۳ محمد عباس خان

۴ خانصاحب محمد سلطان خان

انڈی پنیڈنٹ پارٹی

۱ ملک خدا بخش خان

۲ مسٹر پیر بخش خان وکیل

۳ سردار عبدالرب خان نشتر

گویا ۵۰ ممبروں کے ہاؤس میں سب سے بڑی پارٹی کانگرس کی تھی کانگرس کی یہ حیرت انگیز کامیابی حکومت کی توقعات کے خلاف تھی اُسے بڑا تعجب ہوا اور اپنی اس المناک شکست کا داغ دھونے کے لیئے گورنر سرحد سر جارج کنگھم نے ممبروں کی میٹنگ بلائے بغیر بالکل غیر آئینی طور صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم کو صوبہ میں سب سے پہلی آئینی وزارت بنانے کا حکم دے دیا۔

صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم نے خان بہادر سعداللہ خان اور رائے بہادر مہر چند کھنہ کے ساتھ مل کر سرحد میں سب سے پہلی وزارت بنائی۔ سپیکر ملک خدا بخش مرحوم اور ڈپٹی سپیکر محمد سرور خان منتخب ہوئے۔

اگرچہ یہ غیر عوامی اور نیم سرکاری وزارت تھی لیکن اس نے سیاہ قوانین (پبلک ٹرنکوالٹی ایکٹ) کی منسوخی کا اعلان کر کے ایک ایسا قابل قدر قدم اٹھایا جسے اہل سرحد کبھی فراموش نہیں کر سکتے،

ان قوانین کی منسوخی سے ایک عرصہ کے بعد تمام صوبائی سیاسی جماعتوں سے پابندیاں ہٹ گیئں اور وہ دوبارا سامنے آ کر کام کرنے لگیں،

صاحبزادہ عبدالقیوم کی وزارت کو چھ مہینے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے مشورے سے پراونشل کانگرس کمیٹی نے سرحد میں مخلوط وزارت بنانے کا فیصلہ کیا۔

اب باچا خان پر سے سرحد میں داخل نہ ہونے کی پابندی اُٹھ چکی تھی اور وہ اپنے وطن آچکے تھے۔

اس مقصد کے لیے مرکز کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد، بابو راجندر پرشاد اور بھولا بھائی ڈیسائی کو سرحد بھیجا گیا تاکہ وہ یہاں کانگرس وزارت بنانے کے لیے راہ ہموار کریں انھوں نے آتے ہی مختلف پارٹیوں سے مل کر ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد ہزارہ ڈیمو کریٹک انڈیپینڈنٹ اور ہندو نیشنلسٹ پارٹی کے بعض ممبروں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔

جب ستمبر ۱۹۳۷ء میں اسمبلی کا سرمائی اجلاس ایبٹ آباد میں شروع ہوا تو ڈاکٹر خان صاحب نے اپوزیشن پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم کی وزارت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرنے کا نوٹس دے دیا۔ چنانچہ رائے شماری میں کانگرس کو ۵۰ کے ہاؤس میں ۲۷ ووٹ حاصل کرکے تین ووٹوں کی اکثریت سے کامیابی حاصل ہوئی اور صاحبزادہ عبدالقیوم کی وزارت توڑ کر گورنر سرحد نے ڈاکٹر خانصاحب کو وزارت بنانے کا اختیار دے دیا۔

چنانچہ صوبہ سرحد میں کانگرس پارٹی کی پہلی وزارت کی مندرجہ ذیل تشکیل عمل میں لائی گئی۔

ڈاکٹر خان صاحب	وزیر اعلیٰ
قاضی عطاء اللہ خان	وزیر تعلیم
لالہ مہنجو رام گاندھی	وزیر خزانہ
عباس خان	وزیر صحت

ان کے علاوہ چار پارلیمنٹری سکرٹری بھی لیے گئے جنھیں ارباب عبدالغفور خان، امیر محمد خان، عبدالغفور خان بیرسٹر اور رائے بہادر رچمن لال شامل تھے۔

کانگرس وزارت بننے کے فوراً بعد انڈین نیشنل کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے سب سے پہلی دفعہ صوبہ سرحد کا دورہ کیا۔ پشاور میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا اور انھوں نے پشاور، چارسدہ اور اتمان زئی میں عظیم الشان جلسوں سے خطاب کیا۔ پشاور شاہی باغ صدر، اسلامیہ کالج اور مشن کالج میں بھی انھوں نے تقریریں کیں۔ پھر ایبٹ آباد، مانسہرہ، بفہ، ہری پور، مردان، رسالپور، نوشہرہ، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کا دورہ بھی کیا جہاں ایک ہفتے کے اندر انھوں نے تیس جلسوں میں حصہ لیا اور استقبالیہ سپاسناموں کے ساتھ ساتھ منظم خدائی خدمت گار جیشوں کی سلامی بھی لی۔ ہر جگہ ان کی خوب آؤبھگت ہوئی اور سارے صوبے میں نہایت گرمجوشی سے انہیں خوش آمدید کہی گئی۔

صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم جن کی تمام عمر خدمت سرکار میں گزری تھی اور عوامی زندگی کے نشیب و فراز سے ناواقف تھے اس شکست سے ہاتھنے دل شکستہ ہوئے کہ تھوڑے عرصہ بعد ہی بیمار ہو کر وفات پا گئے۔

کانگرس کو بڑے آزمائشی حالات میں وزارت سنبھالنا پڑی۔ مدتوں کے نوکر شاہی نظام نے حکومت کی مشینری کو اس درجہ ناکارہ بنا رکھا تھا کہ اس کی اصلاح کرنا اور اسے عوامی لائنوں پر چلانا جان جوکھوں کا کام تھا ادھر وزارت کے اختیارات پہلے ہی سے بالکل محدود تھے ادھر حکومت کا تمام عملہ انگریز پرستانہ ذہنیت کے باعث کانگرس کا ازلی دشمن تھا اور اس سے کسی صورت میں بھی تعاون کرنے پر آمادہ نہ تھا اور ان کی ہر لمحہ یہی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس وزارت کو ناکام بنایا جائے۔

کانگرس کی وزارت اعلیٰ کے منصب پر ڈاکٹر خانصاحب فائز تھے جو اپنی قابلیت دیانتداری اور اخلاص کے باوجود ایک نہایت سادہ لوح اور بقول گاندھی جی سیاسی ہتھکنڈوں سے بالکل کورے واقع ہوئے تھے۔ لیکن وزارت کافی مضبوط تھی اور ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو ابن الوقتی اور خود غرضی سے پاک تھے اور کسی قیمت پر بھی مخالفوں کے ہاتھوں بکنے والے نہیں تھے۔

انہوں نے حتی الوسع مفاد عامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے پرانے عوام کش طریق کار کو بدلنے کی کوشش کی آنریری مجسٹریٹوں ذیلداروں اور معافی داروں کو یکسر ختم کر دیا جو رشوت ستانی اور لوٹ کھسوٹ کے خوفناک مورچے تھے اور عبدالقیوم خان سابق چیف منسٹر صوبہ سرحد کے قول کے مطابق رجوان کی کتاب گولڈ اینڈ گن میں درج ہے اور جو مشرف بہ مسلم لیگ ہونے سے کچھ دیر ہی پہلے لکھی گئی) چودھروں اور لیڈروں کا یہ گروہ جلد ہی "اسلام خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگاتے ہوئے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کے پہلے دستے میں شامل ہوگئے اور آج تک اس کی ریڑھ کی ہڈی بنے ہوئے ہیں اس گروہ کو ہیرو بننے کے لیے مسلم لیگ میں آنے کا سنہری موقع مل گیا جہاں وہ نہ صرف اپنے گرتے ہوئے وقار کو بچا سکتے تھے بلکہ ترقی پسند قوتوں کے خلاف اپنے پرانے حربے بھی استعمال کر سکتے تھے۔

غرض کانگرس منسٹری نے صرف دو سال اور تین مہینے کی مختصر عمر میں لوگوں میں کافی قبولیت حاصل کر لی خصوصاً ڈاکٹر خانصاحب تو اپنی عوام دوستی اور غریب پروری کی وجہ سے مثالی وزیر اعظم ثابت ہوئے وہ رات دن لوگوں کی خدمت کے لیے تیار رہتے اور جیسا کہ عام لوگوں میں مشہور تھا کسی کی مرغی چوری ہو جاتی تو اس کے ساتھ وہ خود مرغی کی تلاش میں چل پڑتے۔

لیکن وزارت بننے سے تحریک کو نقصان بھی پہنچا۔ خدائی خدمت گار جنہوں نے ایک عرصہ تک اس تحریک میں دُکھ جھیلے، مصائب اٹھائے اور گھر بار تک لٹا دیئے اب اپنی وزارت سے ان میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھانے کی توقع کرنے لگا اگرچہ وہ اس معاملہ میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے تاہم ہزاروں لاکھوں انسانوں کی ان خواہشات کو پورا کرنا وزارت کے بس کا کام نہیں تھا جس کے نتیجہ کے طور پر ان میں ناراضگی، بددلی اور مایوسی پھیلنے لگی۔

اِدھر ڈاکٹر خانصاحب کی سادگی اور صاف دلی سے صوبہ سرحد کے چالاک انگریز گورنر نے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں سمجھا بجھا کر انہی کے ہاتھوں یہاں دوبارا کالے قوانین کا نفاذ کرا دیا یہی نہیں بلکہ غلہ ڈھیر کے مظلوم کسانوں کی تحریک کو کانگرس وزارت نے نواب طورو کی پشت پناہی کرتے ہوئے کچلنا شروع کیا ان پر فائرنگ کرائی گئی اور تمام سوشلسٹ کسان رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔

یہ وہ غلطیاں تھیں جو کانگرس وزارت کو بدنام کرنے کے لیے اس سے سرزد کرائی گئیں خصوصاً غلہ ڈھیر تحریک کے سلسلہ میں تو کانگرس وزارت نے نہایت افسوسناک پارٹ ادا کیا ان سوشلسٹ لیڈروں پر جو ابتدا سے ان کا ساتھ دیتے آئے تھے اور جو ملک کی جنگ آزادی کے جانباز اور بے باک سپاہی تھے ---- طرح طرح کے الزام لگائے اور اپنے دورِ حکومت میں ان سے دشمنوں جیسا سلوک کر کے کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی۔ چنانچہ ڈاکٹر خانصاحب کے بیان ان کی پالیسی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

"اس تحریک کے ذمہ دار سوشلسٹ ہیں کانگرس وزارت قائم ہونے سے چند ماہ پہلے نواب طورو نے مزارعین کے خلاف ڈگریاں حاصل کر لی تھیں سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ کسانوں کو سوشلسٹ

لیڈروں نے فرضی وعدے دے کر سول نافرمانی پر آمادہ کیا بس شو شوں نے کسانوں کو یہ بھی کہا کہ وہ تین لاکھ ستیہ آگرہی سول نافرمانی کے لیے بھیجیں گے۔ گورنمنٹ اگرچہ معصوم کسانوں کو گرفتار کرنے میں تامل کرتی ہے تاہم وہ یہ خلاف آئین سرگرمیاں برداشت نہیں کر سکتی۔

اس سلسلہ میں غلہ ڈھیر کے مظلوم کسانوں کے مندرجہ ذیل چند خطوط ملاحظہ ہوں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن پر کیسے کیسے ناروا مظالم توڑے گئے۔

"ہم ۱۲ کو نواب کی طرف سے چند غنڈے ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے ہمارے گھروں میں گھس آئے ہمیں زدوکوب کیا اور ہماری بے عزتی کی۔ کوئی ہماری مدد کو آتا تو پولیس اُسے روک دیتی۔

"مستورات"

آج ہزاروں کی تعداد میں نواب طورو کے آدمی آئے اور فصلیں برباد کرتے رہے پولیس ان کی امداد کر رہی تھی۔ دوکانوں کو لوٹا گیا گھروں کے تالے توڑے گئے اور ہمارے مردوں کو بے رحمی سے پیٹا گیا۔

"مستورات"

تحصیل مردان کا مسمی زیور خان تقریباً ایک درجن تحصیل کے چپڑاسیوں اور پولیس کے بے شمار سپاہیوں کے ساتھ آیا اور ۱۲ مکانوں کا قبضہ حاصل کر کے بچوں اور عورتوں

کو ان کے مکانوں سے نکال دیا۔

نواب طورو کے آدمیوں نے فصلوں کو کاٹ کر تباہ کر دیا، پولیس نے غلہ ڈھیر کا محاصرہ کر رکھا ہے کسی شخص کو گاؤں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں بلاوجہ عورتوں اور بچوں کو زدوکوب جاتا ہے اور کھیتوں کو جاتے ہوئے کسانوں پر ڈنڈے برسائے جاتے ہیں۔

اب اس حادثے کے متعلق چند ایک ملکی اخبارات کی رائے بھی ملاحظہ ہو۔

ہفتہ وار ہند کلکتہ

صوبہ سرحد میں کانگرس وزارت قائم ہے مگر وہاں سوشلسٹ لیڈروں پر زمین تنگ کر دی گئی ہے، بہت سے سوشلسٹ لیڈر گرفتار کر لیے گئے اور کسانوں کی تحریک روکنے کی بڑی سختی سے کوشش کی جا رہی ہے معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر خانصاحب اپنے صوبے کو آسٹریا بنانے کی فکر میں ہیں۔

۹ اگست ۱۹۳۸ء

نوجوان سرحد ہری پور

سرحد کی کانگرس حکومت پرانے کالے قانون نافذ کرنے کی فکر میں ہے تاکہ سوشلسٹ کسانوں اور مزدوروں کے رہنمائی کی سرگرمیوں کا خاتمہ کر سکے۔

پیغام سرحد

مورخہ ۲۰ راگست کی گرفتاری کے وقت پولیس نے بے گناہ عورتوں پر لاٹھی چارج کرکے اور قرآن مجید کی توہین کرکے اپنی ذہنیت کا مظاہرہ کیا۔

۲۴ ستمبر ۱۹۳۸ء

شانتی

غلہ ڈھیر کی پولیس نے کانگرس کے جھنڈے اور سوشلسٹوں کے سُرخ جھنڈے کی سخت توہین کی ہے جس سے لوگوں میں ہلچل مچ گئی ہے

مدینہ بجنور

غلہ ڈھیر میں نواب طورو کے مظالم کے خلاف کسانوں نے پُرامن تحریک جاری کر رکھی ہے وہاں ڈاکٹر خانصاحب کی حکومت نے پُرانی نوکر شاہی کی یاد تازہ کرتے ہوئے صرف ایک دن میں ۸۴ کسانوں کو پابہ زنجیر کرلیا۔

باچا خان کو ان دردناک واقعات کا پتہ چلا تو وہ خود غلہ ڈھیر گئے اور اپنی آنکھوں سے مظلوم کسانوں کی خانہ بربادی دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور واپس آکر ڈاکٹر خانصاحب کو توجہ دلائی پھر ڈاکٹر خانصاحب نے غلہ ڈھیر کا دورہ کیا اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد انہیں تسلیم کرنا پڑا کسانوں کے مطالبات جائز ہیں اور انہوں نے کسانوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا لیکن وہ کچھ بھی نہ کرسکے اور بدستور حکومت کی استحصالی مشینری کا پرزہ بنے رہے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر خانصاحب کی نیت پر شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا وہ نیک آدمی ہیں بہت ہی نیک آدمی —————— اس حد تک نیک اور سادہ جہاں پہنچ کر یہ صفات نہایت مہلک ثابت ہونے لگتی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہی انتہائی نیکی اور سادگی ہے وہ ایک عرصہ انگلینڈ میں رہے اور اپنے تجربہ کی بنا پر یہ سمجھ بیٹھے کہ انگریز بحیثیت حاکم کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن ذاتی تعلقات میں وہ اتنا برا نہیں بلکہ اچھا دوست ثابت ہوتا ہے۔ ان کے اس تجربے یا مشاہدے کو ہم غلط بھی نہیں کہہ سکتے ہر قوم میں اچھے برے افراد ملتے ہیں اور اسی طرح انگریز قوم میں بھی لیکن یہ ان کی سادہ لوحی ہی کا کرشمہ ہے کہ تمام انگریزوں کو ایسا سمجھنے لگے اور ایک سیاسی آدمی ہوتے ہوئے بھی اتنی موٹی سی بات بھول گئے کہ انگلینڈ سے اپنی نوآبادیات یا مقبوضات کا نظم و نسق چلانے کے لیے جن لوگوں کو منتخب کر کے بھیجا جاتا ہے انہیں سب سے پہلے یہ ہدایات ملتی ہیں کہ

اِن لوگوں کی دوستی کا اعتبار نہ کرنا

ان سے برابر کا سلوک نہ کرنا

اِنہیں سر اٹھانے کا موقع نہ دینا

اور اپنی مطلب برآری کے لیے کوئی برے سے برا اور اوچھے سے اوچھا حربہ استعمال کرنے سے دریغ نہ کرنا۔

ڈاکٹر خان صاحب کی بیوی انگریز تھی سر جارج کنگھم گورنر سرحد کی بیوی سے اس کے مراسم تھے جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب اور کنگھم کے تعلقات بھی دوستانہ رنگ اختیار کر گئے اور ڈاکٹر صاحب یہ بھول کر کہ وہ ایک حاکم بھی ہے اسے اپنا دوست سمجھتے ہوئے اس حد تک قابل اعتماد سمجھنے لگے کہ وہ جو چاہتا بغیر کسی تکلیف کے ڈاکٹر صاحب

سے کرا لیتا ۔ اور آخر میں تو اُن کا گویا یہ عقیدہ ہو چکا تھا کہ ان کے دوست احباب ہمدرد غمگسار حتیٰ کہ جماعت بھی جو کچھ کہتی ہے سب غلط ہے اور صحیح بات صرف وہی ہو سکتی ہے جو کنگھم کہے کیونکہ اُن کے نزدیک انگریز کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا حالانکہ اسی ان کے جگری دوست کنگھم نے خود ان سے بارہا وعدہ خلافی کی اور جب حکومت کا مفاد وابستہ نہ رہا تو ڈاکٹر صاحب اور اُن کے خاندان پر بے پناہ مظالم توڑے اور یوں آنکھیں پھیر لیں جیسے کبھی کی آشنائی ہی نہ تھی ۔

ہر چند باچا خان کو ملک و قوم کے مفاد کے پیش نظر کانگرس میں بھی شامل ہونا پڑا لیکن بنیادی طور پر وہ ہمیشہ خدائی خدمت گار رہے ۔ انہیں اپنی اس تحریک سے عشق تھا اور کسی قیمت پر بھی اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے اس لیے کہ وہ پشتون قوم کی فلاح و بہبود اسی میں دیکھتے تھے انہوں نے اس تحریک کے پودے کو اپنے خون سے سینچا اور اپنی زندگی کی تمام رعنائیاں، آرام و آسائش اس پر نچھاور کر کے اسے پروان چڑھایا وہ شب و روز اسی فکر میں رہتے کہ کسی طرح تحریک کو مضبوط اور مقبول بنایا جائے اور پشتون قوم کی اصلاح کی جائے اور اسے زندہ اور مہذب قوموں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل بنایا جائے ۔

انہیں اپنی تحریک سے دیوانگی کی حد تک محبت تھی یہاں تک کہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ کانگرس میں دلچسپی لینے کی وجہ سے ان کی تحریک کمزور ہو رہی ہے یا اس پر ناخوشگوار اثر پڑ رہا ہے تو انہوں نے کانگرس سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ۔ اگرچہ عوام کے مجبور کرنے سے وہ ایسا نہ کر سکے لیکن جیسا کہ ان کی مندرجہ ذیل تقریر سے ظاہر ہے انہوں نے دو دفعہ کوشش کی کہ وہ کانگرس سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے آپ کو محض خدائی خدمتگار

تحریک کے لیے وقف کر دیں۔

"تمہیں معلوم ہوگا کہ ہماری تحریک کے دو شعبے ہیں ایک کانگرس دوسرا خدائی خدمت گار.... سو میں صرف کانگرس سے الگ ہو کر خدائی خدمتگاروں کی کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہتا ہوں مجھے امید ہے کہ میں اس چیز میں بہت کامیاب ہوں گا میں تم پر واضح کر دوں کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں رہے گا نہیں میں ہر مصیبت میں تمہارا ساتھی ہوں جو امداد تم مجھ سے چاہو دوں گا۔ آج ہمارے خانگی جھگڑے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ میں کہیں ایک دن تمہارے جلسے میں شریک ہوتا ہوں تو میرے دماغ پر اتنا اثر پڑتا ہے کہ مہینہ بھر ٹھیک نہیں ہوتا میں مانتا ہوں کہ آج کل جنگ شروع ہونے والی ہے جس کے لیے تیاری کی ضرورت ہے لیکن یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ ستیہ گرہ انفرادی بھی ہو سکتی ہے اور میں اس کا قائل ہوں سو اگر موقع آیا تو میں انفرادی ستیہ گرہ کروں گا مگر اسے ضروری سمجھتا ہوں کہ آج سے تم اپنا کام کرو اور میں اپنا....

اس کے بعد میرا ایک اور خیال ہے اگر وقت ملا تو اُمید ہے کہ بہت جلد اس پر عمل شروع کر دوں گا وہ یہ ہے کہ خدائی خدمت گاروں کی تربیت کے لیے ہم ایک مرکز بنائیں گے اور ان کی ایک نئے طریقہ سے تنظیم شروع کریں گے، اس نئے نظام کے تین حصے ہوں گے، زندگی رہی تو میں پھر کبھی تفصیل سے یہ چیز تمہارے سامنے بیان کروں گا لیکن اتنا کہدوں کہ صحیح معنوں میں خدائی خدمت گار وہ نہیں ہے کہ جس نے

ہری پور میں تین سال قید گزاری ہو یا صرف کپڑے سرخ کئے ہوں یا انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا ہو، میں اُسے خدائی خدمت گار سمجھتا ہوں جو خدائی خدمت گاروں کے اصولوں پہ چلے اور جو کچھ کرے خدا کے لیے کرے اس کی کوئی پروا نہیں اگر ایسے لوگوں کی تعداد دو ہو تین ہو یا چار ہو ——— یہ بھی سمجھ لو کہ نئے خدائی خدمت گاروں کے قواعد وضوابط یہ نہیں ہوں گے جیسے اب دیکھتے ہو نہ ایسے رجسٹر ہوں گے بلکہ میں اُن کے نام اپنے دل کے رجسٹر میں لکھوں گا ‘‘

(عبدالغفار: پختون ۱۰ اپریل ۳۹ء)

آپ کی اس تقریر کے بعد جلسہ میں ایک ہلچل مچ گئی اور تمام لیڈروں نے اپنی تقریروں میں آپ سے اپیل کی کہ آپ الگ نہ ہوں ورنہ یہ سب کام بند ہو جائے گا عوام آپ کے گرد ہو گئے یہاں تک کہ آپ کو اُٹھ کر اپنا یہ فیصلہ واپس لینا پڑا اور اعلان کرنا پڑا کہ میں کانگرس کے ساتھ بھی کام کرتا رہوں گا۔

”میں مدت سے اپنی تحریک کے متعلق غور کر رہا ہوں میں جیل سے رہا ہو کر اپنے صوبہ میں آیا تو ہر وقت اس بات کی مجھے فکر رہتی اور جب کبھی میں تنہا ہوتا تو اس کے بغیر اور کسی بات کی فکر نہ ہوتی میں سوچتا ہوں کہ کس طرح ہماری تحریک شروع ہوئی، پہلے کیسی تھی بعد میں کیسی ہوئی اور اب کیسی ہے۔

جب میں جیل میں تھا تو اپنی تحریک کے متعلق میں نے کچھ باتیں سنیں اور میں نے ایک کتاب لکھی جو اپنے پیغام کے طور پر آپ کو بھجوائی

میرا مطلب یہ تھا کہ آپ سب خدائی خدمت گار اسے پڑھیں اور فکر کریں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور خدائی خدمت گاری کیا چیز ہے۔ وہ مرحلہ گزر گیا پھر تمہیں معلوم ہے کہ میں گاؤں گاؤں، تحصیل تحصیل اور ضلع ضلع تمہارے پاس پہنچا تم سے محبت سے باتیں کیں اور خدائی خدمت گاری کے اصول بتائے ...... لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی تم میں کوئی تبدیلی نہ آئی بلکہ تم لوگ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہو۔ میری کوشش تھی کہ تم اپنی اصلاح کرتے اور صحیح خدمت گاری سیکھتے لیکن افسوس کہ تم پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ اب تو تم مجھے بھی اپنے ساتھ اس گندگی میں گھسیٹنے کی کوشش کر رہے ہو میں کسی جلسے میں اصلاحی تقریر کرتا ہوں تو خود غرض لوگ اس کے افسانے بناتے ہیں اور میری نیت پر حملے کرتے ہیں۔

میں نے گذشتہ سال ایبٹ آباد میں کہا تھا کہ میں تمہارا خدمت گار ہوں لیکن تم مجھے اجازت دو کہ میں ایک اور طریقے سے خدمت کروں اور اس کی صورت یہ ہے کہ تم مجھے اپنا کام کرنے دو اور جرگہ (کانگرس) کا کام تم میرے بغیر چلاؤ مگر تم نے میری درخواست منظور نہ کی اور مجھے تمہاری محبت نے مجبور کر دیا کہ تم سے جدا نہ ہوں لیکن مجھے یہ امید ضرور تھی کہ تم اس دن سے اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرو گے مگر افسوس کہ حالات پہلے سے زیادہ خراب ہو گئی جب میں غور کرتا ہوں کہ وہ دن اس سے پھر بھی قدرے اچھے تھے تو میں کہتا ہوں کہ ان حالات میں میں آپ کے ساتھ مل کر آپ کی خدمت کر سکتا۔ چنانچہ اب بہت دنوں سے

میرا پھر یہ خیال ہے کہ پرانے تجربہ میں مجھے کامیابی نہ ہوئی اب ایک نیا تجربہ کرکے دیکھوں میں نے دیکھ لیا کہ میں تم میں رہوں تو تم اپنی اصلاح نہیں کر سکتے اس لیے میں تم سے جدا ہوتا ہوں اور ایک دوسرے طریقہ سے باہر رہ کر تمہاری خدمت کرتا ہوں دیکھو شاید خدا اس میں کامیابی دے۔ میرے جدا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں کہیں باہر جاؤں گا یا کام چھوڑ دوں گا نہیں بلکہ میں یہیں رہ کر کام کروں گا لیکن ایک اور طریقہ پر جس سے تمہاری زیادہ بہتر خدمت کر سکوں اگر تم مجھے اجازت دے دو اور تمہاری محبت میرے ساتھ رہے تو اُمید ہے کہ میں تمہارے لیے اس طرح بہتر کام کروں گا۔

باچا خان کی کانگرس سے علیحدگی

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کا لاوا پھوٹ پڑا جس نے ملک کے حالات کو دگرگوں کر دیا۔ آل انڈیا نیشنل کانگرس کمیٹی نے اس جنگ میں انگریزوں کی حمایت کا رزولیوشن پاس کیا جس سے باچا خان کو اتفاق نہیں تھا کیونکہ وہ جنگ جو لوگوں سے تعاون کرنا کانگرس کے بنیادی اصول عدم تشدد کے منافی خیال کرتے تھے اس لیے انہوں نے مرکز کے اس رزولیوشن کی پرزور مخالفت کی اور بطور احتجاج کانگرس سے مع اپنی خدائی خدمت گار جماعت کے مستعفی ہوگئے چونکہ ان حالات میں اب حکومت سے تعاون کرنا اور کانگرس منسٹری کو برقرار رکھنا بھی درست نہیں تھا اس لیے جماعتی فیصلے کے مطابق ۶ ستمبر ۱۹۳۹ء کو کانگرس وزارت نے اپنے آخری سیشن میں جنگ کے خلاف متفقہ طور پر ایک رزولیوشن پاس کرنے کے بعد ۷ نومبر ۱۹۳۹ء کو وزارت سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے

صوبوں میں بھی کانگرس وزارتیں یکے بعد دیگرے مستعفی ہو گئیں۔

باچا خان نے اپنے کانگرس سے مستعفی ہونے کے متعلق ایک وضاحتی بیان دیا جو ۱۹۴۰ء میں پختون میں شائع ہوا۔ ترجمہ درج ذیل ہے۔

آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں نے کانگرس ورکنگ کمیٹی سے مورخہ ۰ جولائی ۳۹ء کو استعفیٰ دے دیا ہے پر آپ اس کی حقیقت کو نہ سمجھے ہوں گے اس لیے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو سب کچھ سمجھا دوں۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی میں ۰ جولائی کو پانچ روز کے بحث مباحثے کے بعد کثرت رائے سے ایک تجویز پاس کی گئی جس کی تشریح کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور راجگوپال اچاریہ نے اپنے اپنے بیانات میں کر دی ہے جو کہ انہوں نے اخباری نمائندوں کو دیئے ہیں ان بیانات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ کانگرس نے عدم تشدد کے پاک راستے سے ہٹ کر تشدد کی ناپاک راہ پر چلنے کا ارادہ کیا ہے یعنی اگر انگریز کانگرس کی شرائط قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو کانگرس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ یورپ کی جنگ میں شرکت کرے گی اور ہر قسم کی امداد دے گی یہ راستہ جس پر آج کل کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے قدم اٹھانے کا ارادہ کیا ہے ہماری خدائی خدمت گار تحریک کا راستہ نہیں ہے بلکہ ہمارے اصولوں کے بالکل خلاف ہے۔ ہمارا راستہ صلح اور محبت کا راستہ ہے نہ کہ جنگ و جدل اور نفرت کا ...... ہماری دنیا کی کسی قوم کے ساتھ کوئی دشمنی اور جنگ نہیں اور نہ ہی کسی کے ساتھ ہم دشمنی

اور جنگ چاہتے ہیں ہم خدائی خدمتگار ہیں اور خالق کی خدمت اس کی مخلوق کی خدمت ہمارا کام ہے۔ ہمارا اصول کسی کو قتل کرنا نہیں بلکہ اپنے آپ کو قربان کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے کانگرس ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا ہے اس لیے کہ میں اس راستے میں ملک و قوم کا فائدہ نہیں دیکھتا ہوں اور یہ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ میری قوم کا فائدہ عدم تشدد کے سوا نہیں ہو سکتا میں دیکھ رہا ہوں کہ عدم تشدد ہی سے پٹھانوں کی ہمت اور حوصلے بڑھے ہیں اور جو خوف اور بزدلی ان کے دلوں میں تحریک سے پیشتر تھی اب اس کی جگہ بہادری، دلیری اور شجاعت پیدا ہو چکی ہے اس کے علاوہ جو فائدے اس تحریک نے پٹھانوں کو پہنچائے ہیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔

میں اپنے ملک اور قوم کی بہتری اسی میں سمجھتا ہوں اور میرا کامل یقین ہے کہ خدائی خدمت گاری کے بغیر پٹھان قوم کا یہ برباد و ویران گھر آباد نہیں ہو سکتا اور نہ ہی نجات اور اصلاح ہو سکتی ہے تو اس لیے میری تمام خدائی خدمتگاروں کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ ایمانداری سے ان تمام باتوں پر غور کریں اگر ان کا اس سے اتفاق ہو تو بہتر ورنہ یونہی نام کی خدائی خدمت گاری چھوڑ دیں اور سچے خدائی خدمتگاروں کو ملک و قوم کی خدمت کا موقع دیں۔۔

اس بیان کے فوراً بعد ۱۰ اگست ۱۹۳۹ء کو سرحد پراونشل کانگرس ورکنگ کمیٹی کا ایک خصوصی اجلاس علی گل خان کی صدارت میں بمقام

ایبٹ آباد منعقد ہوا جس میں کافی بحث و تمحیص کے بعد مندرجہ ذیل تجویزیں کثرت رائے سے پاس ہوئیں

۱ - صوبہ سرحد کا قومی جرگہ (کانگریس) کا یہ اجلاس فخر افغان خان عبدالغفار خان صاحب کو صوبہ سرحد میں سب سے بڑا اپنا راہنما مانتا ہے اور ان کی رہنمائی کو صوبہ سرحد کے عوام کے فائدے اور بہبودی کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے

۲ - صوبہ سرحد کا قومی جرگہ فخر افغان خان عبدالغفار خان کے کانگریس سے مستعفی ہونے کی وجہ کو بالکل صحیح سمجھتا ہے اور اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

۳ - صوبہ کا قومی جرگہ فخر افغان کو یقین دلاتا ہے کہ جنگ آزادی میں سرحد کے بسنے والے اس کے کام کے طریقوں کے مطابق ملک اور مذہب کے سلسلہ میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

اگلے روز ۱۱ اگست کو بڑے جرگے کا اجلاس ہوا جس میں ورکنگ کمیٹی کی مندرجہ بالا پاس شدہ تجویزیں پیش کی گئیں غلام محمد خان لوند خوڑ اور حاجی فقیرا خان نے اپنی ترمیمیں پیش کیں جن پر عام بحث ہوئی آخر میں حاجی فقیرا خان نے اپنی ترمیم واپس لے لی اور غلام خان لوند خوڑ کی ترمیم گر گئی پھر رائے شماری ہوئی اور یہ تجویزیں کثرت رائے سے منظور کر لی گئیں۔

اس کے بعد صوبے کے مختلف حصوں سے سرکردہ خدائی خدمت گاروں کے دھڑا دھڑ بیانات اخباروں میں چھپنے لگے جن میں باچا خان کے موقف کی تائید ہونے لگی ان میں سے ایک بیان یہاں درج کیا جاتا ہے

ہم صرف خدائی خدمت گار رہیں گے

ہم نیچے درج شدہ لوگ جو آج تک کانگرس (قومی جرگے) کے ممبر تھے اعلان کرتے ہیں کہ آج سے بعد ہم صرف خدائی خدمت گار رہیں اور کانگرس کی ممبرشپ سے استعفیٰ دیتے ہیں اس لیے کہ ہمارے راہنما فخر افغان نے کانگرس سے اس لیے استعفیٰ دیا ہے کہ کانگرس نے عدم تشدد کا راستہ چھوڑ کر تشدد کا راستہ پسند کر لیا ہے اور ہم خدائی خدمت گار عدم تشدد کے راستہ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس لیے کہ ہماری تحریک خدائی خدمتگار کا بنیادی اصول عدم تشدد ہے اور ہمارا مضبوط عقیدہ ہے کہ ہمارے ملک اور قوم کا فائدہ عدم تشدد ہی میں ہے۔

محمود خان صوبائی ممبر، عبدالمالک خان صوبائی ممبر، میاں جعفر شاہ ایم ایل اے صوبائی ممبر، ارباب عبدالغفور خان خلیل ایم ایل اے، راحت خان سماکوٹی صوبائی ممبر، مولاداد خان بانڈہ خیرو صوبائی ممبر، امیر محمد خان ایم ایل اے، مہردل خان ممبر حلقہ کمیٹی، محمد حیات گل ممبر جرگہ کمیٹی، فضل کریم ممبر حلقہ کمیٹی، آزاد خان ممبر حلقہ کمیٹی، شیر دل خان ممبر حلقہ کمیٹی، شاد محمد خان ممبر حلقہ کمیٹی، امیر جان ممبر حلقہ کمیٹی، فقیر محمد خان ممبر حلقہ کمیٹی، سمیع اللہ خان ممبر حلقہ کمیٹی، عبدالرحیم ممبر حلقہ کمیٹی، روخان شاہ ممبر حلقہ کمیٹی۔

ان اعلانات نے اتنا طول کھینچا کہ آخر باچا خان کو تنگ آ کر اعلان کرنا پڑا کہ چونکہ جماعتی طور پر کانگرس سے علیحدگی کا فیصلہ ہو چکا ہے اس لیے انفرادی استعفیٰ شائع کرنے یا میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

باچا خان کے اس اقدام نے ایک طرف ان لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت

بڑھا دی تو دوسری طرف مخالفین کو اپنے اس اعتراض کا کہ وہ کانگرس کے ہاتھوں بک چکے ہیں عملی جواب مل گیا اور انہیں بے حد نادم ہونا پڑا۔ درحقیقت باچا خان کے کردار کی یہ ایک بہت بڑی خوبی تھی کہ جس جماعت کے ساتھ رہ کر انہوں نے قربانیاں دیں اور جس کی وجہ سے اپنوں بیگانوں کے طعن و تشنیع کا ہدف بنے اور جس کے سربراہوں سے اُن کے ناقابل شکست ذاتی مراسم تھے وہی جماعت جب اُن کے اصولوں کی راہ میں حائل ہونے لگی تو وہ فوراً اسے چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

باچا خان نے حکومت کو بتایا کہ وہ دھڑے بندی میں بکنے والا شخص نہیں بالکل اپنے اصول کا سچا اور ہٹ کا پکا ہے انہوں نے کانگرس پر ثابت کر دیا کہ سرحدی عوام کے وہ بلا شرکت غیرے واحد رہنما ہیں اور یہ تنظیم کانگرس کے نام سے ہو یا ——— خدائی خدمت گار کے نام سے ——— جدھر اُن کا رہنما ہو گا یہاں کے عوام ادھر ہی ہوں گے۔

انہوں نے اقتدار پرستوں پر واضح کر دیا کہ ہم وزارتوں کے بھوکے نہیں ہم نے محض عوام کی خدمت کے لیے یہ کرسیاں قبول کیں اور جب ہمیں دوبارا حکومت سے ٹکر لینا پڑی تو ہم وزارتوں کو ٹھوکر مار کر میدان میں کود پڑے۔

مہاتما گاندھی باچا خان کی اس اصول پرستی سے بڑے متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے اخبار ہریجن میں لکھا۔

"کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اکثر ممبر اپنے عقیدوں سے پھسل گئے لیکن ایک باچا خان تھا جو پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر محکم رہا اسے اپنا آپ اچھی طرح معلوم تھا اور اس کا بیان جو اس نے ورکنگ کمیٹی

سے مستعفی ہوتے وقت دیا بہت سے بھائیوں کی آنکھیں کھول دے گا

بادشاہ خان فرماتے ہیں

کہ میرا اور کانگرس کا راستہ اس وجہ سے جدا ہوا کہ کانگرس نے تشدد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور ہمارے خدائی خدمت گاروں کا راستہ عدم تشدد ہے۔ ہمارے خدائی خدمت گاری کے اصول دوسروں کے زور و ظلم کو برداشت کرنا ہے نہ کہ دوسروں کو تکلیف پہنچانا پٹھانوں کے متعلق یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ تلواروں بندوقوں اور جنگوں میں پلتے ہیں پر یہ ایک دوسری قسم کا پٹھان ہے اُس نے اپنے سارے ساتھیوں دوستوں اور بھائیوں سے کہا ہے کہ ہر قسم کا اسلحہ پھینک دو اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ ----- اب نہیں اب سے بیس سال پہلے جب کہ رولٹ بل معرض وجود میں آیا تھا اسے اپنی قوم کا اچھی طرح علم تھا اور وہ اس بات کو بھی سمجھتا تھا کہ پٹھانوں کا بھائی چارہ گھر اور خاندان صرف ہتھیاروں کے ہاتھوں برباد ہیں پٹھانوں کا غصہ اور انتقام پشتوں تک چلتا ہزاروں لوگ ہر سال بے گناہ قتل ہوتے اس کا دوسرا کوئی علاج ہی نہ تھا۔

باچا خان نے جو صبر محنت اور بھائی بندی کا راستہ پٹھانوں کو دکھایا ہے سوائے اس ایک راستے کے پٹھانوں کے لیے ان لعنتوں سے خلاصی کا دوسرا کوئی راستہ نہ تھا اور جب انہوں نے صبر کی جنگ شروع کی تو ساری دنیا پر ثابت کر دیا کہ صبر کی جنگ ڈرپوکوں کی نہیں بلکہ بہادروں کی جنگ

ہے ..... ان سب باتوں کو اگر ہم دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ باچا خان کے لیے سوائے استعفیٰ دینے کے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا اس لیے کہ اس نے صبر محنت اور بھائی بندی کا سبق دیا ہے تو اب وہ انہیں کس طرح یہ کہے کہ آپ ہتھیار لے کر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں وہ اپنے بھائیوں کو یہ راستہ کیسے بتا سکتا ہے کہ وہ فوج میں بھرتی ہو کر تلواریں اور بندوقیں اٹھائیں، اس بات کو تو ہر پٹھان بچہ بھی سمجھتا ہے کہ جس طرح ان کا اپنا گھر تشدد اور دشمنیوں کی وجہ سے برباد ہے بالکل اسی طرح یورپ کا حال بھی ہے وہ پرانی دشمنیوں کے غصے ایک دوسرے پر اتار رہے ہیں۔

یہ میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ باچا خان کے ..... اس کی اس صبر کی جنگ میں کتنے ساتھی ہیں مگر میں اس کے متعلق پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ باچا خان کی پالیسی نہیں بلکہ عقیدہ ہے کہ اس کی غریب اور بیکس قوم کا فائدہ محبت بھائی بندی اور صبر ہی میں ہے اس کا اگر کوئی ساتھ دے یا نہ دے وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا اس لیے کہ وہ ایک خدا کا بندہ ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ دیانتدار اور سچے لوگ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ باچا خان نے ایک سال سے زیادہ عرصہ گزارا ہے اس عرصہ میں اس نے کوئی نماز قضا نہیں کی اور نہ کبھی ایک روزہ تک کھایا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کو حقیر نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ نہیں بلکہ اس نے گیتا بھی پڑھی ہے وہ ایک راستہ کا آدمی ہے زیادہ بات چیت اور بحث مباحثوں سے تنگ ہوتا ہے

اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو یہ سچائی، ایمانداری، محبت اور صبر کی جیت ہوگی۔"

باچاخان اور قبائل

صوبہ سرحد کے آزاد قبائل کو منظم کرنے انہیں تعلیم و تربیت سے بہرہ ور کرنے اور تہذیب و تمدن سے متعارف کرانے کا باچاخان کو شروع ہی سے احساس تھا چنانچہ انہوں نے ابتدا میں اپنے گاؤں اتمان زئی میں جو آزاد مدرسہ قائم کیا اس میں بہت سے قبائلی بچے بھی حصول تعلیم کے لیے آکر داخل ہوئے اور اس کے بعد بھی انہوں نے قبائل سے اپنا رابطہ رکھنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ لیکن انگریز حکمران یہ بات نہیں چاہتے تھے اور باچاخان کی ان سرگرمیوں کو شکوک و شبہات کی نظروں سے دیکھتے ہوئے ان کے راستے میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کرتے رہے۔

اس خوفناک حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ انگریز بھیڑیوں نے آزاد قبائل کے علاقے کو اپنے رنگروٹ فوجیوں کے لیے ایک ٹریننگ سنٹر اور ایک وسیع شکارگاہ بنا رکھا تھا جہاں نشانہ بازی کے تجربے اور چاند ماری کی مشق کے لیے انہیں بھیج دیا جاتا اور وقتاً فوقتاً ہوائی جہازوں کی بم باری کے تجربے بھی کیے جاتے تھے۔

باچاخان نے آزاد قبائل کے متعلق یوں اظہار خیال فرمایا ہے۔

"بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے قریب آزاد قبائل آباد ہیں اور اگر ملک میں کوئی ہنگامہ ہوا تو وہ حملہ کرکے ہمیں نقصان پہنچائیں گے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بات درست نہیں آزاد قبائل کے لوگ ہمارے بھائی ہیں ان کی ہم سے کوئی دشمنی نہیں بلکہ انہیں نہایت چالاکی سے ہم سے جدا کیا گیا ہے اور ہمیں یہ موقع نہیں دیا گیا کہ ہم انہیں سمجھا سکیں کہ

ہم تم بھائی بھائی ہیں، غیر نہیں ..... بے شک ان کے بعض کام اچھے نہیں لیکن اچھے اور بُرے لوگ تو ہر قوم میں موجود ہیں اور اگر یہ بات درست بھی ہے تو دنیا کی کونسی ایسی مشکل ہے جس کا حل نہ ہو، کونسا مرض ہے جس کا علاج نہیں ..... ہم اس بات کا حل سوچ سکتے ہیں بشرطیکہ نیک نیتی کے ساتھ اس کے لیے ہمیں موقع دیا جائے۔

لیکن انگریز حکومت نے مختلف اوقات میں مختلف بہانے بنا کر ان پر مشق ستم جاری رکھی، کبھی اُن پر سرکاری حدود میں لُوٹ مار کے الزامات لگائے گئے، کبھی قبائلی علاقوں میں سڑکیں بنانے کی مہم شروع کی گئی، غرض کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ عہد انگریزی میں ہمیشہ جاری رہا۔ ۱۹۳۹ء کے اواخر میں جب برطانوی سامراج نے وزیرستان کے بے گناہ انسانوں پر ہوائی جہازوں کے ذریعے شدید بمباری کی اور توپوں، مشین گنوں اور بندوقوں کے ذریعے ان غریبوں پر آگ کا مینہ برسایا تو اس ظلم و استبداد کے خلاف پشاور کے سیاسی حلقوں میں بڑی ہلچل پیدا ہو گئی۔

یہاں کے سیاسی رہنماؤں نے حکومت کو اس وحشت و بربریت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور عوام کو حکومت کی اس بے رحمی سے آگاہ کرنے کے لیے جلسے کیے۔ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی مرحوم کو بنوں کے ایک جلسہ میں تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے پانچ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

انگریزوں کی اس وحشیانہ گولہ باری کا ردِ عمل یہ ہوا کہ آزاد قبائل کے لوگ مشتعل ہو کر انتقام پر اُتر آئے اور موقع پا کر انگریزی علاقے میں ڈاکے ڈالنے شروع کیے، لوٹ مار کی وارداتیں عام ہونے لگیں اور لوگوں میں بدامنی اور پریشانی پھیل گئی۔

انگریز اس چیز کی آڑ لے کر سرحدی علاقے پر سختی کرنے لگے اور سیاسی تحریکوں کو نقصان پہنچنے لگا، باچا خان کو اس سے سخت تشویش ہوئی اور انہوں نے باہمی صلاح و مشورہ سے ایک سیاسی رہنماؤں کا وفد آزاد قبائل میں بھیجنا چاہا جو وہاں جاکر اُن سے دوستانہ بات چیت کرے اور اس سلسلے کو کسی نہ کسی طرح بند کرائے لیکن حکومت نے انہیں یہ وفد وہاں بھیجنے کی اجازت نہ دی۔ اس واقعہ کو باچا خان خود یوں بیان کرتے ہیں۔

"سرحد کے ڈاکوؤں کے متعلق ہماری جماعت نے موجودہ گورنر کے پاس ایک وفد بھیجا کہ ہم یہ وارداتیں برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کے ساتھ اس کام میں تعاون کرنے کو تیار ہیں آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنی ذمہ داری پر قبائل میں جاؤں اور جس شخص پر آپ کو پورا اعتماد ہو اُسے میرے ہمراہ کر دیں میں نے گورنر کو یہ بھی یقین دلایا کہ میں قبائلیوں میں حکومت کے خلاف کوئی معاندانہ پروپیگنڈہ نہیں کروں گا۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ گورنر کی صدارت میں وزیرستان کے سرداروں کا ایک جلسہ بلایا جائے اور اس مسئلہ پر غور و فکر کی جائے لیکن گورنر نے یہ دونوں تجویزیں نامنظور کر دیں"

اس کے بعد باچا خان نے تمام حالات آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو لکھ کر بھیج دیئے چنانچہ وہاں کافی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ وہ اپنے دو رہنماؤں کو وزیرستان بھیجیں جو وہاں کے سرداروں سے مل کر معاملات کو سلجھائیں لیکن اس تجویز کو بھی حکومت نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور ایک عرصہ تک ڈاکے بدستور پڑتے رہے اور انگریز پروپیگنڈا کرتے رہے کہ اہل سرحد ہندوؤں کو لوٹ رہے ہیں اور ان پر ڈاکے ڈال رہے ہیں حالانکہ قبائلیوں

کے اس انتقام کا شکار ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی کو ہونا پڑا لیکن ہندوؤں کے لٹنے کو زیادہ اہمیت دی گئی اور اسے متعصب اخبارات کے ذریعے ہوا دے کر نفرت پھیلائی گئی ملک آزاد ہونے کے بعد گذشتہ دس برسوں میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ قبائلیوں نے کسی پاکستانی علاقے پر ڈاکہ وغیرہ ڈالا ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قبائلیوں کا یہ اقدام محض انگریز دشمنی کی وجہ سے تھا اور انگریز حکمرانوں کی غلط جارحانہ پالیسی کا لازمی نتیجہ تھا

خدائی خدمت گار تحریک

کا

دُوسرا دَور

باچا خان کی کانگرس میں دوبارہ شمولیت

باچا خان نے اصولی اختلاف پر کانگرس سے علیحدگی اختیار کرتے وقت فرمایا تھا کہ آخر سچائی کی فتح ہوگی ادھر گاندھی جی نے بھی باچا خان کے موقف کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر باچا خان کامیاب ہو گئے تو یہ سچائی، ایمانداری، صبر اور محبت کی جیت ہوگی۔

آخر ابھی ہوا زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ آل انڈیا کانگرس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا انہوں نے جنگ عظیم میں انگریزوں سے تعاون کرنے کی تجویز واپس لیتے ہوئے اپنے اس فیصلے پر پشیمانی کا اظہار کیا اور آئندہ عدم تشدّد کے اصولوں پر پابند رہتے ہوئے حکومت سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا۔

باچا خان کی یہ حیرت انگیز کامیابی تھی اور ان کی فراست، دانائی اور دوراندیشی کی ایسی نادر مثال تھی جس کا قائل ہوتے ہوئے ہندوستان کے بڑے بڑے جغادری لیڈروں کو باچا خان کے سامنے جھکنا پڑا۔ چنانچہ اس موقع پر باچا خان نے خدائی خدمت گاروں اور اپنے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا . . .

"آپ کو معلوم ہو گا کہ ۷ جولائی کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے دہلی میں اور

جولائی کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے پونا میں ایک قرارداد پاس کی تھی جس میں عدم تشدد کے بجائے تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا تھا چونکہ میرا عقیدہ اور راستہ عدم تشدد ہے تو اس لیے ہمارے خدائی خدمت گاروں اور کانگرس کے راستوں میں علیحدگی آگئی اور میں نے کانگرس سے استعفیٰ دے دیا تھا اب جب کہ ۱۵ دسمبر کو بمبئی میں کانگرس ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے پھر عدم تشدد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور دہلی کی تجویز پر پشیمانی کا اظہار کر دیا ہے تو اس وجہ سے خدائی خدمت گاروں اور کانگرس کا راستہ پھر ایک ہی ہو گیا ہے۔

کانگرس کمیٹیوں کی مثال ''سول'' کی ہے اور خدائی خدمت گاروں کی مثال ایک فوج کی ہے اگرچہ دونوں جماعتوں کے مقاصد میں کوئی فرق نہیں لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ''سول'' کے لیے علیحدہ لوگ ہوتے ہیں۔ اور فوج کے لیے علیحدہ ...... یعنی سول کا علیحدہ نظام ہوتا ہے اور فوج کا علیحدہ ... اس طرح ہمارے جو بھائی جرگوں کے ممبر ہیں وہ صرف کمیٹیوں ہی کے کام کریں گے اور جو کہ خدائی خدمت گار ہیں وہ خدائی خدمت گار ہی رہیں گے ایک شخص دونوں کام نہیں کر سکتا البتہ جو شخص جرگے سے خدائی خدمت گاری کی طرف آنا چاہے تو وہ شخص پہلے جرگہ سے استعفیٰ دے گا اور اگر جرگہ کا ممبر بننا چاہے تو وہ خدائی خدمت گاری سے مستعفی ہو گا لیکن یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ کسی بھی حال میں ایک جرگہ کا ممبر خدائی خدمت گار نہیں بن سکتا اور نہ ہی ایک خدائی خدمت گار (کانگرس کمیٹی)

باچا خان کی کانگرس میں دوبارہ شمولیت

باچا خان نے اصولی اختلاف پر کانگرس سے علیحدگی اختیار کرتے وقت فرمایا تھا کہ آخر سچائی کی فتح ہوگی ادھر گاندھی جی نے بھی باچا خان کے موقف کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر باچا خان کامیاب ہو گئے تو یہ سچائی، ایمانداری، صبر اور محبت کی جیت ہوگی۔

آخر یہی ہوا زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ آل انڈیا کانگرس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا انہوں نے جنگ عظیم میں انگریزوں سے تعاون کرنے کی تجویز واپس لیتے ہوئے اپنے اس فیصلے پر پشیمانی کا اظہار کیا اور آئندہ عدم تشدد کے اصولوں پر پابند رہتے ہوئے حکومت سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا۔

باچا خان کی یہ حیرت انگیز کامیابی تھی اور ان کی فراست، دانائی اور دوراندیشی کی ایسی نادر مثال تھی جس کا قائل ہوتے ہوئے ہندوستان کے بڑے بڑے جغادری لیڈروں کو باچا خان کے سامنے جھکنا پڑا۔ چنانچہ اس موقع پر باچا خان نے خدائی خدمت گاروں اور اپنے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا . . .

"آپ کو معلوم ہوگا کہ ۷ر جولائی کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے دہلی میں اور

جولائی کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے پونا میں ایک قرارداد پاس کی تھی جس میں عدم تشدد کے بجائے تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا تھا چونکہ میرا عقیدہ اور راستہ عدم تشدد ہے تو اس لیے ہمارے خدائی خدمت گاروں اور کانگرس کے راستوں میں علیحدگی آگئی اور میں نے کانگرس سے استعفیٰ دے دیا تھا اب جب کہ ۱۵ دسمبر کو بمبئی میں کانگرس ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے پھر عدم تشدد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور دہلی کی تجویز پر پشیمانی کا اظہار کر دیا ہے تو اس وجہ سے خدائی خدمت گاروں اور کانگرس کا راستہ پھر ایک ہی ہو گیا ہے۔

کانگرس کمیٹیوں کی مثال "سول" کی ہے اور خدائی خدمت گاروں کی مثال ایک فوج کی ہے اگرچہ دونوں جماعتوں کے مقاصد میں کوئی فرق نہیں لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ "سول" کے لیے علیحدہ لوگ ہوتے ہیں۔ اور فوج کے لیے علیحدہ ..... یعنی سول کا علیحدہ نظام ہوتا ہے اور فوج کا علیحدہ ..... اس طرح ہمارے جو بھائی جرگوں کے ممبر ہیں وہ صرف کمیٹیوں ہی کے کام کریں گے اور جو کہ خدائی خدمت گار ہیں وہ خدائی خدمت گار ہی رہیں گے ایک شخص دونوں کام نہیں کر سکتا البتہ جو شخص جرگے سے خدائی خدمت گاری کی طرف آنا چاہے تو وہ شخص پہلے جرگے سے استعفیٰ دے گا اور اگر جرگہ کا ممبر بننا چاہے تو وہ خدائی خدمت گاری سے مستعفی ہو گا لیکن یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ کسی بھی حال میں ایک جرگہ کا ممبر خدائی خدمت گار نہیں بن سکتا اور نہ ہی ایک خدائی خدمت گار (کانگرس کمیٹی)

جرگہ کا ممبر نہ بن سکتا ہے اور نہ ہی ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت کرے گا اور نہ ہی ووٹ دے سکے گا جرگے اپنے فارم الف کے قواعد اور قانون کے مطابق کام کریں گے اور خدائی خدمت گار اپنے قانون اور قواعد کے زیر اثر رہیں گے میرا تعلق دونوں کے ساتھ ہوگا۔ پہ میں خدائی خدمت گار ہی رہوں گا اور میرا سارا وقت خدائی خدمتگاروں کی خدمت اور اصلاح کے لیے وقف ہوگا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ خدائی خدمت گاری پاک اور صاف ہو اور نام کے بجائے کام اور عمل کی خدائی خدمت گاری پیدا ہو اس لیے کہ میرا یہ عقیدہ ہے۔ کہ پٹھانوں کا یہ برباد ویران گھر صرف سچی خدائی خدمت گاری کی برکت ہی سے آباد ہو سکتا ہے۔

(عبدالغفار پختون یکم اکتوبر ۴۰ء ۱۹)

"خدائی خدمت گار تحریک کا پہلا دور وہ تھا جب ۱۹۳۰ء میں اتمان زئی کی عظیم الشان کانفرنس میں اس کی بنیاد ڈالی گئی لیکن اس تحریک کی قسمت ہی کچھ ایسی تھی کہ سر اٹھاتے ہی اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور ۱۹۳۰ سے ۱۹۴۰ء تک اس پورے دس برس کی عمر میں ایک دن کے لیے بھی اسے آرام اور سکون نصیب نہ ہو سکا۔ دشمنوں نے چاہا کہ اسے پیدا ہوتے ہی کچل کر رکھدیا جائے تاکہ اس ننھے سے معصوم پودے کو نشو و نما پانے اور پھولنے پھلنے کا موقع ہی نہ ملنے پائے اور اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے انہوں نے ظلم و ستم اور استحصالیت سے کام لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان دس برسوں میں تقریباً چھ برس تو یہ تحریک صوبہ سرحد میں خلاف قانون رہی اس

کمپیروؤں پر وہ وہ قیامتیں توڑی گئیں کہ پناہ بخدا ______

تصدق احمد خان شیروانی مرحوم نے سنٹرل اسمبلی میں خدائی خدمت گار تحریک سے پابندی ہٹانے کے ایک رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں اپنی تقریر میں فرمایا تھا۔

"برطانوی حکومت نے خدائی خدمت گاروں پر ایسے ایسے شرمناک مظالم توڑے ہیں کہ دورِ وحشت میں بھی ان کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ گاؤں کا محاصرہ کیا اور جا کے اس مکان پر قبضہ کر لیا جہاں خدائی خدمت گاروں کا دفتر تھا نہ صرف گھر پر قبضہ کیا بلکہ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ محترم فارن سیکرٹری کے سامنے اس کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ ان ظالموں نے خدائی خدمتگاروں کو چھت سے نیچے پھینک دیا ان میں سے اکثر کی ٹانگیں بازو اور سر ٹوٹ گئے نہ صرف یہ بلکہ دفتر جلا کر راکھ کر دیا گیا اور اس کے باوجود حکومت کہتی ہے کہ خدائی خدمت گار تشدد کے حامی تھے اس لیے انہیں ضرور سزا ملنی چاہیے"

اس پر فارن سیکرٹری مسٹر ایچ لے ایف مٹکاف اُٹھے اور انہوں نے کہا

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہاں گورنمنٹ کی طرف سے کچھ افسوس ناک تشدد کے واقعات ہوئے ہیں میں بالکل تسلیم کرتا ہوں میں اس کے لیے بہت زیادہ افسوس کرتا ہوں میں بہت جلد موقع پر جا کر ان کارروائیوں کو قطعی روک دوں گا"

اس کے بعد مسٹر شیروانی نے مزید کہنا شروع کیا "جون کے مہینے میں پولیس نے

دیہات کو گھیر دیا لوگوں کو باہر نکالا اور انہیں جلتی ہوئی دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا نہ صرف یہ بلکہ بھاری پتھر اُن کی گردنوں میں باندھ کر انہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کے لیے مجبور کیا گیا" انہوں نے مزید کہا ۔ اور یہ سلوک ان لوگوں سے کیا گیا جن کے متعلق مولانا شوکت مرحوم نے کہا تھا "تمام ملک کے لوگوں سے بہتر صوبہ سرحد کے لوگ ہیں یہ طاقت ور، صحت مند، خوبصورت اور بہادر ہیں"

(رپورٹ سنٹرل اسمبلی ۱۹۳۰ء جلد اول)

لیکن اس تحریک کا یہ ننھا سا پودا بڑا سخت جان نکلا وہ اپنے ہی خون سے پھولتا پھلتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک تن آور درخت بن گیا جن کی شاخیں سارے صوبے میں پھیل گئیں اور اسے نیست و نابود کرنے والوں کے سارے منصوبے خاک میں مل کر رہ گئے ۔

یہ ننھا پودا جو آگ کے سمندر میں پل کر جوان ہوا یہ گویا جو طوفان اور جھکڑوں میں چلنے کا عادی بنا، یہ بے سہارا سفینہ جو خونخوار لہروں کے ریلوں اور بے رحم سیلابوں کے تھپیڑوں میں رواں دواں رہا ۔

اب زمانے کے سرد و گرم نے اسے اتنا سخت جان بنا دیا تھا کہ حوادث کا سامنا اس کے لیے بچوں کا کھیل تھا اور باد مخالف کے تیز و تند جھونکے اس کی تفریح کا سامان بن چکے تھے ۔

لیکن طاقتور دشمن اپنے آزمائے ہوئے بازوؤں کو ایک دفعہ پھر آزمانے کا تہیہ کر چکا تھا اور اب کے دم پہلے سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا

ادھر خدائی خدمت گار تحریک کا بوڑھا جرنیل باچا خان بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا اس کا آزمودہ کار ذہین اور تجربہ کار نظریں فوراً دشمن کی نیت کو بھانپ گئیں اور اس نے اس دفعہ اپنے بچاؤ کے لیے نئے نئے مورچے بنانے شروع کر دیئے۔ اپنی جماعت کو نئے طریقہ سے منظم کیا اور نئے محاذ پر لڑنے کے لیے بالکل نئے انداز سے رضاکاروں کی صفیں آراستہ کرنی شروع کیں۔

باچا خان نے تحریک کو زیادہ مؤثر زیادہ مضبوط، زیادہ منظم بنانے کے لیے اب اپنے گاؤں اتمان زئی کے قریب "سردریاب" کے نام سے اپنا ایک مرکز بنایا جہاں رضاکاروں کو ٹریننگ دینے کے لیے نئے ڈھب سے کام شروع کیا ان کے مختلف گروپ بنائے اور اتنے زور شور سے کام شروع کیا کہ اس بڑھتی ہوئی تنظیم اور بیداری سے حکومت کے ایوان لرز اٹھے اور انگریزوں کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا۔

اختلافات ختم ہونے کے بعد باچا خان دوبارہ کانگرس میں شامل ہو گئے، اب کانگرس حکومت سے عدم تعاون کا فیصلہ کر چکی تھی اور ٹکراؤ کے امکانات صاف نظر آ رہے تھے۔ جس کے لیے باچا خان نے ابھی سے تیاریاں شروع کر دیں اب وہ ایک نئی تنظیم اور نئے انداز سے میدان میں آنا چاہتے تھے، پرانے حربوں میں انہیں جو کمزوریاں اور خامیاں نظر آئیں نئے تجربے میں ان سے جان بچانا اور اپنی قوت بڑھانا ان کا مقصد تھا اس کے لیے انہوں نے ایک نیا پروگرام بنایا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے انتھک مہم شروع کر دی اس سلسلہ کی پہلی تقریر جو آپ نے خدائی خدمتگاروں کے عظیم الشان اجتماع میں کی اس سے آپ کے عزائم پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

بھائیو! آپ لوگوں کو پختون رسالہ کے مطالعہ اور عام جلسوں میں میری تقریر سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ میں نے ایک نئے تجربہ کا ارادہ کیا ہے اس سلسلہ میں میرے دماغ میں کچھ نئے خیالات پیدا ہوئے ہیں اور مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہم پرانے راستے سے اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے مگر اس بات کو سمجھو کہ میرا یہ نیا تجربہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ حقیقت میں وہی خدائی خدمت گار تحریک ہے جو ہم نے ۱۹۳۰ء میں شروع کی تھی۔

آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری دوستی میں غم و آلام کے سوا کچھ نہیں ہیں جس راستے کا مسافر ہوں وہ کانٹوں سے اٹا پڑا ہے۔ میری دوستی صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے اپنی جانوں کو خاک میں ملانے کو تیار ہوں اس راہ میں صدارتیں نہیں، جرنیلیاں نہیں، ڈسٹرکٹ بورڈ اور اسمبلی کی ممبریاں بھی نہیں اور نہ ہی اس میں وزارتیں ہیں بلکہ قربانی اور صرف قربانی ہے، مصائب و آلام کو برداشت کرنا ہے، دینا ہے لینا ہرگز نہیں ہے، اور اس وقت تک کہ یہ بد قسمت ملک کامل طور پر آزاد نہ ہو جائے اور حکومت کے تمام اور ہر قسم کے اختیارات ہمارے ہاتھوں میں نہ آجائیں، اس لیے میری دوستی کرنے میں آپ جلد بازی سے کام نہ لیں بلکہ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں، غور و فکر کرلیں ایک آدمی کے لیے یہی ضروری

نہیں ہے کہ وہ فارم کو پر کر کے سُرخ کپڑے زیب تن کر لے صرف فارم پر کرنے اور کپڑے سُرخ کرنے سے کوئی میرا دوست نہیں بن سکتا میں نے اکثر آپ لوگوں کو یہ کہاوت سنائی ہے کہ سانپ کا کاٹا رسی سے بھی ڈرتا ہے اس لئے کم از کم آپ لوگوں کو یہ بات ضرور سمجھانا چاہتا ہوں کہ میں اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ جس درخت نے پٹھانوں کے خون سے پرورش پائی ہے اور جس کے لیے قوم کے مردوں اور عورتوں نے قسم قسم کی جانی اور مالی قربانیاں دی ہیں آج اُسے میری آنکھوں کے سامنے کلہاڑیوں سے کاٹا جائے اور لوگ اسے برباد کریں اور اس کی جڑوں کو کھودیں اس لیے میں اس مرتبہ بہت سوچ اور فکر سے کام کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں سانپ کا ڈسا ہوا ہوں اور رسی سے بھی خوف کھاتا ہوں جو شخص پارٹی بازی ترک نہیں کر سکتا اور آپس کی دشمنی اور بغض و عداوت کو نہیں چھوڑتا ظلم اور جبر سے باز نہیں آسکتا اور ظلم و زیادتی برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا پچھے اخلاق اور نیک عادتیں اور ایمانداری و دیانت داری پیدا نہیں کر سکتا میں اس سے صاف صاف کہوں گا کہ صرف زبانی کہنے سے تو میں کسی کو اپنا دوست بنانے کے لیے تیار نہیں۔

جو شخص بھی میری دوستی کا طلب گار ہے وہ پہلے میرے پاس آئے اور مجھ سے تبادلۂ خیالات کرے اور خدائی خدمتگاری کے لیے تیار ہو اور ان شرائط کی پابندی کر سکتا ہو جن کے پابند کو میں سچا خدائی

خدمت گار مانتا ہوں تو وہ میری دوستی کے لیے تیار ہو جائے اور عمل شروع کر دے مگر پھر بھی میں اسے اپنی دوستی میں اس وقت تک نہ لوں گا جب تک میں اس کے بھائی اس کے عزیزوں رشتہ داروں اور ہمسایوں سے دریافت نہ کروں گا کہ اس کے ہاتھوں کسی کو آزار تو نہیں پہنچا۔ اور خدمت خلق کسی فائدے کے لیے تو نہیں کرتا اور خدائی خدمت گاری کے تمام اصولوں کا پابند ہے یا نہیں اس کے بعد میں اسے اپنا دوست بناؤں گا۔

آپ لوگ کچھ غور و فکر کریں کہ ہم خدائی خدمت گار ہیں یا وہ لوگ جو ہر جگہ ہماری خدمت کرتے ہیں جہاں ہم جاتے ہیں وہ ہمارے لیے چارپائیاں لاتے ہیں کھانے کو روٹی اور چائے دیتے ہیں وضو کے لیے پانی پیش کرتے ہیں غرض ہماری جو بھی ضروریات ہوتی ہیں ان سب کو یہ لوگ مہیا کرتے ہیں اور اس میں خوشی اور مسرت محسوس کرتے ہیں ایسی حالت میں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ خدائی خدمت گار ہم ہیں یا وہ لوگ ..... میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میں اپنی اس نئی دوستی میں اس شخص کو لوں گا جو خدا کی مخلوق کا خدمتگار ہو اور اپنی خدمت دوسروں سے نہ کراتا ہو۔

میں نے ارادہ کیا ہے کہ خدائی خدمتگاروں کی تربیت کے لیے ایک مرکز تیار کروں جس میں میں خود بھی رہوں گا اور میرے نئے خدائی خدمتگار بھی درجہ بدرجہ وہاں رہائش اختیار کریں گے۔

پہلا درجہ ان خدائی خدمت گاروں کا ہوگا جو میرے ساتھ اس مرکز میں رہیں گے اور جنہوں نے اپنا تمام وقت اس کام کے لیے وقف کیا ہوگا اس مرکز میں ایسا انتظام کیا جائے گا کہ ہم اپنی ضروریات کو محنت مشقت کرکے خود ہی پیدا کر لیا کریں کیونکہ ایک خدائی خدمت گار کے لیے بیکار رہنا مناسب نہیں اور سچا خدائی خدمت گار وہ ہے جو مرد کی طرح دنیا میں کام کرے اور اپنے ہاتھ پاؤں کی مشقت سے خود کو پالے اور دوسروں کا محتاج نہ ہو۔

دوسرے درجہ میں ایسے خدائی خدمت گار ہوں گے جو کچھ عرصہ اس مرکز میں تربیت حاصل کریں گے اور اس کے بعد باہر دوروں پر جائیں گے اور خدائی خدمت گاری کی تبلیغ کریں گے یہ لوگ اپنا گذارہ بھی خود کرینگے تیسرے درجہ میں ان لوگوں کو لیا جائے گا جو خدائی خدمت گاری کے اصولوں سے اپنے آپ کو واقف کریں اور اس کے بعد اپنا کاروبار کریں یہ لوگ تبلیغ و اشاعت کا کام زیادہ تر نہیں کریں گے لیکن خدائی خدمتگاری کے اصولوں کے پابند رہینگے اور کوئی ایسا کام نہ کریں گے جو ان اصولوں کے خلاف ہو۔

بھائیو! دنیا میں کسی قوم کو بیدار کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے مگر قوم کا بنانا بہت مشکل کام ہے اور یہ بغیر اچھی تربیت کے نہیں ہو سکتا۔ بیداری تو تھوڑے ہی عرصہ میں پٹھانوں میں اس حد تک پیدا ہو گئی ہے کہ ہندوستان کی کسی اور قوم میں نہیں مگر اس بیداری سے فائدہ اٹھانا

اچھی تربیت پر منحصر ہے، وقت آگیا ہے کہ ہم قوم کی تربیت کا کام اپنے
ہاتھوں میں لیں اور اسے ایسی تربیت دیں جس کی اسے ضرورت ہے
میں یہ بات پھر کہتا ہوں کہ کسی خدائی خدمت گار کو بے کار نہیں رہنا
چاہیے اور ایسے شخص کو خدائی خدمت گار کہنا درست نہیں جو اپنے
ہاتھ سے کوئی کام یا کسب نہیں کرتا۔ خصوصاً میرے ساتھی اور سنئے
خدائی خدمت گاروں کو تو اس بات کا پختہ عہد کرنا چاہیے کہ وہ اپنے
تمام کام خود اپنے ہاتھوں سے کریں گے اور مہینے میں ایک روز
ایسا کام کریں گے جس کا فائدہ قوم کو پہنچے یعنی خدا کے لیے اور اپنی
قوم کی بھلائی کے لیے کام کریں گے اگر اس قسم کے لوگ ہر گاؤں میں ایک
ایک دو دو بھی پیدا ہو جائیں جو صحیح طور پر خدائی خدمتگار ہوں اور خدا کی
مخلوق کے ساتھ محبت رکھتے ہوں اور بغیر کسی لالچ کے ہر انسان کے غم و رنج
اور خوشی میں شریک ہوتے ہوں تو مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں کے نمونہ کو
دیکھ کر گاؤں کے دوسرے لوگ بھی اسی رنگ میں رنگے جائیں گے اور بہت
سے لوگ ان کی تقلید شروع کر دیں گے اور تمام قوم کے درمیان رشتۂ
محبت استوار ہو جائے گا اور اس طرح وہ تنظیم خود بخود ہو جائے گی
جس کی میں آرزو اور تمنا رکھتا ہوں اور ایک مدت سے میں جس دور کا
خواب دیکھ رہا ہوں وہ سچ مچ آجائے گا۔ موجودہ حالت میں ہمارا رنگ
لوگوں پر اس لیے نہیں چڑھتا کہ ہم خود بے رنگ ہیں ۔

(عبدالغفار پختون جون ۱۹۳۱ء)

سردریاب میں قومی مرکز کا افتتاح

ایک عرصہ کی جدوجہد کے بعد آخر ۲۳ جولائی ۱۹۴۰ء کو باچا خان نے اپنے گاؤں اتمان زئی کے قریب موضع "سردریاب" میں خدائی خدمت گاروں کے لیئے قومی مرکز کے لیئے جگہ منتخب کرلی اور پھر کے لیئے ایک ستون گاڑ کر اس تاریخی قومی مرکز کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا۔

"بھائیو! آج ہماری مدت کی آرزو پوری ہوگئی۔ ہم یہاں اپنے مرکز کا افتتاح کرنے کے لیئے جمع ہوئے ہیں۔ جس کے لیئے ہم ایک عرصے کوشش کر رہے تھے مجھے صورت حالات سے یہ معلوم ہو رہا ہے۔ کہ اب تک ہمیں اپنے مقصد میں اس لیئے کامیابی نہیں ہوئی کہ ایک بڑی حد تک ہماری راہ میں مخالفوں کا پروپیگنڈا حائل تھا لیکن پھر بھی آج ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر جماعت اور ہر تحریک کے لیئے ایک مرکز کی اشد ضرورت ہے جہاں سب مل کر کام کر سکیں۔ جو لوگ ایک مرکز پہ جمع نہیں ہوتے وہ کبھی اپنے مقصد سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔ مجھے وقتاً فوقتاً ایسی خبریں پہنچتی رہیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس مرکز کے التوا میں مخالف طاقتوں کا ہاتھ کس طرح کار فرما رہا ہے۔ اور اب وہ بیرون سرحد کے رجعت پسند اخبارات کے علاوہ رجعت پسند نام نہاد علماء کو بھی اپنے پروپیگنڈا کے لیئے آلۂ کار بنا رہے ہیں۔ چنانچہ ہمارے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ ہم یہاں گاندھی آشرم یا دھرم سالہ بنانا چاہتے ہیں۔ غرضیکہ اس طرح

وہ ہمارے خلاف نفرت پھیلانے کے تمام ناجائز ذرائع عمل میں لاتے ہیں اور لا رہے ہیں لیکن اس پروپیگنڈے کا اثر غیور پٹھانوں پر کچھ بھی نہ ہوا اور خدا نے ہمارے مخالفوں کو اس طرح ایک عبرتناک شکست دی میں یہاں اعلان کرتا ہوں کہ مجھے رجعت پسند اخبارات اور حکومت کے غلط پروپیگنڈے کی ذرہ بھر پرواہ نہیں۔ کیونکہ ہمارے مخالف حق پر نہیں باطل پر ہیں۔ اور وہ ہمارے خلاف صرف اپنے روپیہ کے زور سے پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ میں اپنے مخلص مجاہدوں یعنی خدائی خدمتگاروں کو خبردار کرتا ہوں کہ اپنے دوستوں اور دشمنوں میں پرواہوں اور قصابوں کی مانند تمیز کریں۔ اور ہمیشہ عقل و فکر سے کام لے کر سوچیں اور حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں پھر جو کچھ خود سمجھیں دوسروں کو بھی وہ سمجھائیں تاکہ جو لوگ ہمارے خلاف ذلیل پروپیگنڈا کرتے ہیں عوام ان کو بھی پہچان سکیں آپ میرا یہ پیغام قوم تک پہنچا دیں کہ وہ کسی بھی غلط اور کمینے پروپیگنڈے سے ہرگز متاثر نہ ہو۔

ہم عنقریب اسی مرکز سے اپنی نئی تحریک کا آغاز کرنے والے ہیں اور میرا خیال ہے کہ انشاءاللہ ۲ اگست سے ہی اس تحریک کا آغاز کر دیا جائے گا۔ اس مرکز سے ہی ہمارے خدائی خدمت گار میدان عمل کی طرف روانہ ہوں گے۔ اور صوبہ کے تمام کارکن اسی مرکز میں جمع ہو کر اپنا کام شروع کریں گے اس کیمپ کے اختتام پر تمام خدائی خدمتگار اپنے اپنے علاقے کے دیہات میں پھیل جائیں گے اور اپنے نیک مقصد

کی تبلیغ شروع کر دیں گے۔

میں جن کارکنوں کو مناسب خیال کروں گا انہیں ۲ راگست کو یہاں طلب کروں گا۔ اور ان میں سے جن کارکنوں کے متعلق مجھے یہ یقین ہو جائے گا۔ کہ وہ اپنے صبر و تحمل سے عدم تشدد کی جنگ میں پورے اتر سکتے ہیں۔ ان کے قافلے میدان عمل کی طرف روانہ کروں گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ اس وقت جب کہ جنگ کی وجہ سے حالات بدل رہے ہیں ہمیں مرکز کے لیے یہ جگہ نہ لینی چاہیئے تھی۔ لیکن میرا یقین ہے کہ ہمیں اس مرکز میں ہی جمع ہونا چاہیئے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ میری قبر بھی یہاں ہی بننی چاہیئے ؛

(عبد الغفار ۔ پختون سنہ ۱۹۴۰ء)

سردریاب میں قومی مرکز کی بنیاد رکھتے ہی آپ نے نئے عزم اور ہمت سے کام شروع کر دیا۔ سارے صوبہ میں طوفانی دورے کیے۔ اور گاؤں گاؤں اور گھر گھر اپنا پیغام پہنچایا لیکن اب آپ کے راستے میں پہلے سے کہیں زیادہ مشکلات حائل کر دی گئیں۔ مخالف جماعتیں زرخرید علماء اور جاہ پرست لوگ حکومت کے ایماء سے لوگوں میں جھوٹے پکے افسانے پھیلانے لگے کہ باچا خان نے سردریاب میں آشرم بنایا ہے اور دھرم سالے کی بنیاد رکھی ہے جہاں ہندوؤں کے بھجن گائے جاتے ہیں اور پٹھانوں کو گیتا پڑھائی جاتی ہے اور ہندو دھرم کا پرچار کیا جاتا ہے۔

یہ پروپیگنڈا اس زور شور سے کیا گیا کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور بعض نہایت سمجھ دار حضرات بھی باچا خان کے عقائد کے متعلق شک و شبہ کا اظہار

کرنے لگے۔ لیکن وہ ان باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنی لگن میں مگن رہے اور دیوانوں کی طرح اپنے کام میں شب و روز منہمک رہے۔ اور آنے والی جنگ آزادی کے لیئے زور شور سے تیاریاں کرنے لگے۔

قومی مرکز میں رہنما کاروں کی تربیت کے لیئے سنٹر کھولا گیا اور صوبے کے مختلف حصوں میں تربیتی مرکز قائم کرکے خدائی خدمت گاروں کی ایک ایسی فوج تیار ہو گئی جسے دیکھ کر مخالفوں کے حواس گم ہو گئے۔

مخالفت جتنی بڑھتی جاتی باچاخان اور ان کی تحریک اتنی زیادہ مقبول ہوتی جاتی۔ اس میں وہ راز کی بات جسے مخالف عنصر سمجھنے سے عاری تھا یہ تھی کہ باچاخان عملی آدمی تھے وہ مخالفوں کا جواب دینے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کام کو بہتر سمجھتے ——— وہ اپنے مشن میں سچے اور مخلص تھے اور انہیں یقین تھا کہ آخر کار سچائی کی فتح ہو کر رہتی ہے اور جھوٹ چاہے وقتی طور پر کتنا کامیاب کیوں نہ ہو جائے چونکہ اس کے پاؤں نہیں ہوتے اس لیئے وہ پنپ نہیں سکتا۔

اب انہوں نے زیادہ جلسے اور تقریریں کرنی بھی چھوڑ دیں۔ اور عملی کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ زیادہ تقریروں سے قوم نہیں بنتی بلکہ قومیں ہمیشہ عمل سے بنتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "جب تک جاپان جنگ میں شریک نہ ہوا تھا ہمیں زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے جنگ میں کود پڑنے سے تو جنگ سر پر آپہنچی ہے انہوں نے قوم کو بتایا کہ نہ یہاں جاپانی آسکتے ہیں نہ جرمن ——— اگر کوئی ہمیں غلام بنانے کو ادھر کا رُخ کرے گا تو میں پہلا شخص ہوں گا۔ جو اس کا مقابلہ کروں گا۔ انہوں نے واضح طور پر اس جنگ کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا موجودہ جنگ ملک اور تجارتی منڈیاں حاصل کرنے کے

لیے لڑ رہی جا رہی ہے۔ اور ہندوستان ایک بہت بڑا ملک اور تجارتی منڈی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم خدائی خدمت گار ہیں اور ہمارے کام خفیہ نہیں ہوتے۔ خفیہ کاموں سے بدظنی پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے صوبے میں کئی کیمپ تیار کئے ہیں جن میں ایسے لوگوں کو تربیت دی جاتی ہے، جو ملک میں قیام امن کے لیے کام کریں گے۔

باچا خان اپنی ایک تقریر میں اس سول نافرمانی کی یوں وضاحت فرماتے ہیں۔

"یہ سول نافرمانی جس وقت سے کہ شروع ہوئی ہے تو بہت سے بھائیوں نے خطوں، زبانی اور ایک دوسرے کے ذریعہ مطلع کیا ہے کہ ہم جیل جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں بس آپ کے حکم کا انتظار ہے ——— اس مسئلہ کے متعلق میں نے پختون کے گذشتہ پرچہ میں لکھا تھا اور اب پھر لکھتا ہوں کہ آپ بھائیوں کا اگر یہ خیال ہو کہ ہمارا اصل مقصد جیل جانا ہے تو آپ کا یہ خیال غلط ہے ——— ہمارا اصل مقصد جیل جانا نہیں بلکہ اپنی قوم و ملک کی خدمت کرنا ہے اور ہر خدائی خدمتگار کو اپنے آپ میں ایسی صفتیں پیدا کرنی چاہئیں کہ جس کی وجہ سے ہم اپنی ساری قوم کی تنظیم کر سکیں اور اپنی قوم سے ہر قسم کی بُری عادتیں دُور کر سکیں، بے شک سول نافرمانی بھی اپنے وقت کے مطابق ایک ضروری کام ہے۔ پھر سول نافرمانی سے ہم جیل جانے سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ فائدہ تو ہمیں اس وقت ملے گا کہ ہم جیل خانے سے باہر اپنے آپ میں وہ اہمیت پیدا کریں کہ جو ایک سول نافرمانی کرنے والے فرد کو اپنے آپ میں پیدا کرنی لازمی ہے۔ آپ سمجھ لیں کہ سول نافرمانی تو

ایک جنگ ہے اور جنگ میں ہمیشہ وہ سپاہی آگے آسکتا ہے کہ پہلے وہ پریڈ سیکھ لے۔ آپ دُنیا کی عام جنگیں دیکھتے ہیں کہ جرنیل کبھی بھی اُس سپاہی کو مورچے کی طرف روانہ نہیں کرتا۔ جو کہ پریڈ میں کامیاب نہ ہو چکا ہو۔ تو آپ بھی قومی جنگ کے اس مورچے کی طرف جانا چاہتے ہیں تو پہلے سمجھ لیں کہ اس جنگ کے سپاہی کے لیے کون کون سی چیزیں سیکھنی لازمی ہیں اور اس جنگ کے مورچے پر کس قسم کا سپاہی بھیجا جائے گا؟ تو جو بھائی اس جنگ میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو وہ پہلے پریڈ سیکھ لیں اور جس وقت یقین حاصل ہو جائے گا۔ کہ یہ سپاہی مورچے کی طرف جانے کے قابل ہے تو اُسے بھجوایا جائے گا اور اگر اس قسم کے سپاہی کو مورچے کی طرف بھجوانے کا موقعہ ملا۔ تو قومی فرض تو دیگر لوگوں کی نسبت اچھا ادا کرے گا۔ اب میں آپ کو وہ باتیں سمجھانا چاہتا ہوں جو کہ موجودہ سول نافرمانی کے لیئے لازمی ہیں۔ ہم جب گذشتہ دنوں کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس پر واردھا گئے تھے اور کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ سول نافرمانی کے اختیارات صرف گاندھی جی کو حاصل ہوں گے تو میرا خیال تھا کہ اگر گاندھی جی ہر صوبہ میں اپنا ایک ایک نائب مقرر کریں۔ اور جب سول نافرمانی شروع کریں تو بہتر ہو گا۔ پھر ہر صوبہ میں جو شخص موزون سمجھا جائے گا تو وہ آگے ہو گا۔ گاندھی جی کو یہ بات پسند نہ تھی مگر جس وقت میں یہاں آیا اور میں نے غور و فکر کے ساتھ اپنے صوبہ کا اندازہ کیا۔ تو میں نے کہا کہ یہ

سب ٹھیک ہی ہوتا ہے کہ میرے پہلے خیال کے مطابق فیصلہ نہ ہوا۔ اس لیئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرد بھی مجھے ان شرائط پر پورا اُترنے کے مطابق نہیں معلوم ہوتا جو کہ موجودہ سول نافرمانی کے لیئے رکھی گئی ہیں۔ اب میں آپ کو وہ شرائط بیان کرتا ہوں۔ جو کہ جنگ آزادی کے سپاہیوں کے لیئے بالخصوص اور عام خدائی خدمت گاروں کے لیئے بالعموم ضروری ہیں ——— چرخہ پہلی شرط ہے ——— جو سپاہی اگر اس جنگ میں شمولیت کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ ہر روز گھنٹہ آدھ گھنٹہ چرخہ چلائے گا میرے بہت سے بھائی کہتے ہیں کہ چرخے کی تو اتنی ضرورت نہیں ہے مگر میں کہتا ہوں یہ بات بالکل غلط ہے دنیا میں ایک فوج کا بہترین سپاہی وہ ہوتا ہے جو کہ حکم مانے، آپ دُنیا کی فوجوں کا حال معلوم کریں تو بہت سی باتیں آپ کو بے معنی جیسی نظر آئیں گی۔ اور بظاہر اُن کے نہ کرنے سے آپ کو کوئی بھی نقصان نظر نہ آئے گا۔ پھر ایک سپاہی کی یہ مجال نہیں ہوتی کہ اس سے انکار کرے اور نہ ہی اُسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس پر بحث کرے کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ تو اسی طرح ہماری اس موجودہ جنگ کے جرنیل نے ایک شرط رکھی ہے۔ ہر سپاہی کا یہ فرض ہے کہ اس حکم کا احترام کرے اور بغیر کسی بحث کے اُسے تسلیم کرے۔

عدم تشدد ——— دوسری شرط عدم تشدد کے اصولوں پر چلنا ہے جو شخص کہ قولاً، فعلاً عدم تشدد کا پابند نہ ہو، تشدد کا سامان پاس رکھتا ہو۔ یا کوئی دوسرا اسی طرح کا کام کرتا ہو کہ جس سے عدم تشدد کے اصولوں

کی خلاف ورزی ہو تو وہ اس جنگ کے قابل نہ سمجھا جائے گا۔

خلوص ——— تیسری شرط خلوص ہے۔ جو شخص کہ پرے جذبے نا کرے قومی خدمت کے سلسلے میں کوئی خودغرضی نہ کرے۔ اور خالق کی مخلوق کی خدمت کرتا ہو۔ تو وہ اس کا اہل سمجھا جائے گا ——— کہ سول نافرمانی میں اسے آگے کیا جائے۔

اچھے چال چلن ——— چوتھی شرط اچھے اخلاق ہیں، جو شخص کہ بد اخلاقی کرتا ہو، بد دیانت، جھوٹا ہو اور نشے کرتا ہو تو وہ بھی اس کا اہل نہ گردانا جائے گا ——— اس لیے کہ یہ ایک پاک تحریک ہے اور اس میں نیک و پاک لوگ لیئے جائیں گے۔

بس یہ ضروری شرائط تھیں۔ اور جس کا موجودہ جنگ آزادی میں حصہ لینے کا منشا ہو تو آج سے ان باتوں پر عمل درآمد شروع کر دے۔ اور اپنے آپ کو اہل ثابت کرے۔ بہت لوگ کہتے ہیں کہ باچا خان بہت جلد گرفتار ہو جائے گا۔ تو پھر ہم اپنی مرضی کے مطابق سول نافرمانی شروع کر دیں گے۔ یعنی یہ شرائط یوں ہی رہ جائیں گی۔ اور ہم پہلے کی طرح جیل چلے جائیں گے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ ایسا کام اپنی جماعت سے بغاوت ہے۔ اور جو قوم کہ اپنی مرکزی جماعت کے فیصلہ کے خلاف اقدام کرتی ہے تو وہ قومی خدمت نہیں بلکہ قوم کے ساتھ غداری کرتی ہے۔ قوم کا بہترین سپاہی وہ ہے جو کہ اپنے جرنیل کے حکم کے مطابق عمل کرے اور رتی بھر حکم کے خلاف نہ جائے ——— امید ہے کہ

میرے بڑے خدائی خدمت گار بھائی ان شرائط کی پابندی شروع کر دیں گے اور جنگ آزادی کے لیئے اپنے آپ کو اہل ثابت کریں گے ؟

(عبدالغفار ——— پختون ۲۱ر نومبر ۱۹۲۰ء)

بیت المال کا قیام

باچا خان نے "خدائی خدمت گاروں" کی تنظیم جدید کے لیئے سرِ یاب کو مرکز بنانے کے بعد اس کے لیئے "بیت المال" کے قیام کی تحریک شروع کی اس کے لیئے جلسے کیئے اور اپنی تقریروں میں بیت المال کی اہمیت واضح کی آپ نے لوگوں کو بتایا کہ ہر جماعت کے لیئے قومی فنڈ کا ہونا ضروری ہے تاکہ جماعت کی ضروریات کے علاوہ اس کے ذریعے ان غریب اور بے سہارا رضاکاروں کی امداد کی جا سکے جن کے جیل جانے کے بعد ان کے بال بچوں کو بھوکا مرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے صاحب استطاعت لوگوں سے اپیل کی کہ ہر کام دُنیا میں تقسیم کار کے اصولوں پر چلتا ہے جو لوگ جیل جانے کو تیار نہیں یا ان کی مجبوریاں اس کی اجازت نہیں دیتیں وہ قومی فنڈ میں چندہ دے کر اس قومی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے سابقہ تجربے کی بنا پر دیکھا کہ ہمارے ملک کا غالب مفلوک الحال طبقہ ہمیشہ ہر قربانی کے لیئے پیش پیش رہتا ہے۔ یہ محنت کش لوگ جو اپنے خاندان کے واحد کفیل ہوتے ہیں۔ جب عملی سیاست میں آنے کے بعد محنت و مزدوری کے لیئے وقت نہیں پاتے تو ان کے اہل و عیال بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

باچا خان نے بیت المال کے قیام کے لیئے اَن تھک کام کیا ان کے ارادے بہت بلند اور پروگرام نہایت وسیع تھا لیکن یہ ایسا زمانہ تھا کہ کسی کام کی تکمیل کے لیئے فرصت نہیں مل سکتی تھی۔ سیاسی حالات لحظہ بہ لحظہ بدلتے رہتے تھے اور دوسرے رہنماؤں کی طرح باچا خان کو بھی کئی کام ادھورے چھوڑ کر نئے پروگرام کی طرف توجہ دینی پڑتی۔

سول نافرمانی کا فیصلہ

اعلان کے مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو واردھا میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا اور ۱۳ اکتوبر کو ختم ہوا تین دن کی بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ انفرادی سول نافرمانی شروع کی جائے اور اس جدوجہد کی باگ ڈور مہاتما گاندھی کے سپرد کی گئی ——— انہوں نے اعلان کیا کہ وہ شخص ستیہ گرہ کرے گا جسے میں پسند کروں گا۔ پہلا شخص جسے گاندھی جی نے پسند کیا وہ "ونوبا بھاوے" تھا جو گاندھی جی کے آشرم کا ایک مخلص کارکن تھا وہ سنسکرت کا بہت بڑا عالم، ہندو مسلم اتحاد کا حامی، چرخہ کاتنے میں نہایت ماہر، چھوت چھات کا مخالف اور صحیح معنوں میں عدم تشدد کا پابند تھا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ ستیہ گرہ شروع کرنے سے پہلے گاندھی جی نے وائسرائے کو ایک خط لکھا۔ جس میں صرف اس بات کا اظہار کیا گیا کہ فلاں تاریخ سے سول نافرمانی شروع ہو گی۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ یہ سول نافرمانی ایک حد کے اندر چلے۔ لیکن پنڈت نہرو کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد عوام میں پھیل جائے گی اور اس کا محدود رہنا محال ہے۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو پشاور شہر میں ارباب عبدالرحمٰن کی صدارت میں ضلع پشاور کی کانگرس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں حسب ذیل تجاویز پاس کی گئیں۔

۱ ——— ضلع پشاور کے صدر کو اختیار دیا گیا کہ وہ جس طرح چاہیں ضلع کانگرس کو تقویت دینے کے لیے عملی قدم اٹھائیں۔

۲ ——— ضلع کانگرس صوبائی کانگرس کی توجہ اس طرف منعطف کرانا چاہتی ہے کہ صوبہ سرحد میں فی الحال دو نظام ہیں کانگرس اور خدائی خدمت گار ——— لیکن آنے والی جدوجہد کے لیے اور سول نافرمانی کی تحریک چلانے کے لیے صرف ایک ادارہ مقرر کیا جائے۔

۳۔۔۔۔۔۔ ضلع کانگرس آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو تسلی دیتی ہے کہ صوبہ سرحد کے رہنے والے اپنی سابقہ روایات کے مطابق آزادی کی جنگ میں ہائی کمانڈ کے احکامات کی تعمیل میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

۴۔۔۔۔۔۔ یہ اجلاس مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، ارباب عبدالغفور خان، خرم خان، رام سرن نگینہ اور ولی محمد طوفان کو ان کی گرفتاری پر مبارک باد پیش کرتا ہے اور حکومت سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ سیاسی قیدیوں سے بہتر سلوک کیا جائے۔

۵۔۔۔۔۔۔ یہ اجلاس حکومت کے اس رویے کی سخت مذمت کرتا ہے کہ اس نے کانگرس کے وفد کو وزیرستان جانے کی اجازت نہیں دی۔

جیسا کہ مندرجہ بالا ریزولیشن سے ظاہر ہے اس سول نافرمانی کا آغاز صوبہ سرحد میں سب سے پہلے جس دستے نے کیا ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی

ارباب عبدالغفور خان خلیل

ولی محمد خان طوفان

خرم خان

رام سرن نگینہ

ان رہنماؤں کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کرکے دو دو سال قید کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ ان کے بعد باچا خان بھی گرفتار کر لیے گئے اور صوبہ میں انفرادی ستیہ گرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن پنڈت جواہر لال کی بات سچ نکلی یہ تحریک جیسا کہ گاندھی جی چاہتے تھے زیادہ

ویتنگ۔ انفرادی ستیہ گرہ کی حیثیت میں نہ رہ سکی بلکہ ۱۹۴۲ء میں یہ ایک عوامی تحریک بن گئی اور اس زور شور سے گرفتاریوں کا سلسلہ چلا کہ سابقہ تحریکوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

۸ اگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگرس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا جس کے فوراً بعد حکومت نے ورکنگ کمیٹی کے اراکین کو گرفتار کر لیا۔ اور اس کے بعد ہمہ گیر تحریک شروع ہو گئی۔

صوبہ سرحد میں کانگرس کے دس ایم ایل اے حضرات کو بھی گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور ان کے علاوہ ہزاروں خدائی خدمت گار صوبے کے طول و عرض سے کچہریوں پر پکٹنگ کرنے اور گرفتاریاں دینے کے لیئے امنڈ پڑے۔

دس کانگرسی اسمبلی کے ممبروں کی گرفتاری سے مسلم لیگی حضرات کے لیئے میدان صاف ہو گیا اور انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صوبے میں گورنر راج ختم کر کے مسلم لیگی وزارت بنانے کے لیئے تگ و دو شروع کر دی۔ حکومت نے بھی اسے غنیمت سمجھا اور بیرونی دنیا پر یہ ثابت کرنے کے لیئے کہ مسلمان بحیثیت قوم کانگرس کے خلاف ہیں۔ مسلم لیگیوں سے ساز باز کر کے انہیں مئی ۱۹۴۳ء میں وزارت بنانے کی اجازت دے دی۔

یہ ہنگامہ ۱۹۴۴ء تک گرم رہا۔ خدائی خدمت گاروں پر حکومت نے اپنے مظالم کی انتہا کر دی۔ نہتے اور پُر امن رضا کاروں پر لاٹھی چارج تو روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں باچا خان خود ایک جتھے کے ساتھ پکٹنگ کر رہے تھے۔ کہ پولیس نے اتنی بے دردی سے لاٹھی چارج کیا کہ باچا خان کی دو پسلیاں ٹوٹ گئیں اور آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لیکن آپ کو ہسپتال لے جانے کے بجائے اسی حالت میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب جماعت کے قائد کو اتنی بے رحمی سے ظلم و ستم کا ہدف بنایا گیا تو

دوسرے عام رضاکاروں پر کیا کیا مظالم نہ توڑے گئے ہوں گے پولیس کو وسیع اختیارات حاصل تھے اور انہیں خاص ہدایت تھی کہ جہاں تک ممکن ہو انہیں ظلم و تشدد کا نشانہ بناؤ۔ اور عبرت ناک سزائیں دو تا کہ دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں اور تحریک میں حصّہ لینے کی جرأت نہ کر سکیں۔

بہت سے دیہات پر مشترکہ جرمانے کیے گئے۔ کیونکہ وہاں کے لوگوں نے تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ جو غریب اور نادار لوگ جرمانہ ادا نہ کر سکے ان کے گھر کا سامان نیلام کر دیا گیا۔ حکومت نے ایک خاص سرکلر کے ذریعے دیہات کے خوانین اور صاحب اثر لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کسی خدائی خدمت گار کو اپنے گاؤں میں رہنے نہ دیں اور ان سے تعلقات اور راہ و رسم ترک کر دیں ورنہ ان سے زمینیں چھین لی جائیں گی اور خانی کی مراعات واپس لے لی جائیں گی۔

خدائی خدمت گاروں کو ننگا کر کے برسرِعام پٹوایا جاتا اور ایسی ایسی شرمناک سزائیں دی جاتیں کہ تہذیب و شرافت اس کے بیان کی اجازت نہیں دیتی۔ ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا۔ ان کے بچوں کو سکولوں سے نکال دیا گیا حتیٰ کہ ان پر دانا پانی بند کر دیا گیا۔

غرض کہ یہ دور خدائی خدمت گاروں پر انتہائی آزمائش کا دور تھا۔ لیکن باچا خان نے ان کی تربیت کچھ ایسے ڈھنگ سے کی تھی کہ ان اذیتوں کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا بلکہ جتنی زیادہ سختی ان پر کی جاتی تحریک اور زیادہ زور سے ابھرتی اور لوگ اور زیادہ ذوق و شوق سے اس میں حصّہ لیتے۔

سچ پوچھیے تو یہ ایسا سیلاب تھا کہ جس نے ہر شخص کو خدائی خدمت گار بننے پر مجبور کر

دیا۔ جن لوگوں کو خدائی خدمت گاروں سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا وہ جب حکومت کی بے رحمی اور انتقامی کارروائیاں دیکھتے اور عزیز و اقارب، بھائی بندوں اور ہم قوموں کی بے عزتی دیکھتے اور حکام کی بے دردی، سنگ دلی اور بے اعتنائیوں پر نظر کرتے تو غم و غصّہ سے دیوانے ہو جاتے اور جوشِ انتقام سے بھڑک کر پکار اُٹھتے۔ اگر حکومت ایسے ہی اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئی ہے تو آج سے ہم بھی خدائی خدمت ہیں، ہر پٹھان خدائی خدمت گار ہے ہر قوم پرست اور حریت پسند انسان خدائی خدمت گار ہے —— ایک سیلاب تھا۔ ایک طوفان تھا جو تھمنے میں نہیں آتا تھا۔ حکومت کی ساری طاقت، سارا زور، ساری قوت ساری فوج اور پولیس مل کر بھی تحریک کو دبا نہ سکی، کچل نہ سکی، روک نہ سکی۔

یہاں تک کہ جیلوں میں جگہ نہ رہی تو ستیہ گرہیوں کو لاریوں میں بھر بھر کر شہر سے میلوں دُور لے جا کر چھوڑ دیا جاتا، جہاں سے وہ بھوکے پیاسے پا پیادہ شہر آتے لیکن آتے ہی پھر اپنے محاذ پر پہنچ جاتے۔

خدائی خدمت گاروں کو جیل جانے سے روکنے کے لئے تشدد کے ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے گئے جو کسی کے تصور میں بھی نہ آ سکتے ہوں۔ رضاکاروں کو نہروں میں غوطے دیئے جاتے۔ ننگے بدن جلتی ریت پر لٹایا جاتا۔ پتھریلی سڑکوں پر گھسیٹا جاتا —— یہ ظلم وستم کے وہ ہولناک طریقے تھے جن کی وجہ سے بیسیوں حریت پرست نوجوان لقمۂ اجل بن گئے۔

لیکن سچ پوچھئے تو صوبہ سرحد میں پھر بھی خیریت رہی، کیونکہ یہاں ۱۴ ستمبر ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگرس کے ریزولیوشن کی توثیق کے بعد بھی سرحدی رہنما باہر منظم طور پر تحریک چلاتے رہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں ادھر ۸ اگست ۴۲ء کو آل انڈیا کانگرس

نے مکمل آزادی اور ہندوستان چھوڑ دو کا رزولیوشن پاس کیا ادھر ان کے تمام رہنما جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ جس سے تمام ملک میں گو بڑ شروع ہو گئی۔ اس پر حکومت کی متشددانہ پالیسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ سر بکف نوجوان حکومت سے آخری ٹکر لینے کے لیے میدان میں کود پڑے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں لاکھوں حریت پرست انسان آزادی وطن کی شمع پر پروانوں کی طرح نثار ہو گئے۔ سینکڑوں وطن کے لال مسکراتے ہوئے سولی پر چڑھ گئے۔ ہزاروں نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور لاکھوں پولیس کی لاٹھیوں اور سنگینوں سے مجروح ہوئے۔ جیلوں میں بھی رضاکاروں پر وہ مظالم روا رکھے جاتے کہ پناہ بخدا — انہیں طرح طرح کی اذیتیں دے کر معافی مانگنے پر مجبور کیا جاتا۔ انتہائی سخت مشقت لی جاتی۔ بات بات پر پیٹا جاتا۔ خوراک انتہائی خراب دی جاتی۔ اور اکثر اتنی خوراک دی جاتی جو بالکل ناکافی ہوتی۔ اس سے قیدیوں کی صحت پر بہت برا اثر پڑا۔ علاج معالجے کی یہ حالت تھی کہ سیاسی قیدیوں کو ہسپتال کے پاس پھٹکنے نہ دیتے۔ جیسے انہیں طبی امداد پہنچانا جیل مینول کے خلاف ہو۔

صوبہ سرحد کے عوامی رہنما مفتی سرحد مولانا عبدالقیوم پوپلزئی مرحوم اسی ناقص غذا کی وجہ سے جیل میں درد گردہ اور پتھری کا شکار ہو گئے۔ اور معقول علاج نہ ہونے کی وجہ سے ان کی حالت ایسی بگڑی کہ رہا ہونے کے بعد بستر علالت سے نہ اٹھ سکے اور دو تین مہینے بعد ملک کے اس بطل جلیل نے داعیٔ اجل کو لبیک کہی۔

خود باچا خان کو ایبٹ آباد میں اتنی تنگ و تاریک کوٹھری میں رکھا گیا جو کبوتروں کے ڈربے سے مشابہ تھی وہاں وہ تنہا رہتے اور کسی سے ملنے کی انہیں اجازت نہیں تھی ان سے سی کلاس قیدیوں کا سا سلوک کیا جاتا۔ خوراک ایسی دی جاتی جس میں ریت اور کنکر ہوتے

وہاں شدید برف باری میں نہ صرف یہ کہ انہیں آگ کے بغیر ہی رہنا پڑا۔ بلکہ کمبل بھی ناکافی دیئے گئے ——— اس قید تنہائی ناقص غذا اور شدید سردی سے بچاؤ کی صورت نہ ہونے سے وہ شدید طور پر بیمار ہو گئے لیکن انہیں طبی امداد تک نہ دی گئی۔

باچا خان کی ایک تاریخی تقریر

۱۹۴۵ء میں دوسری عالمی جنگ کا سیلاب تھا تو حکومت نے ملک کے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ اس عام رہائی میں باچا خان بھی رہا ہو کر باہر آگئے تو اتمان زئی کے ایک عظیم الشان اجتماع میں جو آپ کے استقبال کے لیئے آپ کے گاؤں میں جمع ہوا تھا۔ باچا خان نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا:۔

"بہنو اور بھائیو! میں آپ لوگوں کی اس محبت کا جس کا اظہار آپ نے کیا ہے۔ شکریہ ادا کرتا ہوں اور خداوند تعالےٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں کہ اس کے فضل و کرم اور مہربانی نے ہمیں پھر ایک مدت کے بعد ایک جگہ جمع ہونے کا موقع دیا۔ پیارے بھائیو! میں ان تکالیف کو محسوس کرتا ہوں۔ جو میرے جیل جانے کے بعد آپ کو پہنچی ہیں۔ لیکن قوموں کی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ آزادی کی نعمت تکلیف اور مصیبتیں برداشت کیئے بغیر نہیں ملا کرتی اور اس راہ میں مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ضروری ہے۔ دوسری قوموں پر آزادی کی جدوجہد میں جتنی تکلیفیں اور مصیبتیں گذری ہیں ہم نے ابھی تک اتنی تکلیفیں نہیں اٹھائی ہیں تاہم ہم نے جس قدر قربانی اس راہ میں کی ہے۔ خدا کی مہربانی اور احسان ہے کہ اس نے ہمیں اپنی قربانی

سے زیادہ فائدہ پہنچایا ہے۔

آج میں آپ لوگوں سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ میں جو کچھ کروں اس سے آپ لوگوں کو بے خبر رکھوں اور نہ میں اپنی باتوں کو آپ لوگوں سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ باتیں یہ ہیں کہ آج کل ہر جگہ پارٹی بازیاں ہیں اور لوگ یہ باتیں کرتے نظر آتے ہیں کہ ہم نے جس آزادی کا اعلان ستمبر ۱۹۴۲ء میں کیا تھا کیا وہ آزادی ہمیں مل گئی اگر نہیں تو یہ اعلان اب بھی قائم ہے یا واپس لے لیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اعلان ہمارا نصب العین ہے اسے کسی طرح ترک نہیں کیا جا سکتا یہ قائم ہے۔ اور رہے گا جب تک ہمیں آزادئ کامل کی نعمت حاصل نہ ہو۔ آزادی کے حصول کے لیے جو پروگرام مرتب کیے جاتے ہیں۔ ان میں حالات کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جیسے آپ لوگوں نے موجودہ جنگ میں دیکھا ہوگا۔ کہ روسی، جاپانی اور جرمنی جرنیلوں نے کبھی مورچے آگے لگائے اور کبھی پیچھے —— لیکن اس کا یہ مطلب نہ ہوتا تھا کہ وہ جنگ سے یا اپنے مقاصد سے دست بردار ہو گئے۔ بس یہی حالت ہماری جنگ کی ہے کہ ۴ ستمبر ۱۹۴۲ء کا اعلان یعنی نصب العین موجود ہے البتہ پروگرام میں تبدیلی آگئی ہے۔ جب تک ہماری زندگی ہے۔ ہم یہ کوشش جاری رکھیں گے۔ کہ قوم اور وطن کو آزادی کی دیوی سے ہمکنار کریں۔ جس طرح ہم ۴ ستمبر ۱۹۴۲ء کو فرنگیوں کی غلامی تسلیم نہیں کرتے تھے آج بھی

نہیں تسلیم کرتے اس لیئے کہ ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اس ملک کے عوام کی حکومت ہونی چاہیئے۔ موجودہ حکومت ہماری مرضی کے خلاف ہے اور بزور قائم ہے جو لوگ جیلوں سے رہا ہو کر آتے تھے میں ان کو بھی یہی کہتا تھا کہ باہر جا کر اپنی جدوجہد جاری رکھنا آج بھی میں سب سے کہتا ہوں کہ آزادی کی جدوجہد اس وقت تک جاری رہنی چاہیئے جب تک ہم اپنی منزل مقصود پر نہ پہنچ جائیں۔

ایک اور ضروری بات یہ ہے جو میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ جنگ دو طرح سے لڑی جاتی ہے۔ ایک تشدد سے اور دوسری عدم تشدد سے یعنی صبر سے ——— تشدد کی جنگ میں فتح و شکست دونوں کا امکان ہے لیکن عدم تشدد کی جنگ میں شکست کا احتمال نہیں۔ اس میں ہمیشہ ہی فتح ہے تشدد سے قوموں میں نفرت اور بغض و کینہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ دوسری اور تیسری جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس طرح ۱۹۱۴ء کی تشدد کی جنگ کا نتیجہ موجودہ خون ریز جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن عدم تشدد قوموں میں محبت پیدا کرتا ہے اور اس کا نتیجہ امن ہے اور عدم تشدد کی جنگ کوئی نئی اور عجیب بات نہیں ہے یہ جنگ وہی ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے ہمارے رسول اکرمؐ نے مکہ کی زندگی میں لڑی تھی۔ لیکن جو لوگ عدم تشدد کے اصول سے ناواقف ہیں۔ ان کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہم کو شکست ہو گئی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ ہم جب ۱۹۳۱ء میں جیلوں سے باہر آئے تو قوم

میں ہمدردی اور محبت کے جذبات کس قدر بڑھے ہوئے تھے پھر ۱۹۳۲ء میں حکومت نے ہم پہ جو ذلت آمیز تشدد روا رکھا۔ اور مجھے امید ہے آپ سال کے بیچ بیدار رکھا گیا۔ لیکن حکومت ہمارے جذبات کو نہ دبا سکی۔

ہم نے ۱۹۴۲ء میں تیسری عدم تشدد کی جنگ لڑی اور آج ۱۹۴۵ء میں آپ دیکھتے ہیں کہ قوم میں جذبات محبت اور بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ میں آج آپ کے چہروں کو دیکھتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ میں ملک اور قوم کی ذلت کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور جب کسی قوم میں اپنی ذلت کا احساس پیدا ہو جائے اور وہ ذلت کو دور کرنے کے لیئے تیار ہو جائے تو پھر اس کو دنیا کی کوئی طاقت تشدد سے نہیں دبا سکتی۔ آخر جب فرنگی ہمارے جذبہ حریت کو بزور نہیں دبا سکے تو پھر شکست کہاں ہوئی۔

تیسری بات یہ ہے کہ بعض لوگ وزارت کے قیام پر بحثیں کرتے ہیں میں اس سلسلہ میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ جب میں جیل میں تھا تو میرے پاس کچھ لوگ اس سلسلہ میں آئے تھے تو میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں وزارتوں کے قطعاً خلاف ہوں یہ اس لیئے بھی کہ یہ ہمارے اعلان ۸ اگست ۱۹۴۲ء کے خلاف ہے۔ میں جن کاموں میں لوگوں کا فائدہ نہیں دیکھتا اس کے متعلق جرأت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا کرتا ہوں۔ میں جو قوم کی خدمت کرتا ہوں تو یہ کسی

معاوضے کے لیئے ہرگز نہیں کرتا۔ اگر مجھے آپ لوگوں نے اپنا بڑا جرنیل مقرر کیا ہے تو پھر یہ میرا کام ہے کہ میں سوچوں آپ کا بھلا کس بات میں ہے اور کس بات میں نہیں ہے میں اگر وزارت سے اتفاق نہیں کرتا تو اس لیئے کہ پرانا تجربہ ان کے خلاف ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گذشتہ وزارت کے دنوں میں تحصیلوں، کچہریوں، اور تھانوں میں آپ لوگ چلتے پھرتے نظر آتے تھے اور خدا کی خدمتگاروں نے نوابوں اور خانوں کی جگہ لے لی تھی۔ اور سفارشوں پر قوم کی توجہ مرکوز ہو گئی تھی۔ اور جب ان کے مطالبات پورے نہ ہوتے تھے تو وہ ایسے پروپیگنڈے کیا کرتے تھے کہ الاماں والحفیظ ـــــ میں ایسی حکومت نہیں چاہتا۔ جس کو عوام کی خدمت کرنے کا اختیار ہماری مرضی کے مطابق نہ ہو۔ جس میں خدا کی مخلوق کی آزادانہ طور پر خدمت کر سکیں۔ میں حکومت کے لیئے طاقت حاصل کرنا نہیں چاہتا بلکہ مخلوق کی خدمت کے لیئے طاقت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ گذشتہ وزارت میں فرنگیوں نے وزارت سے تعاون نہیں کیا بلکہ اس کے سامنے طرح طرح کی مشکلات پیدا کیں۔ اب بھی میں نے ان کو یہ موقع دیا ہے کہ اگر موجودہ وزارت نے عوام کی خدمت نہ کی اور فرنگیوں نے ان کے ساتھ تعاون نہ کیا تو میں اس کے لیئے ذمہ داری قبول نہیں کروں گا۔

میں ہمیشہ آپ لوگوں سے وہی کہتا ہوں جس میں آپ لوگوں کا بھلا

ہو۔ دنیا کی تاریخوں، تمام الہامی کتابوں سے یہ ثابت ہے کہ جس قوم نے طاقت حاصل کر کے مظالم روا رکھے۔ مظلوموں میں سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے ظلم کے خلاف نعرہ بلند کیا اور اس کے تدارک کے لیئے میدان میں ڈٹ گئے۔ باوجود اس کے کہ ظالم طاقتور تھے اور مظلوموں کے حامی تھوڑے اور کمزور تھے۔ لیکن ہمیشہ حق کے مقابلہ میں باطل کو شکست فاش ہوتی رہی۔ ظلم یعنی باطل کا مقابلہ کوئی بڑی جماعت نہیں کر سکتی بلکہ چھوٹی جماعت ہی اس کے لیئے کافی ہوتی ہے۔ لیکن اس جماعت کے لیئے یہ ضروری ہے کہ ان میں اخلاص اور اخلاق ہو۔ محبت ہو۔ اتفاق ہو اور اس جماعت کے لوگوں کے ارادے مضبوط اور ذاتی اغراض سے پاک ہوں۔ حق کے مقابلہ میں نہ صرف باطل کو شکست ہی ہوتی ہے بلکہ اس کے تمام ساتھیوں اور معاونوں کا نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جایا کرتا ہے۔

اہل حق کی جماعت کو قرآن میں "حزب اللہ" (خدائی خدمت گار) کہا گیا ہے اور جو لوگ باطل کے طرف دار ہیں ان کو حزب الشیطان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ پس جو ظالموں کا دوست ہے وہ باطل کا دوست ہے اس کا شمار حزب الشیطان میں ہے۔ جس وقت باطل کی تباہی ہوگی وہ اس کے ساتھ تباہ ہوگا۔ میرے دل میں خدا نے آپ کی محبت پیدا کی ہے کہ اگر آپ میری مخالفت بھی کریں تو یہ مخالفت بھی مجھے آپ کی خیر خواہی سے نہیں روک سکتی۔ اس لیئے میں آپ

لوگوں سے یہ کہتا ہوں کہ میرا پیغام قوم کو پہنچا دو کہ باطل سے علیحدہ ہو ہو جائے۔ باطل تباہ ہونے کو ہے ایسا نہ ہو کہ تم سب اسکی دوستی میں تباہ ہو جاؤ میں دُکھ بھرے دل سے یہ بات کہتا ہوں کہ آپ میرے رفیق میرے دوست ہیں یا نہ ہیں یہ آپ کی مرضی ہے میں کسی کو زبردستی اپنا ساتھی بنانا نہیں چاہتا میرے لیئے میرا خدا کافی ہے۔ لیکن باطل سے ضرور جدا ہو جایئے۔ اور اس کی دوستی سے باز آجایئے۔ مجھے اس بات سے انتہائی دُکھ پہنچتا ہے کہ ہمارے بعض بھائی ہم سے اپنے آپ کو جدا سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام پٹھان قوم ایک ہی باپ کی اولاد ہے۔ ان کا غم اور خوشی ایک ہے۔ ہم سب ایک ملک کے رہنے والے ہیں۔ اور ہمارا نفع و نقصان ایک ہے۔ ایسی حالت میں ہم ایک دوسرے سے کس طرح جدا ہو سکتے ہیں۔ میں کسی کو اپنے سے جدا نہیں سمجھتا۔ اس لیئے جو لوگ ہم سے اپنے آپ کو جدا سمجھتے ہیں ان کو بھی اس مسئلے پر غور و فکر کرنا چاہیئے اور میری باتوں کو غور سے سننا چاہیئے"

بہار کا دورہ

دوسری جنگ عظیم دُنیا کے لیئے جو قیامتیں لے کر نازل ہوئی۔ ان میں بھوک اور قحط ہندوستان کے حصے میں آیا۔ جنگ کے اختتام پر ۱۹۴۵ء میں بہار و بنگال میں خوفناک قحط پھوٹ پڑا۔ لوگ دانے دانے کو ترسنے لگے۔ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرنے لگے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیئے مائیں بچوں کو

بھائی بہنوں کو، شوہر بیویوں کو اور دوشیزائیں اپنی عصمتوں کو بیچنے پر مجبور ہو گئیں ہر طرف ایک حشر بپا تھا، سارا ملک ایک دم توڑتے مریض کی طرح کراہ رہا تھا۔

ایک عرصہ کی کوششوں کے بعد کہیں جاکر قحط کا زور ٹوٹا تو وبائیں پھوٹ پڑیں۔ جو لوگ قحط سے بچ نکلے وہ وباؤں کی نذر ہو گئے اور جب وباؤں پر قابو پا لیا گیا۔ تو نواکھلی (بنگال) سے فرقہ وارانہ فساد کی آگ ایسی بھڑکی کہ بہار کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس طرح اس حزنیہ کا آخری الم ناک باب ختم ہوا۔

بہار کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی داستانیں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پہنچیں تو تمام سیاسی جماعتوں نے ان کی امداد کے لیئے اپنے رضا کار اور کارکن بھیجے۔

صوبہ سرحد میں سب سے پہلے باچا خان خدائی خدمت گاروں کا ایک بھاری دستہ لے کر بہار پہنچے۔ اس کے بعد مسلم لیگ اور خاکسار جماعت نے بھی اپنے رضا کاروں کے دستے بھیجے۔ جنہوں نے وہاں قابل قدر خدمات انجام دیں۔

باچا خان نے بہار پہنچتے ہی سارے صوبے کا دورہ کرنا شروع کیا ایک ایک گاؤں میں پا پیادہ پہنچے۔ اور دکھی لوگوں کو ہر طرح کی امداد پہنچائی۔ انہیں موت کے چنگل سے نکال کر نئی زندگی سے ہمکنار کیا۔ اور اپنے طویل دورے کے دوران میں انہوں نے ہزاروں لاکھوں قیمتی انسانی جانوں کو ضائع ہونے سے بچایا۔

مُسلم لیگ کا آغاز

لیگ وزارت کا قیام اور شکست

پشاور شہر کے وہ پرانے سیاسی کارکن جو کانگرس سے بعض اختلافات کی بنا پر مختلف اوقات میں علیحدہ ہوتے رہے۔ اب تک کسی باقاعدہ تنظیم میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اگست ۱۹۳۶ء میں انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی دعوت پر پہلی دفعہ یہاں مسلم لیگ کی تشکیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ مرزا سلیم خان کے مکان پر ایک غیر رسمی میٹنگ بلائی گئی جس میں مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت کی۔ سردار اورنگ زیب خان، میاں ضیاء الدین خان، حاجی عبدالرحیم، اللہ بخش یوسفی، رحیم بخش غزنوی، مرزا سلیم خان —— اس جلسہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی اور کرسوہ ابریشم گراں میں اس کا پہلا جلسہ کیا گیا۔ جس میں اللہ بخش یوسفی اور رحیم بخش غزنوی نے تقریریں کیں۔

۱۹۳۷ء کے جنرل الیکشن میں کانگرس بحیثیت جماعت کے الیکشن لڑی لیکن مسلم لیگ ابھی اس حیثیت میں نہیں تھی۔ اس لئے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کسی نے الیکشن لڑنے کی جرأت نہیں کی۔ یہاں تک کہ سردار عبدالرب خان نشتر اور پیر بخش خان کو قائداعظم نے خود پیش کش کی۔ لیکن انہوں نے یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ اور آزاد امیدوار کے طور پر مقابلہ کیا۔ اور عبدالقیوم خان سابق وزیراعلیٰ صوبہ سرحد کے مقابلہ میں کامیاب ہوگئے جو کانگرس ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ صوبے میں الیکشن کا نتیجہ کانگرس کے حق میں شاندار رہا۔ اور ۱۹۳۷ء میں کانگرس کی پہلی وزارت عمل میں آئی جو ۱۹۳۹ء تک قائم رہی۔

۱۹۳۹ء میں سرحد کانگرس وزارت آل انڈیا کانگرس کے فیصلے کے مطابق مستعفی ہو گئی۔ لیکن ۱۹۴۲ء تک یہاں گورنر راج رہا۔ کیونکہ اکثریت کانگرس پارٹی کی تھی اور اس کی موجودگی میں دوسری کوئی پارٹی وزارت بنانے کا خواب نہیں دیکھ سکتی تھی۔

۸ ستمبر ۱۹۴۲ء میں سرحد کانگرس کمیٹی نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ملکی آزادی کے ریزولیوشن کی توثیق کرتے ہوئے صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا۔ حکومت سرحد نے کانگرسی رہنماؤں کی گرفتاریاں شروع کیں۔ اس سلسلہ میں دس کانگرسی ایم ایل اے بھی گرفتار کر لیے گئے۔

اس وقت مسلم لیگ کا اثر صوبہ سرحد میں کافی بڑھ چکا تھا۔ اور اس کی ہوا بندھتی دیکھ کر بہت سے وقت شناس لوگ جو پہلے مسلم لیگ میں شامل ہونا اپنی توہین خیال کرتے تھے اور جنہوں نے قائد اعظم کے پہلی بار پشاور آنے پر ان کے بار بار بلانے پر بھی ان سے ملنا تک گوارا نہ کیا۔ اب مسلم لیگ کے لیے سازگار فضا دیکھ کر اس میں شامل ہو چکے تھے۔

دس کانگرسی ایم ایل اے گرفتار ہو گئے تو مسلم لیگی رہنما اور صوبہ سرحد کے اولین مسلم لیگی سردار اورنگ زیب خان نے گورنر سرحد سے مل کر سرحد میں مسلم لیگی وزارت بنانے کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ ادھر حکومت بھی بیرونی دنیا پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مسلمان بحیثیت قوم کانگرس سے الگ ہیں۔ مسلم لیگ سے سمجھوتے پر رضامند ہو گئی۔ اور اس طرح ستمبر ۱۹۳۹ء میں صوبہ سرحد میں پہلی مسلم لیگ وزارت عالم وجود میں آ گئی۔ جس کی تشکیل یہ تھی:۔

سردار اورنگ زیب خان	وزیر اعلیٰ
سردار عبدالرب نشتر	وزیر خزانہ

سردار اجیت سنگھ — وزیر صحت

ثمین جہان خان — وزیر تعلیم

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سردار عبدالرب خان نشتر وزارت کی تشکیل سے ایک دن پہلے تک مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔ لیکن راتوں رات سودا طے ہونے کے بعد اگلے روز وہ سب سے بڑے مسلم لیگی تھے۔

یہ وزارت مارچ ۴۵ء تک یا بالفاظ دیگر اس وقت تک قائم رہی جب تک کانگرسی رہنما جیلوں میں تھے اور ان کی رہائی کے ساتھ ہی قدرتی طور پر ٹوٹ گئی۔ کیونکہ اب کانگرس کے دس ایم ایل اے رہا ہو چکے تھے اور ایوان میں کانگرس پارٹی کی اکثریت تھی۔ اس لیئے گورنر کی دعوت پر ڈاکٹر خان صاحب نے بحیثیت وزیر اعلےٰ کے مارچ ۴۵ء میں دوسری مرتبہ صوبہ سرحد میں کانگرس وزارت کی باگ ڈور سنبھالی جو ۴۷ء یعنی قیام پاکستان تک قائم رہی۔

مسلم لیگ وزارت کے دوران میں بدقسمتی سے کانگرس کی سول نافرمانی کی تحریک زوروں پر تھی۔ اور خدائی خدمت گاروں پر حکومت بے پناہ مظالم توڑ رہی تھی۔ اس لیئے لوگوں نے مسلم لیگی وزارت کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اسے بدنام کیا۔

ان ہی دنوں ۱۹۴۵ء میں پشاور میں قائد اعظم کی آمد آمد نے کافی ہماہمی پیدا کر دی ان کا ایسا شاندار تاریخی استقبال کیا گیا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

دوسری سیاسی جماعتیں

خلافت کمیٹی، کانگرس کمیٹی، نوجوان بھارت سبھا، مسلم لیگ، عوامی لیگ اور جمعیت العلماء کے علاوہ صوبہ سرحد میں وقتاً فوقتاً جن دوسری مشہور سیاسی جماعتوں نے حتی المقدور خدمات انجام دیں ان کا یہاں مختصر سا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مجلس احرار سنہ ۳۲ء میں بمقام پشاور مجلس احرار کی شاخ قائم کی گئی۔ اس کے صدر مولانا عبدالقیوم پوپلزئی اور سیکرٹری حکیم عبدالعزیز چغتائی مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ ضلع ہزارہ میں بھی مولانا محمد غوث کی ان تھک کوششوں سے اس جماعت نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ پشاور اور ہزارہ میں مجلس احرار نے بعض بڑے بڑے اجتماع کیئے جن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے مشہور احراری رہنماؤں نے شرکت کی۔ کشمیر کی ایجی ٹیشن میں اس نے کافی عروج پایا اور مسجد شہید گنج کی تحریک میں اس کی شہرت کو خاصا نقصان پہنچا۔ اس وقت پشاور میں اس کے رہنما مولانا عبدالقیوم پوپلزئی اور مولانا نورالحق نور ہیں۔

خاکسار علامہ عنایت اللہ مشرقی نے سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد سنہ ۳۱ء میں خاکسار جماعت کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۲ء میں پشاور آکر اس کی تنظیم شروع کی۔ سب سے پہلے یہاں اس تحریک میں میاں احمد شاہ بیرسٹر، میاں محمد صاحب صاحبزادہ، ڈاکٹر کاظمی وغیرہ شامل ہوئے پھر تعداد ہزاروں تک جا پہنچی۔ نہایت منظم تحریک تھی۔ لیکن اس کا انجام بڑا افسوسناک ہوا۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں انگریزوں نے اسے کچلنے کا فیصلہ کیا۔ علامہ مشرقی

نے ۳۱۳ رضاکاروں کا جتھا تیار کیا۔ حکومت نے ان کی نقل و حرکت اور پریڈ پر پابندی لگا رکھی تھی۔ یہ جتھا لاہور میں مارچ کرتا ہوا نکلا۔ اس پر بے دردانہ فائرنگ کی گئی۔ کئی نوجوان شہید ہوئے۔ جن میں اکثر صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ بعد میں اس تحریک نے اسلام لیگ اور حال ہی میں متوازی مسلم لیگ کی صورت اختیار کر لی ہے۔

جماعت اسلامی

مئی ۱۹۴۵ء میں جماعت اسلامی کا کل ہند اجتماع پٹھانکوٹ میں ہوا۔ جس میں صوبہ سرحد سے صرف ۱۲۔ افراد شریک ہوئے۔ ان میں سے آٹھ کو رکن بنایا گیا۔ جن کے نام یہ ہیں۔ مولانا فضل معبود، تاج الملوک، مولانا عبدالحق اور حکیم عبدالعزیز، تاج محمد اکبرپورہ، اکبر شاہ اور ارباب نعمت اللہ ——— اس طرح سرحد میں پہلی بار جماعت اسلامی کی بنیاد پڑی۔ پھر مختلف اوقات میں جماعت کے عظیم الشان سالانہ اجتماعات پشاور میں ہوئے جن میں امیر جماعت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی شرکت کی۔ ابھی تک ان کے ارکان کی تعداد یہاں پر ۱۱۳ سے زیادہ نہیں۔ اس لئے کہ ممبر بننے کے لئے انہوں نے بہت اونچا معیار مقرر کر رکھا ہے۔ اس جماعت کے بعض اراکین نے قیوم وزارت میں قید و بند کی تکلیفیں بھی اٹھائیں۔ یہ لوگ خاموش مگر ان تھک کام کرنے میں مشہور ہیں۔

پشاور پولٹیکل کانفرنس

یہ تاریخی کانفرنس ۲۱، ۲۲، ۲۳ اپریل ۱۹۴۵ء کو بمقام شاہی باغ پشاور منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر سید محمود صاحب نے انجام دیئے۔ اس وقت صوبہ میں دوبارہ کانگرس وزارت بن چکی تھی۔ اس لئے کانفرنس کے انعقاد میں کافی سہولتیں میسر آگئیں۔ شاہی باغ کے وسیع و عریض احاطے میں افغان نگر تعمیر کیا گیا۔ جس کے چاروں طرف انقلابی ماٹو لگائے گئے۔ افغان نگر میں داخلہ کے لئے دو خوب صورت مرکبیں بنائی گئیں۔ ایک سڑک پبلک کی آمد و رفت

کے لیے تھی اور دوسری رضا کاروں کے لیے۔

اسٹیج پر ایک ہزار ڈیلی گیٹوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اور جلسہ گاہ میں ایک لاکھ نفوس کے لیے گنجائش تھی۔ پریس گیلری میں پچاس رپورٹروں کے لیے کانفرنس کی کارروائی میں حصہ لینے کے لیے تمام سہولتیں موجود تھیں۔ اسٹیج کو پھولوں، رنگا رنگ کاغذی جھنڈیوں، موتیوں کی لڑیوں اور بجلی کے قمقموں سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔ اسٹیج کے زرین دروازے پر مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، باچا خان اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی قد آور تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اسٹیج کے بائیں طرف ممبران استقبالیہ کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اور سامنے سات ہزار کارکنوں کے لیے ایک گیلری بنی ہوئی تھی۔ دائیں طرف خدائی خدمت گاروں کا عظیم الشان کیمپ تھا جس میں سارے صوبہ کے رضا کار باوردی موجود تھے۔ اس کے قریب ہی باچا خان کا خیمہ تھا۔ جس کے باہر کانگرس کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں سالار اعظم اور پرائیویٹ سیکرٹریوں کے خیمے تھے۔ کیمپ کے وسیع میدان میں چار سو خیمے خدائی خدمتگاروں کی رہائش کے لیے لگائے گئے تھے۔

غرض شان و شوکت، سج دھج، وسیع انتظامات اور اپنی ہمہ گیر افادی حیثیت کے اعتبار سے یہ کانفرنس اپنی مثال آپ تھی۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے بڑے بڑے رہنماؤں کو اعتراف کرنا پڑا کہ آل انڈیا کانگرس کے سالانہ اجلاسوں میں بھی آج تک ایسا خوبصورت پنڈال اور اتنا اعلیٰ نظم و نسق دیکھنے میں نہیں آیا اور اس تمام کامیابی کا سہرا پشاور کے کانگرسی کارکنوں کے سر تھا جنہوں نے اس مقصد کے لیے رات دن ایک کر دیا۔

اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ سول نافرمانی کی تحریک کے بعد سرحد کانگرس میں جو عارضی جمود پیدا ہو چکا تھا اسے ختم کیا جائے۔ اور صوبہ کے تمام سیاسی

کارکنوں کو جمع کر کے ان میں نئی روح پھونکی جائے اس کے علاوہ ہندوستان کی موجودہ صورت حال، کانگریس کے پروگرام اور بین الاقوامی حالات پر غور و خوض کیا جائے۔

اس کانفرنس میں صوبہ سرحد کے خاکساروں، سٹوڈنٹس یونین اور موجودہ بھارت سبھا کے علاوہ پنجاب کی سوشلسٹ پارٹی۔ کمیونسٹ پارٹی۔ کسان پارٹی اور بمبئی کی سٹوڈنٹس فیڈریشن کے طلبار نے بھی حصہ لیا اور اسے کامیاب بنانے کے لئے حتی المقدور کوشش کی۔

۱۲ر اپریل کی صبح کانفرنس کے صدر ڈاکٹر سید محمود بھولا بھائی ڈیسائی کے ہمراہ پشاور شہر کے سٹیشن پر پہنچے جہاں ہزاروں رضاکاروں اور لاکھوں عوام نے ان کا استقبال کیا اور ایک شاندار جلوس نکالا جو سارے شہر کا چکر لگا کر افغان نگر میں آکر ختم ہوا۔ شہر کو پوری طرح سجایا گیا تھا۔ اور جگہ جگہ خوبصورت دروازے بنائے گئے تھے۔ جن میں سے مولانا عبدالرحیم پوپلزئی گیٹ، فخر افغان گیٹ۔ جگت سنگھ گیٹ۔ ڈاکٹر سید محمود گیٹ۔ سید اکبر شہید گیٹ۔ جواہر لال گیٹ۔ اور آزاد گیٹ قابل ذکر ہیں۔

۱۲ر اپریل ساڑھے آٹھ بجے شب کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی۔ ابتدا میں چند حریت افروز نظمیں پڑھی گئیں۔ بعد میں مجلس استقبالیہ کے جنرل سیکرٹری سید قائم شاہ وکیل نے ہندوستان کے مقتدر رہنماؤں کے موصول شدہ پیغامات پڑھ کر سنائے۔ جن میں مہاتما گاندھی بلبل ہند سروجنی نائیڈو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ بابا کھڑک سنگھ۔ سردار گنگا سنگھ۔ مولانا احمد سعید اور دیگر اکابرین ملت کے پیغام شامل تھے۔ اس کے بعد علی گل خان صدر مجلس استقبالیہ نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا جس میں صوبہ سرحد کی عظیم تاریخ کی چند ناقابل فراموش جھلکیاں پیش کرنے کے بعد بتایا کہ یہاں کے لوگوں

تھے ابتدا ہی سے ملک کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہر موقع پر کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کی۔ اور برطانوی سامراج کے ظلم و تشدد اور عتاب کا ہمیشہ نشانہ بنے رہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ کس طرح اس آڑے وقت میں جب کہ انگریزوں نے ہماری جماعت کو بالکل کچلنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ مسلم اکابرین کی سرد مہری نے انہیں کانگرس سے ملنے پر مجبور کیا۔ اور اس طرح ان کی سیاسی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ انہوں نے کہا ۱۹۳۰ء سے پہلے ہمارا صوبہ سرزمین بے آئین کہلاتا تھا۔ لیکن ایک آہنی مرد اور مخلص رہنما کی کوششوں اور مسلسل قربانیوں نے ہمیں اس پستی سے نکالا اور انگریزوں کو مجبور کر دیا کہ وہ یہاں اصلاحات نافذ کر کے اسے دوسرے صوبوں کے برابر کا درجہ دیں۔

انہوں نے آگے چل کر بتایا کہ حالیہ سول نافرمانی کی تحریک میں خدائی خدمت گاروں پر کیا کیا مظالم نہ توڑے گئے۔ لیکن وہ باچا خان کے بتائے ہوئے عدم تشدد کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہے اور ہر قسم کے مصائب جھیلنے پر بھی منہ سے اُف تک نہ کی۔ انہوں نے کہا حکومت نے رضاکاروں کو اشتعال دلانے کے لیئے اپنے تمام حربے استعمال کر ڈالے۔ مردان میں پر امن عوام پر گولی چلائی۔ پشاور میں رضاکاروں کو موٹروں کے نیچے روندا۔ سید اکبر خان کو لاٹھیوں سے مار مار کر شہید کر دیا۔ یہ سب باتیں ٹھنڈے سے ٹھنڈے دل و دماغ کے لوگوں کو بھی مشتعل کرنے کے لیئے کافی ہیں لیکن پٹھانوں جیسے جذباتی اور تیز طبیعت لوگوں کا ان حالات میں بھی پر امن رہنا اسی عدم تشدد کی تعلیم کا معجزہ ہے۔ جو باچا خان نے انہیں دی ہے۔ علی گل خان نے اپنے خطبۂ استقبالیہ کے آخر میں کہا ہماری تاریخ کا یہ نہایت کڑا دور ہے۔ ابھی تک ہمارے دل و دماغ پر ۱۹۴۲ء کے واقعات کا اثر ہے اور وہ زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے جو ہمیں اس جدوجہد میں اٹھانے پڑے۔ اس کے علاوہ ابھی تک ہمارے بہت سے

رہنما جیلوں میں ہیں اور سارے ملک کی نظریں ہماری اس کانفرنس پر لگی ہیں کہ ہم اپنے اہم فیصلوں سے ان کی رہنمائی کریں۔

اس کے بعد عبدالقیوم خان بیرسٹر نے کانفرنس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر سید محمود کا نام تجویز کیا جس کی تائید حکیم عبدالجلیل ندوی نے کی۔

صاحب صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں اہل سرحد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح شروع میں ہندوستان والے اور خصوصاً ہندو پٹھانوں کو ہوّا سمجھ کر ان سے ڈرتے تھے۔ لیکن باچا خان نے یہ غیریت دور کی اور پچھلے چند برسوں میں اہل سرحد کی بے نظیر قربانیوں سے انہیں تمام ہندوستان کے لوگ عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انہیں اپنا بھائی اور دست راست سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا آج مجھے اس پر تعجب نہیں کہ پٹھان نیشنلزم کے داعی بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلا نیشنلسٹ شیر شاہ سوری تھا جو ایک پٹھان ہی تھا۔ جس نے ملک میں سب سے پہلے نیشنلزم کا پرچار کیا۔ آپ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا لوگوں کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہماری قربانیاں رایئگاں گئیں۔ ان کا ثمر ہمیں ملے گا۔ اور ضرور ملے گا۔ آخر میں آپ نے ڈاکٹر خان صاحب سے کہا کہ انہوں نے یہاں دوبارہ کانگرس وزارت بنائی ہے تو انہیں کوئی کام بھی کر کے دکھانا چاہیئے۔ سب سے پہلے صوبے کے غریب اور مزدور طبقہ کی حالت سنوارنی چاہیئے۔ پھر یہاں کے پسماندہ لوگوں کی تعلیم پر توجہ دینی چاہیئے۔

۲۴ راپریل کو دوسری نشست میں سب سے پہلے ایک قرارداد کے ذریعہ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، آغالال بادشاہ، بیگم آزاد، مہادیو ڈیسائی، سید اکبر خان، سید احمد اور کامدار خان کی بے وقت موت پر اظہار افسوس کیا گیا۔ اور ان شہیدوں کو خراج تحسین ادا کیا گیا جنہوں

نے آزادی وطن کے لیئے جام شہادت نوش کیا۔

اس کے بعد باچا خان نے اپنی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ ہے :-

" جنگ آزادی کے لیئے ہمارا پروگرام وہی ہے جو پہلے تھا۔ اگر اس میں کوئی تبدیلی آئی ہے تو اس میں خدائی خدمت گاروں کا قصور نہیں۔ بلکہ قوم کا قصور ہے۔ جس نے پوری قربانی نہیں دی۔ پھر بھی خدائی خدمت گاروں نے جو قربانیاں دی ہیں وہ ہمیں اپنی منزل کے قریب لے آئی ہیں۔ اگر آپ نے میری بات مانی ہوتی اور ہماری تھوڑی سی بھی مدد کی ہوتی تو آج ہم اپنے پروگرام میں کامیاب ہوتے۔ ہماری ناکامی کا باعث آپ ہیں۔ اس ملک کی خدمت محض خدائی خدمت گاروں نے نہیں کرنی نہ ہی یہ ملک صرف خدائی خدمت گاروں کا ہے جب ملک آپ کا، ہمارا، ہم سب کا ہے تو اس کی خدمت آپ کیوں نہ کریں۔ میں پارلیمنٹری آدمی نہیں ہوں میں انقلابی آدمی ہوں۔ جو لوگ میرے ساتھ جیل میں رہے ہیں۔ وہ میرے خیالات سے اچھی طرح واقف ہیں جو لوگ جیلوں سے رہا ہوئے۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ وہ آرام سے گھروں میں نہ بیٹھیں۔ اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو صرف آواز ہی بلند کریں۔ لیکن آپ سے یہ بھی نہ ہو سکا آپ سے صرف آواز بھی نہ اٹھائی گئی۔ آپ لوگ تالیاں بجاتے ہیں میں تالیوں سے خوش نہیں ہوتا میں تو عملی آدمی ہوں اور عمل سے خوش ہوتا ہوں کئی لوگ اپنے آپ کو بزرگ اور بڑے عالم کہتے ہیں۔ لیکن قوم کے لیئے کچھ بھی نہیں کرتے۔ آج ملک میں کئی پارٹیاں بن

چکی ہیں اور کئی طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ لیکن ہمارا وہی نصب العین ہے جو پہلے تھا۔ اب میرا پروگرام یہ ہے کہ آپ میں جو مایوسی پیدا ہو چکی ہے اسے دور کروں عدم تشدد میں شکست اور مایوسی کا نام بھی نہیں۔

جو لوگ میرے ساتھ رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وزارت تو ایک طرف رہی میں تو الیکشن کے بھی خلاف تھا۔ آخر جنگ کے دوران میں الیکشن کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن جیل میں جب میں نے آپ کی دعائیں اور ختم دیکھے تو میں اس وقت سمجھ گیا کہ آپ وزارت چاہتے ہیں۔ دراصل آپ جیل کی زندگی سے تنگ آ گئے تھے۔ میں اس وقت آپ کی نیت تاڑ گیا۔ میرے سامنے کبھی تاریکی نہیں ہوتی میں سمجھتا ہوں وزارت میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ ملک اور قوم کی خدمت کر سکے۔ اس لیئے اس سے میرا اختلاف ہے۔ اور اسی لیئے میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

جو لوگ جیل سے باہر تھے اور جن کا عقیدہ پارلیمنٹری پروگرام پر ہے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اس سے ہم عوام کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ چونکہ میں خدا کی خدمت گار ہوں اس لیئے میں نے کہا اگر تم اس میں قوم کی بھلائی سمجھتے ہو تو میں تمہارے راستے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا۔ کچھ لوگ آتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ بادشاہ خان ہم جو کچھ کرتے ہیں آپ کے لیئے کرتے ہیں۔ لیکن میں کس کے لیئے کرتا ہوں اگر میرے لیئے کوئی کام کرتا ہے تو بالکل نہ کرے اگر آپ خدا کے لیئے کر سکتے ہیں تو کریں میں بھی جو کچھ کرتا ہوں خدا کے لیئے کرتا ہوں۔ میرا کسی پر احسان نہیں۔

میں نے اغوا، ڈاکے وغیرہ دُور کرنے کے لیے قبائل میں وفد بھیجا۔
لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔ کہ اس میں حکومت کا کیا نقصان
ہے۔ میں دعوت دیتا ہوں کہ اگر حکومت ایمانداری سے یہ مسئلہ حل کرنا چاہتی
ہے تو ہم اسے اپنا تعاون پیش کرتے ہیں۔ اگر میری تجاویز پر عمل کیا جائے
تو تھوڑے ہی عرصہ میں وہ لوگ جنہیں ہندوستان کا دشمن کہا جاتا ہے۔
ہندوستان کے دوست کہلائیں گے۔"

باچا خان کے بعد بھولا بھائی ڈیسائی، بابا موہن سنگھ لاگا، مفتی ضیا الحسن، عبدالصمد خان اچکزئی، اخیر محمد جلالی، مولانا داؤد غزنوی، ڈاکٹر کچلو اور حکیم عبدالجلیل ندوی نے تقریریں کیں۔

۲۳ر اپریل کو تیسرے اجلاس میں امیر محمد خان پارلیمنٹری سیکرٹری نے ایک ریزولیوشن پیش کیا جس میں مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وزیرستان پہ بمباری کا سلسلہ بند کیا جائے اس کے بعد پیر شہنشاہ، خلیفہ فضل دین، شری متی امر کور، چودھری محمد شفیع، جبر چند کھنہ نے تقریریں کیں۔ ان کے بعد شیخ عبداللہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"میں آپ کے سامنے صرف کشمیر کی نمائندگی نہیں کر رہا۔ بلکہ ہندوستان کی
۵۰۰ ریاستوں کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ انگریزوں نے ہندوستان کو دو حصوں
میں تقسیم کر رکھا ہے ایک ریاستی ہندوستان دوسرا برٹش انڈیا ——
ریاستی ہندوستان میں ۱۰ کروڑ ہندو مسلمان اور سکھ بستے ہیں جن پر صرف
غلامی کا بوجھ ہی نہیں بلکہ وہ بے چارے چکّی کے دو پاٹوں میں پیسے
جا رہے ہیں۔ جہاں تک آل انڈیا کانگرس کا تعلق ہے مہاتما گاندھی یا کانگرس
کہتی ہے کہ ریاستی لوگ اپنی قسمت آپ بنائیں۔ ہم ان کے معاملہ میں

دخل دینا نہیں چاہتے لیکن ریاستوں کے ۸ کروڑ بدقسمت لوگ ہندوستان کے معاملات سے بیگانہ نہیں بلکہ اس ملک کی غلامی کو اپنی غلامی سمجھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود، عبدالغفار خان کے علم وفضل اور خدمات وقربانیوں کو جانتے ہوئے بھی صحیح بات یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان انہیں مذہبی مسلمان نہیں سمجھتے بلکہ پولیٹیکل مسلمان سمجھتے ہیں۔ مسلمان اندھا نہیں ہے لیکن وہ اس کے باوجود جناح کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ جو نہ علم وفضل نہ قربانی میں ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی جب محمد علی جناح کوئی آواز اٹھاتا ہے کروڑوں مسلمانوں کی نگاہیں اُن کی طرف اٹھتی ہیں۔ جب تک یہ باتیں آپ نہیں سوچیں گے کامیابی مشکل ہے۔ جناح کی لیڈر شپ غلط ہے تو اسے ہٹائیں صحیح ہے تو اسے اچھا کہیں۔

آخر میں ڈاکٹر سید محمود نے شیخ عبداللہ کی تقریر کو بہت اہم قرار دیتے ہوئے کہا۔ شیخ صاحب نے مسٹر محمد علی جناح کی شخصیت کی طرف لوگوں کو غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ آخر مسلمانوں میں وہ روز بروز کیوں مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہندو مسلمانوں کو بھائی چارے سے اس ملک میں رہنا چاہیے۔ اور آزادی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ ہندو اتنے احمق نہیں ہوں گے کہ وہ مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش کریں نہ ہی مسلمان اتنا آسانی سے مٹ سکتے ہیں۔ اگر ہندوؤں نے ایسی بیوقوفی کی تو مسلمان بڑی تعداد میں ان کا مقابلہ کریں گے۔ آخر ہم دس کروڑ مسلمانوں کو ہندو حلوہ بنا کر تو نہیں کھا سکتے۔ اگر مسلمانوں کے فائدے کی چیز پاکستان ہے تو وہ

ضرور ہونا چاہیئے۔ گاندھی جی بھی کہتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی مسلمانوں کے لیئے یہ مفید چیز ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ کانگرس کے ذمہ دار مسلمانوں کی زبان سے مسلم لیگ کے خلاف ایک لفظ بھی نکلے تو ہماری زبانیں کاٹ لیں۔ ہندوؤں کے پاس اتنا روپیہ بھی نہیں جس سے وہ عبدالغفار خان، مولانا ابوالکلام آزاد یا مجھے خرید سکیں۔ اگر کوئی دوسرا ادارہ آزادی کے حصول کے لیئے ہو تو ہم اس میں جانے کے لیئے تیار ہیں"

صاحب صدر کی تقریر کے ساتھ ہی ۲۳ر اپریل کی شام کو یہ تاریخی کانفرنس ختم ہو گئی۔ کانفرنس کے درمیان میں تفریح کی غرض سے خٹک ڈانس، مشاعرے اور ڈرامے کا اہتمام بھی کیا گیا مشاعرے اور ڈرامہ کے منتظم عبدالاکبر خادم مرحوم تھے۔ جو تحریک کے بہت بڑے رہنما اور مشہور پشتون شاعر گذرے ہیں۔

صوبہ سرحد میں کانگرس کے زوال کے اسباب

سرحد اسمبلی کے دس کانگرسی ممبروں کے جیل سے رہا ہوتے ہی مارچ ۱۹۴۵ء میں دوبارہ کانگرس وزارت کی تشکیل کی گئی۔ اس وزارت میں ایک وزیر مہر چند کھنہ بھی لیا گیا۔ جو ایک متعصب ہندو تھا اور ہمیشہ مہاسبھائی گروہ اور سرکار پرست حلقے میں رہا تھا۔ اس سے کانگرس وزارت کے متعلق لوگوں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں . . . . اور مخالفین کو اعتراض کرنے کا اور زیادہ موقع ملا۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر خان صاحب نے ایک سکھ لفٹنٹ کرنل سردار جسونت سنگھ سے اپنی لڑکی کو سول میرج کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ بات کانگرس کے مسلمان رہنماؤں

کو سخت ناگوار گذری اور ارباب عبدالغفور جیسے مخلص اور دیرینہ کارکن اور ان کے بعض ساتھی محض اس اختلاف کی بنا پر جماعت سے کٹ گئے اور بعد میں مسلم لیگ میں جا شامل ہوئے حالانکہ یہ بالکل ایک نجی سا معاملہ تھا۔ لیکن مخالفین نے اسے سکینڈل بنا کر اس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں بمبئی میں آل انڈیا کانگرس کے سالانہ اجلاس میں ڈاکٹر اشرف نے مسلمانوں کے حق خود ارادیت کی ایک قرارداد پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ صوبہ سرحد کے بعض کانگرسی مسلمان رہنما اور کارکن بھی اس قرارداد کے حق میں تھے لیکن جب تگ و دو کے بعد یہ قرارداد اس اجلاس میں پیش کرنے کی اجازت حاصل کر کے ڈاکٹر اشرف اسے پیش کرنے کے لئے اٹھے تو جلسہ میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ اور قرارداد پیش نہ کی جا سکی۔ اس واقعہ سے ان لوگوں کو بڑا شاق ہوا۔ اور اجلاس سے واپسی پر وہ کانگرس سے علیحدہ ہو کر مسلم لیگ میں آ گئے جن میں پشاور کے مشہور سیاسی کارکن الٰہی بخش برقی اور ان کے ساتھی بھی شامل تھے۔

کانگرس وزارت بننے کے ساتھ ہی کانگرسی کارکنوں اور رہنما کاروں نے اپنی کوششیں اس کے لیے وقف کر دیں کہ اپنی وزارت سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھایا جائے۔ صوبہ بھر کے ہزاروں لاکھوں خدائی خدمت گاروں میں سے ہر ایک یہی چاہتا کہ اسے اپنی قربانیوں کا کچھ نہ کچھ صلہ ضرور ملنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ان سب کو خوش کرنا اور ان کی خواہش پوری کرنا وزارت کے بس کا روگ نہیں تھا۔ نتیجہ کے طور پر بہت سے لوگ ناراض ہو کر جماعت سے الگ ہو گئے۔ اور بعض تو کھلم کھلا مخالف صفوں میں چلے گئے۔ بعض نے جا و بے جا اعتراضات شروع کر دیئے اور جنہیں کچھ ملا وہ بھی جلب زر کے چکر میں پھنس کر ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئے۔

باچا خان کی دوربین نظروں کو یہ تمام باتیں پہلے ہی سے نظر آ رہی تھیں اور اس

لیے وہ حصول وزارت کے حق میں نہیں تھے۔ چنانچہ وہی ہوا جس کی انہوں نے پیشین گوئی کی تھی یعنی تحریک کو ضعف پہنچا اور یہ سودا کافی مہنگا پڑا۔

ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں بعض متعصب ہندوؤں نے مسلمانوں سے سوتیلی ماں کا سا سلوک شروع کر دیا۔ اور ان کے معاندانہ رویہ نے مسلمانوں کو بہت حد تک کانگرس سے بدگمان کر دیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں ہندو سبھا نے مسلمانوں کی مخالفت پر کمر باندھ کر تعصب و منافرت کا وہ بیج بویا جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل کر دی۔ ملک میں جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات ہونے لگے۔ اور روز بروز وہ ایک دوسرے سے دُور ہوتے گئے

شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے سارے ملک کی فضا میں فرقہ وارانہ زہر پھیلا دیا اور بعض تنگ نظر اور فرقہ پرست ہندوؤں نے مسلمانوں کے مذہب اور ان کے پیشواؤں کے خلاف دل آزارانہ کتابیں لکھ کر ان میں بے اعتمادی کا ایسا ناسور پیدا کر دیا جس کا علاج ناممکن تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ان تمام باتوں میں انگریز حکمرانوں کا ہاتھ تھا۔ انہوں نے ایک سوچی سمجھی ہوئی پالیسی کے مطابق بعض خود غرض لوگوں کو آلۂ کار بنا کر فرقہ وارانہ آگ کو ہوا دی اور ہندوستان میں متحدہ قومیت کے نظریئے کو ناکام بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

لیکن کانگرس کی فرو گذاشتوں اور بعض ذمہ دار ہندو لیڈروں کی غلط روی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ مسلمان ہندوؤں سے بددل ہوتے گئے اور کانگرس سے مایوس ہو کر مسلم لیگ کی طرف مائل ہوتے گئے اور مسلم لیگ روز بروز مضبوط ہوتی

گئی۔ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بنتی گئی اور پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا گیا اور آخر یہ مطالبہ اتنی ہمہ گیری اختیار کر گیا کہ ہندوستان کی تقسیم کو کسی قیمت پر نہ منظور کرنے والی کانگرس جماعت کو بھی مسلم لیگ کے اس مطالبے کو تسلیم کرنا پڑا اور قیام پاکستان کا منصوبہ جسے دیوانے کا خواب کہا جاتا تھا آخر ایک اٹل حقیقت بن کر سامنے آیا۔

باچا خان پر پنجاب میں داخل ہونے کی ممانعت

۲۸ر جولائی ۱۹۳۸ء میں باچا خان ضلع ہزارہ کے دورے پر روانہ ہوئے تو اٹک کے پل پر پولیس نے آپ کو علاقہ چھچھ (پنجاب) میں اپنے دوستوں سے ملاقات کرنے کی اجازت نہ دی۔ اور آپ کو پولیس کی حراست میں کوہاٹ پہنچایا گیا۔ جہاں سے ایبٹ آباد بھیج دیا گیا۔ حالانکہ ان دنوں صوبہ سرحد میں کانگرس وزارت قائم تھی۔ اور حکومت کو آپ کی جماعت کا تعاون حاصل تھا۔ مندرجہ ذیل بیان آپ نے ۳۰ر جولائی کو ایسوسی ایٹڈ پریس کو دیا جس میں اپنی حراست کی داستان خود ہی پوری تفصیل سے بیان کی ہے۔

"اٹک پر میرے ساتھ جو سلوک ہوا ہے۔ اس کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور اٹک کی پولیس ذمہ دار ہے میرا قطعاً ارادہ نہ تھا کہ پنجاب گورنمنٹ کی خواہش کے خلاف کسی پبلک جلسہ میں تقریر کروں جیسا کہ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اٹک کے اس نوٹس کے جواب میں لکھا تھا۔ جس کی تعمیل مجھ سے کرائی گئی تھی۔ لیکن میں کسی ایسے حکم کی تعمیل کے لئے تیار نہ تھا۔ جس کا مقصد مجھے ایک پُرامن شہری کی حیثیت میں اپنے دوستوں سے ملاقات کرنے کے حق سے بھی محروم کرتا ہو۔

جب میں اٹک کے پل کے قریب پہنچا۔ تو مجھے ایک حکم امتناعی دکھایا گیا

جو میں نے دستخط کر کے واپس کر دیا۔ اور پل پار کر کے جب پنجاب کی حدود میں پہنچا تو مجھے پھر وہی نوٹس دکھایا گیا۔ وہاں کچھ پولیس افسر جو ایک کار میں سوار تھے میری طرف بڑھے اور شیر نے کو کہا جب میری کار کھڑی ہو گئی تو ایک پولیس افسر نے کہا کہ اگر ڈرائیور نے اب کار چلائی تو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس پر میں اپنی کار سے اتر پڑا۔ اور پیدل کیمبل پور کی طرف روانہ ہوا۔ اور ایک درخت کے سائے تلے اپنا بستر لگا دیا چونکہ تھکا ہوا تھا۔ جلد ہی سو گیا، آنکھ کھلی تو بھوکا اور پیاسا تھا۔ میں نے پولیس افسروں سے کہا کہ وہ میرے لیئے کھانے کا انتظام کریں۔ مگر انہوں نے جواب دیا کہ چونکہ آپ زیر حراست ہیں اس لیئے ہم کھانے کا بندوبست نہیں کر سکتے۔ جب میں نے کہا کہ میں قریبی گاؤں میں کھانے کے لیئے جانا چاہتا ہوں۔ تو مجھے وہاں جانے سے بھی روک دیا گیا۔

اتنے میں ایک سکھ کانسٹیبل میرے پاس آیا اور بولا ہم بڑے خوش نصیب ہیں کہ آپ کے درشن نصیب ہوئے۔ اس پر میں نے حیران ہو کر کہا کہ یہ پہلا موقعہ ہے کہ مجھ پر رائفلوں اور لاٹھیوں کے استعمال کرنے والے گروہ کے آدمی بھی میرا درشن کرنے آئے ہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میں نے ایک یوروپین افسر کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ جو پنجابی بولتا تھا۔ وہ مجھے سنہ ۱۹۳۰ء سے جانتا تھا جب کہ وہ چارسدہ میں تھا۔ (اور اب میرے ساتھ آنکھیں ملانے سے شرم محسوس کر رہا تھا)

میں نے اسے کہا کہ میرا اگر بڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں بشرطیکہ آپ مجھے تنگ نہ کریں۔ لیکن آپ نے اگر غیر معقول رویہ اختیار کیا تو میں کسی خراب نتیجے کا ذمہ دار نہیں جب اس نے میری بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ تو مجھے مجبوراً خدائی خدمت گاروں کو بلانا پڑا مگر ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ایک اور یورپین افسر نے جو شاید ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا مجھے آکر کہا کہ آپ گرفتار کر لیئے گئے ہیں۔

میں خوش تھا کہ اب جیل میں کچھ لکھانے کو تو ملے گا۔ اور آرام بھی میسر ہوگا مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مجھے خوش حال گڑھ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ رات کے ۱۰ بجے ہوں گے جب ہم جنڈ پہنچے اس وقت موٹر کی روشنی فیل ہوگئی اور اس خطرے سے کہ کوئی حادثہ پیش نہ آئے کار وہیں کھڑی کر دی گئی۔ اور پولیس افسر کھانا کھانے لگے۔ مجھے بھی انہوں نے ایک چپاتی دی جو میں نے دودھ کے ساتھ کھائی۔

رات کے ایک بجے ہم خوش حال گڑھ کے پل پر پہنچے جہاں میں نے سرحدی پولیس کے ساتھ برج میں رات کاٹی اب میں آزاد تھا۔ صبح کی نماز کے بعد میں نے خدائی خدمت گاروں کے ساتھ چائے پی۔ اور بذریعہ ٹرین کیمبل پور گیا چونکہ میرے پاس کوئی پیسہ نہ تھا اس لیئے میں نے ٹکٹ نہ خریدا اور اس کے ساتھ ہی میرا یہ خیال بھی تھا کہ چونکہ گورنمنٹ مجھے یہاں میری مرضی کے خلاف لائی تھی اس لیئے مجھے ایبٹ آباد کا ٹکٹ خرید کر دے گی جہاں میں جانا چاہتا تھا۔ جب میں کیمبل پور پہنچا۔ تو

پولیس نے مجھے ایک فوجی لاری میں بٹھایا اور ایبٹ آباد لے آئی جہاں مجھے سرحدی پولیس کے حوالے کر دیا۔ جیسے میں کوئی بدمعاش تھا اس کے بعد مجھے رہا کر دیا گیا۔"

اسی سال ۲۵؍ ستمبر ۱۹۲۵ء کو آپ نے دوبارہ ضلع ہزارہ کے دورے کا ارادہ کیا اور علاقہ چھچھ کے پٹھان بھائیوں سے ملاقات کا پروگرام بنایا اس کے لیئے آپ نے تحصیل صوابی کے کچھ خدائی خدمت گاروں کو وہاں بھیجا کہ ان لوگوں کو باچا خان کی آمد کی اطلاع دیں کہ سب لوگ ایک جگہ جمع ہوں تاکہ باچا خان کو ان سے ملنے میں آسانی ہو۔ آپ نے اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ آپ وہاں کسی جلسے میں تقریر وغیرہ نہیں کریں گے۔ ۲۴؍ جولائی کو چارسدہ ہی میں ڈپٹی کمشنر کیمبل پور کی طرف سے آپ سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی گئی۔ کہ آپ اٹک کے ضلع میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اسی شام کو آپ پشاور آ گئے اور دوسری صبح امیر محمد خان۔ علی گل خان اور محمد امین جان کے ہمراہ موٹر میں روانہ ہوئے اٹک کے پل پر حسب سابق پولیس نے انہیں روک لیا۔ لطف یہ کہ انہیں روکنے والی سرحد پولیس تھی۔ حالانکہ سرحد میں کانگرس وزارت برسر اقتدار تھی۔ چنانچہ جب ادھر ادھر ٹیلیفون کرنے کے بعد سرحدی پولیس نے انہیں جانے دیا تو آگے پنجاب پولیس نے روک لیا اور گرفتار کر کے پہلے کی طرح خوش حال گڑھ لائے اور وہاں سے ایبٹ آباد پہنچا کر رہا کر دیا۔

کشمیر نیشنل کانفرنس

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی صدارت میں ۳؍ اگست ۱۹۲۵ء کو بمقام سوپور کشمیر نیشنل کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں باچا خان نے شرکت کی۔ اس سے پہلے سنہ ۱۹۲۰ء میں بھی کشمیر نیشنل کانفرنس میں آپ شامل ہوئے تھے۔ اس دفعہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کشمیر کے لوگوں کو بتایا کہ نیشنل کانفرنس

کے قیام سے پہلے کشمیر کی حالت کتنی ابتر تھی۔ لیکن نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد گذشتہ سولہ برسوں میں شیخ عبداللہ کی مسلسل جدوجہد نے کشمیر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

اس کانفرنس میں پنڈت نہرو بھی شریک ہوئے، باہر سے آئے ہوئے تمام مہمانوں کا دریائی جلوس نکالا گیا۔ لیکن ڈوگرہ حکومت نے اپنے زرخرید ایجنٹوں کے ذریعے ان کے خلاف شدید مظاہرے کرائے اور مظاہرین نے اس جلوس پر سنگ باری بھی کی۔

اس سنگ باری پر بابا خان نے ناراض ہونے کے بجائے خوشی کا اظہار کیا اور کہا شکر ہے کہ کشمیریوں جیسی مردہ قوم میں اتنی جرأت تو پیدا ہوئی کہ وہ پتھر برسانے کے قابل ہوئے ورنہ یہاں سیاسی تحریکوں سے پہلے تو بیرونی لوگوں کی صورت دیکھ کر ہی ڈر جاتے تھے۔

اس سنگ باری سے پنڈت نہرو اور شیخ عبداللہ کو کچھ زخم بھی آئے تھے۔ اور پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں ڈوگرہ حکومت کی اس ذلیل اور گھٹیا حرکت کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا۔

'کشمیری بھائیو! شیخ عبداللہ نے تمہیں نئی زندگی دی ہے خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسا لیڈر دیا جو تمہارے لیئے دنیا کی ہر طاقت سے ٹکر لینے کو تیار ہے۔ ڈوگرہ حکومت نے تمہیں جانوروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اس کی کوششوں سے تم آج پھر انسانوں کے روپ میں نظر آ رہے ہو لیکن افسوس ہے کہ تم نے اس کی قدر نہ کی اور حکومت کے ہاتھوں بک کر آج

اسی شخص کی مخالفت کر رہے ہو جو تمہارا سچا دوست
بھی ہے اور محسن بھی ـــــــ"

یہ الفاظ اسی پنڈت نہرو کے ہیں جس نے ہندوستان کی حکومت سنبھالنے کے بعد گذشتہ آٹھ برس سے نہ صرف کشمیر پر ڈوگرہ راج مسلط کر رکھا ہے بلکہ اپنے پرانے ساتھی اور کشمیریوں کے سچے دوست اور محسن کو پابہ زنجیر کر رکھا ہے۔

پاکستان کے متعلق باچا خان اور اُن کی پارٹی کا آخری فیصلہ

جب قیام پاکستان کے امکانات صاف نظر آنے لگے۔ تو بنوں میں پراونشل کانگرس پارٹی کی ایک تاریخی میٹنگ ہوئی جس میں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ پاکستان جس کے قیام کے امکانات اب صاف نظر آرہے ہیں اگر مستقبل قریب میں قائم ہوجائے تو خدائی خدمت گار جماعت اور کانگرس کا رویہ کیا ہونا چاہیئے بہت سے ایسے لوگ جو قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوکر بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر پہنچے۔ اس وقت کانگرس اور خدائی خدمت گار تحریک سے وابستہ تھے۔ اور پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ اس میٹنگ میں یہ لوگ یہ تجویز پیش کرنے میں پیش پیش تھے کہ ہمیں آزاد قبائلی علاقے میں ہجرت کر جانا چاہیئے اور وہاں قبائل کو اکسا کر پاکستان پر حملہ کرکے اسے ختم کردینا چاہیئے۔ لیکن باچا خان نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور کہا ہم صرف ملک کی آزادی چاہتے تھے وہ خواہ کسی صورت میں بھی ملے ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیئے۔ اس پر اس گروپ نے باچا خان کی شدید مخالفت کی۔ اور اپنی اسی بات پر اڑے رہے کہ پاکستان کے خلاف بغاوت کرنی چاہیئے۔ آخر باچا خان اس میٹنگ میں یہ تجویز پاس کرانے میں کامیاب ہوگئے کہ ہمیں خاموشی سے حالات کا

جائزہ لینا چاہیئے اور غیر جانب دار رہ کر دیکھنا چاہیئے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے اور اس کے بعد حالات کے مطابق سوچ سمجھ کر وہ راستہ اختیار کرنا چاہیئے جو مناسب و موزوں ہو اور ملک اور قوم کے لیے مفید ہو۔ باچا خان نے کہا اگر پاکستان بن گیا تو ٹھیک ہے ہم اپنی اصلاحی تحریک خدائی خدمت گار کو چلائیں گے اور سیاست سے تعرض نہیں کریں گے۔

لطف یہ کہ پاکستان بنتے ہی وہی لوگ جو اس وقت پاکستان کی مخالفت میں سب سے آگے تھے اور بغاوت کرنے پر تلے ہوئے تھے پاکستان کے دوست بن گئے اور وزارتیں، صدارتیں حاصل کر لیں اور دوسروں پر پاکستان دشمنی کا الزام لگاتے ہوئے انہیں ذرا شرم نہ آئی۔

قیام پاکستان

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء

کانگرس اور مسلم لیگ میں سمجھوتے کی کوشش

۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور ہٹلر نے تمام چھوٹے چھوٹے یورپی ممالک پر قبضہ جمانے کے بعد اپنی تمام توجہ انگلستان کی طرف مبذول کر دی۔ اور رات دن کی خوفناک بمباری سے لندن کے در و دیوار ہلا دیئے۔ تو انگریزوں کو اپنی تباہی صاف نظر آنے لگی وہ بوکھلا گئے۔ اور انہوں نے ہندوستانی عوام کے تعاون کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے ہوئے وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کو خاص ہدایت بھیجی۔ کہ ہندوستانی رہنماؤں سے سمجھوتے کی کوئی صورت نکالی جائے

چنانچہ ۴ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے ہند کی دعوت پر گاندھی جی اور قائد اعظم محمد علی جناح نے یکے بعد دیگرے وائسرائے سے ملاقاتیں کیں۔ گاندھی جی نے اس ملاقات کے بعد جنگ میں برطانیہ کی امداد کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا۔ کہ اس آڑے وقت میں انگریز کانگرس کے تعاون کو غنیمت سمجھتے ہوئے تمام اختیارات اسے سونپ دیں گے۔ لیکن وائسرائے نے کانگرس کے ہندوستان

کی نمائندگی کے دعوے کو تسلیم نہ کرتے ہوئے ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو فرداً فرداً بلایا۔ اور ان سے اس سلسلہ میں تبادلۂ خیال کیا۔ یہ ملاقاتیں وسط اکتوبر تک جاری رہیں۔ اس کے بعد وائسرائے نے گاندھی جی اور قائداعظم کو خصوصی طور پر گفت و شنید کے لیئے بلایا۔ تاکہ ان سے سمجھوتہ کرنے اور جنگ میں امداد حاصل کرنے کے متعلق کوئی راہ نکالی جائے۔ لیکن جب یہ دونوں رہنما کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔ تو وائسرائے نے انہیں دو روز کی مہلت دی کہ وہ آپس کی گفتگو کے بعد کوئی متحدہ سمجھوتے کی شرائط پیش کریں۔

اب یہ دونوں رہنما سر جوڑ کر بیٹھے۔ گاندھی جی نے جو سمجھوتے کا مسودہ قائداعظم کو پیش کیا۔ اس میں مندرجہ ذیل شرائط تھیں۔

> ہندوستان اس شرط پر برطانیہ کو جنگ میں امداد دینے کو تیار ہے۔ کہ برطانیہ جنگ کے اختتام پر ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد کر دے۔ اور تمام اختیارات ہندوستانیوں کو سونپ دے۔

قائداعظم نے اس مسودہ میں ترمیم چاہی۔ اور اس بات پر زور دیا۔ کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ اور واضح طور پر اس بات کا اظہار کیا جائے۔ کہ آزاد ہندوستان کا نظام حکومت مسلم لیگ کے مشورہ کے بغیر نہیں بنایا جائے گا۔ گاندھی جی کو قائداعظم کی یہ شرائط منظور نہیں تھیں۔ اس لیئے کہ اگر وہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کر لیتے تو کانگرس کی حیثیت ہندو جماعت کی رہ جاتی۔ اس طرح ایک طرف اس کا نیشنل جماعت ہونے کا دعوے باطل ہو جاتا۔ تو دوسری طرف نیشنلسٹ مسلمان اس سے بگڑ جاتے کیونکہ تمام عمر نیشنل کانگرس میں مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت میں رہنے اور بیش بہا قربانیاں

دینے کے بعد مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرنے سے نیشنلسٹ مسلمانوں کی حیثیت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی۔ اور یہ ایک بڑا سیاسی حادثہ تھا۔

قائد اعظم ایسے بے لچک انسان نے کانگرس کے لیے ایسی مشکل پیدا کر دی تھی۔ کہ جسے مہاتما گاندھی، جواہر لال۔ مولانا ابو الکلام آزاد اور باچا خان ایسے دانش ور کانگرسی رہنما بھی حل کرنے سے قاصر تھے۔ قائد اعظم اپنی بات پر اڑے رہے۔ حالات و واقعات نے بھی خوش قسمتی سے ان کا ساتھ دیا۔ انگریز سامراج کی انتشار پسندانہ پالیسی بھی ممد ثابت ہوئی۔ دو قوموں کا نظریہ تقویت حاصل کرتا گیا۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی حمایت حاصل ہوتی گئی۔ اور قائد اعظم روز بروز اپنے مطالبے پر اور زیادہ سختی اور زیادہ مضبوطی اور ثابت قدمی سے جمے رہے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی اور دوسرے کانگرسی زعماء کی قائد اعظم سے سمجھوتہ کے سلسلہ میں تمام تر کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ معاملہ آخری مرحلے پر آ پہنچا تھا۔ انگریز ہندوستان کو آزادی دینے پر رضامند ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ملک کی باگ ڈور صرف کانگرس کے ہاتھوں میں دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ جماعت مان چکا تھا۔ اور کانگرس سے یہ بات منوانے کے لیے اسے مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے کا آخری موقع دے رہا تھا۔

گاندھی جی نے قائد اعظم سے سمجھوتہ کرنے کی بہت کوششیں کیں۔ لیکن وہ اپنے مطالبات سے ایک انچ ادھر ہونے کو تیار نہیں تھے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی تھک ہار کر مایوس ہو گئے۔ سچ پوچھیے تو انہیں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ماننے میں بھی تامل نہ تھا۔ لیکن ان کی راہ میں نیشنلسٹ مسلمان حائل تھے۔ اور ان کے لیے ناممکن تھا۔ کہ وہ عمر بھر کے ان جانثار ساتھیوں کو نظر انداز کر دیں۔

چنانچہ جب یہ دونوں رہنما کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ تو دونوں نے اپنی علیحدہ علیحدہ شرائط پیش کر دیں۔ قائد اعظم کی شرائط یہ تھیں:۔

۱- ۱۹۳۵ء ایکٹ کو منسوخ کیا جائے۔

۲- مسلم لیگ کے بغیر ہندوستان میں کوئی نظام مرتب نہ ہو۔

۳- مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔

۴- ہندوستانی افواج اسلامی ممالک کے خلاف استعمال نہ کی جائیں۔

۵- فلسطین کی آزادی کا اعلان کیا جائے۔

ان تمام شرائط کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وائسرائے نے گاندھی جی کے مطالبات تو یکسر مسترد کر دیئے اور قائداعظم کے مطالبات بھی تمام کے تمام منظور نہ کیئے۔ جس کی وجہ سے مسلم لیگ نے ایک طرف جنگ میں امداد دینے سے انکار کر دیا۔ تو دوسری طرف کانگرس نے بھی عدم تعاون کا فیصلہ کیا۔ اور ساتھ ہی کانگرس کی تجویز پر ۳۱ر اکتوبر ۱۹۳۹ء میں ملک کی تمام کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔

کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہوتے ہی مسلم لیگ نے حکومت سے عدم تعاون کا فیصلہ کرنے کے باوجود وزارت سازی کی مہم شروع کر دی۔ اور کانگرسی اراکین اسمبلی کی گرفتاری کے بعد وہ چند صوبوں میں اپنی وزارتوں کے قیام میں کامیاب ہو گئی۔

مسلم لیگ نے ہندو کانگرسی وزرا پر جو الزامات لگائے وہ یہ تھے۔

۱- بندے ماترم گانے کے لیئے مسلمانوں کو مجبور کیا گیا

۲- اُردو مدارس بند کر دیئے۔

۳- ہندوؤں کے تیوہاروں پر مسلمانوں پر پابندیاں لگا دی گئیں۔

۴- مسلم بچوں کے لیئے ایسا نصاب بنایا۔ جس میں ہندو راجاؤں، اوتاروں اور گاندھی جی کے اہنسا کے اصولوں کی تعریف کی گئی۔

۵- گاؤ کشی ممنوع قرار دے دی۔

۶۔ مسلمانوں پر ناجائز ٹیکس لگائے۔

۷۔ مساجد کی بے عزتی کی گئی۔

۸۔ وہ ہندو جو مسلمانوں کے قتل میں ماخوذ تھے رہا کر دیئے گئے

کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے پر مسلم لیگ نے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات منایا۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس ہوا۔ جس میں تمام ہندوستان کے مسلم لیگی رہنما اور کارکن جمع ہوئے اس جلسے میں سب سے پہلے لفظ "پاکستان" کی وضاحت کی گئی۔ کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ان علاقوں کو پاکستان کا نام دیا جائے۔ اور یہ علاقے مسلمانوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اس اجلاس میں قرارداد پاکستان پاس کی گئی۔ اور اعلان کیا گیا۔ کہ مسلمان اس کے سوا اور کسی چیز پر ہرگز رضامند نہیں ہوں گے۔

اس کے بعد مسلم لیگ اور کانگرس میں کشیدگی بڑھ گئی۔ اور دونوں جماعتوں کے رہنما اپنے جلسوں میں کھلم کھلا ایک دوسرے کی مخالفت کرنے لگے۔ برا بھلا کہنے لگے اور الزامات عائد کرنے لگے

۱۹۴۱ء میں وائسرائے ہند نے ایک مشاورتی کونسل قائم کی۔ جس کا کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے بائیکاٹ کیا۔

۱۹۴۲ء میں سر کرپس کی قیادت میں ایک وفد حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کی تقسیم کا مسودہ لے کر یہاں وارد ہوا۔ اس مسودہ پر ابھی سوچ بچار ہو رہا تھا۔ کہ کانگرس نے (QUIT INDIA) "ہندوستان سے نکل جاؤ" کا ریزولیوشن پاس کیا۔ اور ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو تمام کانگرسی رہنما گرفتار کر لیئے گئے۔

۱۹۴۴ء میں گاندھی جی جیل میں شدید بیمار ہو گئے۔ جس کی بنا پر انہیں رہا کر دیا گیا۔ اس دفعہ گاندھی جی نے پھر قائداعظم سے مل کر سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود ثابت ہوئی۔

شملہ کانفرنس

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے بن کر آئے۔ اور اپنے ساتھ کچھ نئی تجاویز بھی لائے۔ جون ۱۹۴۵ء میں تمام کانگرسی رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد وائسرائے نے شملہ میں کانگرسی اور مسلم لیگی رہنماؤں کی ایک کانفرنس طلب کی۔ جس میں کانگرس کی طرف سے گاندھی جی، جواہر لال نہرو۔ باچا خان مولانا ابو الکلام آزاد، راج گوپال اچاریہ اور راجندر پرشاد نے شرکت کی۔ اور مسلم لیگ کی جانب سے قائد اعظم، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر۔ حسین شہید سہروردی۔ حسین امام اور سر غلام حسین شامل ہوئے۔ ان کے علاوہ سکھوں اور اچھوتوں کے ایک ایک نمائندے کو بھی بلایا گیا۔

شملہ کانفرنس میں کانگرس اور مسلم لیگ کے سمجھوتے کی آخری کوشش کی گئی اور کوئی صورت بن نہ پڑی۔ تو وائسرائے نے تجویز پیش کی۔ کہ مرکز میں ایک نمائندہ حکومت بنائی جائے۔ جس میں پانچ ہندو، پانچ مسلمان، ایک سکھ، ایک پارسی اور ایک اچھوت نمائندہ شامل ہوں گے۔

قائد اعظم نے یہ تجویز منظور کرتے ہوئے کہا کہ یہ پانچ مسلمان نمائندے مسلم لیگی ہوں۔

کانگرس نے مطالبہ کیا۔ کہ پانچ مسلمان نمائندوں میں سے چار مسلم لیگی اور ایک کانگرسی مسلمان ہو قائد اعظم اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔ اور کانگرس کا مطالبہ نامنظور کر دیا چنانچہ یہ کانفرنس بھی ناکام ثابت ہوئی۔

اب قائد اعظم نے مسلم لیگ کا لوہا منوانے کے لیئے مرکزی اسمبلی کے انتخابات کا مطالبہ کیا۔ وائسرائے نے یہ مطالبہ منظور کر لیا۔ اور نومبر ۱۹۴۵ء میں انتخاب ہوا لیکن اس کا نتیجہ مسلم لیگ کے حق میں کوئی خوش گوار نہ رہا۔

ان ہی دنوں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے سیاسی مسائل کو حل کرنے اور وہاں کی نمائندہ حکومت کو اختیارات سونپنے کے لیئے تین ممبروں کا ایک وفد بھیجا۔ جو لارڈ پیتھک لارنس، الفرڈ کرپس

اور الگزنڈر پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے یہاں کے تمام سیاسی حلقوں سے گفتگو کرنے کے بعد یہ تجویز پیش کی۔ کہ ہندوستان کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے میں ایک خود مختار حکومت قائم کی جائے اور یہ تمام حکومتیں مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں۔

کانگرس نے اس تجویز کو بھی ٹھکرا دیا۔

اب حالات بڑے مایوس کن موڑ پر آپہنچے تھے۔ حکومت برطانیہ ہندوستان کو جلد سے جلد آزادی دینے کے لیے بے تاب تھی۔ لیکن یہاں کے سیاسی رہنما اور جماعتیں آزادی کے حصول کی خواہش رکھنے کے باوجود آپس کی بے اتفاقی اور بے اعتمادی کے باعث اسے حاصل کرنے سے معذور تھے۔ یہ ایسی مضحکہ خیز بات تھی۔ جس نے بیرونی دنیا کی نظر میں ہندوستانی رہنماؤں کو بے وقار بنا دیا تھا۔

عارضی حکومت

۲۷ر جولائی ۱۹۴۶ء کو قائداعظم نے بمبئی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا۔ جس میں قیام پاکستان کا مطالبہ دہرایا گیا۔ اور فیصلہ کیا گیا کہ تمام خطاب یافتہ مسلم لیگی حضرات فوراً اپنے خطابات واپس کر دیں۔ اس فیصلے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور چند دنوں ہی میں سر ناظم الدین۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ۔ سر ضیاء الدین۔ سر عزیز الحق۔ سر سعد اللہ۔ خان بہادر کھوڑو، خان بہادر جلال الدین وغیرہ نے اپنے خطابات واپس کر دیئے۔

۱۲ر اگست ۱۹۴۶ء کو وائسرائے ہند نے اپنی مرکزی حکومت کی ہدایت پر آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کو بلا کر عبوری دور کے لیے عارضی حکومت بنانے کی دعوت دی۔ چنانچہ ۱۳ر اگست کو پنڈت نہرو وائسرائے سے ملے۔ اور انہوں نے مشروط طور پر مسلم لیگ کو بھی اس عارضی حکومت میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن قائداعظم نے انکار کر دیا۔

۲۰ر اگست کو وائسرائے نے اعلان کیا۔ کہ ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت قائم کر دی۔

شملہ کانفرنس

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر سنہ ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے بن کر آئے۔ اور اپنے ساتھ کچھ نئی تجاویز بھی لائے۔ جون ۴۵ء میں تمام کانگرسی رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد وائسرائے نے شملہ میں کانگرسی اور مسلم لیگی رہنماؤں کی ایک کانفرنس طلب کی۔ جس میں کانگرس کی طرف سے گاندھی جی، جواہرلال نہرو۔ باچا خان مولانا ابوالکلام آزاد، راج گوپال اچاریہ اور راجندر پرشاد نے شرکت کی۔ اور مسلم لیگ کی جانب سے قائداعظم، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر۔ حسین شہید سہروردی۔ حسین امام اور سر غلام حسین شامل ہوئے۔ ان کے علاوہ سکھوں اور اچھوتوں کے ایک ایک نمائندے کو بھی بلایا گیا۔

شملہ کانفرنس میں کانگرس اور مسلم لیگ کے سمجھوتے کی آخری کوشش کی گئی اور کوئی صورت بن نہ پڑی۔ تو وائسرائے نے تجویز پیش کی۔ کہ مرکز میں ایک نمائندہ حکومت بنائی جائے۔ جس میں پانچ ہندو، پانچ مسلمان، ایک سکھ، ایک پارسی اور ایک اچھوت نمائندہ شامل ہوں گے۔

قائداعظم نے یہ تجویز منظور کرتے ہوئے کہا کہ یہ پانچ مسلمان نمائندے مسلم لیگی ہوں۔

کانگرس نے مطالبہ کیا۔ کہ پانچ مسلمان نمائندوں میں سے چار مسلم لیگی اور ایک کانگرسی مسلمان ہو قائداعظم اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔ اور کانگرس کا مطالبہ نامنظور کر دیا چنانچہ یہ کانفرنس بھی ناکام ثابت ہوئی۔

اب قائداعظم نے مسلم لیگ کا لوہا منوانے کے لیئے مرکزی اسمبلی کے انتخابات کا مطالبہ کیا۔ وائسرائے نے یہ مطالبہ منظور کر لیا۔ اور نومبر ۴۵ء میں انتخاب ہوا لیکن اس کا نتیجہ مسلم لیگ کے حق میں کوئی خوش گوار نہ رہا۔

ان ہی دنوں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے سیاسی مسائل کو حل کرنے اور وہاں کی نمائندہ حکومت کو اختیارات سونپنے کے لیئے تین ممبروں کا ایک وفد بھیجا۔ جو لارڈ پیتھک لارنس، الفرڈ کرپس

اور الگزنڈر پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے یہاں کے تمام سیاسی حلقوں سے گفتگو کرنے کے بعد یہ تجویز پیش کی۔ کہ ہندوستان کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے میں ایک خود مختار حکومت قائم کی جائے اور یہ تمام حکومتیں مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں۔

کانگرس نے اس تجویز کو بھی ٹھکرا دیا۔

اب حالات بڑے مایوس کن موڑ پر آ پہنچے تھے۔ حکومت برطانیہ ہندوستان کو جلد سے جلد آزادی دینے کے لیئے بے تاب تھی۔ لیکن یہاں کے سیاسی رہنما اور جماعتیں آزادی کے حصول کی خواہش رکھنے کے باوجود آپس کی بے اتفاقی اور بے اعتمادی کے باعث اسے حاصل کرنے سے معذور تھے۔ یہ ایسی مضحکہ خیز بات تھی۔ جس نے بیرونی دُنیا کی نظر میں ہندوستانی رہنماؤں کو بے وقار بنا دیا تھا۔

عارضی حکومت

۲۷ر جولائی ۱۹۴۶ء کو قائداعظم نے بمبئی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا۔ جس میں قیام پاکستان کا مطالبہ دہرایا گیا۔ اور فیصلہ کیا گیا کہ تمام خطاب یافتہ مسلم لیگی حضرات فوراً اپنے خطابات واپس کر دیں۔ اس فیصلے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور چند دنوں ہی میں سر ناظم الدین۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ۔ سر ضیاء الدین۔ سر عزیز الحق۔ سر سعد اللہ۔ خان بہادر کھوڑو، خان بہادر جلال الدین وغیرہ نے اپنے خطابات واپس کر دیئے۔

۱۲ر اگست ۱۹۴۶ء کو وائسرائے ہند نے اپنی مرکزی حکومت کی ہدایت پر آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کو بلا کر عبوری دور کے لیئے عارضی حکومت بنانے کی دعوت دی۔ چنانچہ ۱۳ر اگست کو پنڈت نہرو وائسرائے سے ملے۔ اور انہوں نے مشروط طور پر مسلم لیگ کو بھی اس عارضی حکومت میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن قائداعظم نے انکار کر دیا۔

۲۰ر اگست کو وائسرائے نے اعلان کیا۔ کہ ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت قائم کر دی۔

جائے گی۔ جس میں پنڈت نہرو، پٹیل۔ راجندر پرشاد۔ راج گوپال اچاریہ۔ سرت چندر بوس آصف علی۔ شفاعت علی خان، سر بلدیو سنگھ، علی ظہیر اور جگ جیون حلف وفاداری اٹھائیں گے

اس پر مسلم لیگ کے رہنما نہایت برہم ہوئے۔ اور انہوں نے وائسرائے کے اس فیصلے کے خلاف سیاہ جھنڈیوں کے مظاہرے کیے۔ اور جلسے جلوسوں کے ذریعے پُر زور احتجاج کیا۔

یہ حالت دیکھ کر وائسرائے نے پھر قائد اعظم کو بلا کر عارضی حکومت میں مسلم لیگی نمائندے شامل کرنے کی دعوت دی۔ جو قائد اعظم نے قبول کر لی۔ اور لیاقت علی خان۔ سردار عبدالرب نشتر آئی۔ آئی چندریگر۔ غضنفر علی خان اور منڈل کے نام وزراء کے لیے پیش کیے۔

عارضی حکومت بننے کو تو بن گئی۔ لیکن کوئی مستقل سمجھوتے کی صورت ابھی تک پیدا نہ ہو سکی۔ جنگ جیتنے کے باوجود اس کے شدید ردِ عمل نے برطانیہ کا دیوالیہ نکال دیا تھا۔ وہ انگریز جو کسی قیمت پر بھی ہندوستان کو آزادی دینے کو تیار نہیں تھا۔ آج اپنی فلاح اسی میں پاتا تھا۔ کہ جتنا جلدی ہو سکے۔ یہ جُوا اپنے گلے سے اُتار پھینکے۔ جب معاملہ نے طُول کھینچا۔ تو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے ہندوستان کے تمام سیاسی رہنماؤں کو لندن بلایا۔ وہاں بھی ہفتہ بھر مذاکرات ہوتے رہے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اور انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ آخر حکومت برطانیہ نے لارڈ ویول کو واپس بلا لیا۔ اور اُس کی جگہ لارڈ مونٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجا۔ جس نے آتے ہی کانگرس اور مسلم لیگی لیڈروں سے دوبارہ گفت و شنید شروع کر دی لیکن دونوں پارٹیوں میں سے کوئی ایک بھی اپنے موقف سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیے سمجھوتے کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔

سرحد میں کانگرس وزارت سے مسلم لیگ کی ٹکر

ان دنوں سرحد میں کانگرس وزارت برسرِ اقتدار تھی۔ اور مرکز میں کانگرس اور مسلم لیگ کی

مخلوط وزارت کام کر رہی تھی۔ جس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ سرحد کانگرس کمیٹی نے اس موقع پر پنڈت نہرو کو سرحد آنے کی دعوت دی۔ مسلم لیگ نے یہاں لوگوں کو کانگرس کے خلاف کافی مشتعل کر رکھا تھا۔ چنانچہ پنڈت نہرو یہاں آئے تو ان کے خلاف مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مظاہرہ کیا گیا۔ اس کے بعد پنڈت نہرو پشاور کے راستے خیبر جانے لگے تو اسلامیہ کالج کے قریب سیاہ جھنڈیوں سے ایک اور مظاہرہ ہوا۔ جمرود پہنچے۔ تو قبائیوں نے مظاہرہ کیا۔ اور لنڈی کوتل میں تو اتنا زبردست مظاہرہ ہوا۔ کہ ان کے موٹر بھی ٹوٹ گئے۔ اور پنڈت نہرو اور بعض دوسرے رضاکاروں کو خراشیں بھی آئیں۔ دوسرے دن پنڈت جی مالاکنڈ گئے۔ جہاں مسلم لیگیوں نے نہ صرف مظاہرہ کیا۔ بلکہ ان کے موٹروں پر شدید سنگ باری کی جس سے پنڈت جی اور باچا خان کو کافی زخم آئے اسی طرح وزیرستان اور ٹانک میں بھی مظاہرے ہوئے۔ اور پنڈت جی کا یہ دورہ خاطر خواہ طور پر کامیاب نہ رہا —— ان مظاہروں کی قیادت اور انتظامات پیر صاحب مانکی شریف اور ارباب عبدالغفور نے کی۔ جو ان دنوں مسلم لیگ کے نہایت سرگرم اور مقبول رہنما تھے۔ خصوصاً پیر صاحب مانکی شریف کے متعلق تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا۔ کہ محض ان ہی کی کوششوں، اثر و نفوذ اور رات دن کی تگ و دو سے اس صوبے میں مسلم لیگ متعارف ہوئی۔ اور اسے چولنے پھلنے کا موقع ملا۔

اسی دوران میں ایک واقعہ یہ پیش آیا۔ کہ ضلع ہزارہ کی ایک ہندو لڑکی نے اسلام قبول کر کے ایک مسلمان نوجوان سے شادی کر لی۔ لڑکی کے والدین نے ڈاکٹر خان صاحب سے شکایت کی۔ جنہوں نے دونوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ہندوؤں کی کوشش تھی۔ کہ لڑکی اپنے وارثوں کو واپس مل جائے۔ اور ڈاکٹر خان صاحب بھی کچھ کرنے پر آمادہ تھے۔ اس واقعہ کو مسلم لیگ نے خوب ہوا دی۔ اور کانگرس وزارت کے خلاف زہر پھیلا کر عوامی جذبات سے پورا

پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اس کے خلاف باقاعدہ تحریک شروع کر دی۔

ارباب عبدالغفور خان آرگنائزنگ کمیٹی کے پہلے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے پہلا جلسہ چوک یادگار پر کیا۔ جس میں تمام واقعات بیان کیے۔ اور ایک بھاری جلوس بنا کر مظاہرے کے لیے ڈاکٹر خان صاحب کے بنگلے کی طرف روانہ ہوئے۔ ریلوے پل کے پاس ڈپٹی کمشنر ایس۔ بی شاہ اور سردار عبدالرشید خان ایس۔ ایس۔ پی کی زیر کمان مسلح پولیس کی بھاری تعداد موجود تھی۔ جس نے جلوس کو اشک آور گیس اور لاٹھی چارج کے ذریعے منتشر کرنا چاہا۔ لیکن جلوس پھاٹک توڑ کر بڑھ گیا۔ گورنر کے بنگلے کے پاس پھر پولیس نے مزاحمت کی۔ لیکن جلوس ڈاکٹر خان صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ اس وقت ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ۔ میاں جعفر شاہ پارلیمنٹری سیکرٹری اور یحییٰ جان وزیر تعلیم کے ہمراہ اپنے بنگلے پر موجود تھے۔ جلوس کے پہنچتے ہی انہوں نے بنگلے کے دروازے بند کر دیئے۔ اور اوپر کے حصہ میں چلے گئے۔ اس وقت ہجوم کے سامنے ارباب عبدالغفور خان نے تقریر کرتے ہوئے ہندو لڑکی مسلمانوں کے حوالے کرنے اور وزارت سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔

اس کے بعد ڈپٹی کمشنر نے چالیس پچاس چوٹی کے مسلم لیگی کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ اور باقی ہجوم کو منتشر کر دیا۔ گرفتار ہونے والوں کے نام یہ ہیں۔

ارباب عبدالغفور خان۔ رحیم بخش غزنوی۔ فدا محمد خان وکیل۔ آغا بابا وکیل۔ الٰہی بخش یوسفی محمد اشرف خان۔ خان میر ہلالی۔ عبدالرؤف بیتاب۔ اختر سرحدی۔ ارباب سکندر خان۔ عیسیٰ خان غزنوی۔ غلام غوث صحرائی۔ حاجی کرم الٰہی۔ فضل محمود۔ پہلوان طلار محمد۔ دوست محمد خان کامل۔ غلام محمد خان لوند خوڑ۔ سید ایوب شاہ وغیرہ۔

اس کے بعد سارے صوبے میں عام ایجی ٹیشن شروع ہو گئی۔ اگلے روز مردان میں جلسہ عام

کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور بے شمار تعداد لوگ جیلوں میں چلے گئے۔ ——— اس تحریک میں مردوں کے علاوہ عورتوں نے بھی نہایت بے جگری سے حصہ لیا۔ روزانہ پشاور شہر میں ہزاروں عورتوں کے جلوس نکلتے۔ جن کا ایک ہی نعرہ ہوتا۔

لے کے رہیں گے پاکستان

بٹ کے رہے گا ہندوستان

وہ روزانہ جلوس کی صورت میں ڈاکٹر خان صاحب کے بنگلے پر جا کر مظاہرہ کرتیں۔ بازاروں میں تقریریں کرتیں۔ اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرتیں۔ لیکن حکومت انہیں گرفتار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ صرف انہیں اشک آور گیس سے منتشر کرنے کی کوشش کی جاتی۔

اسی دوران میں سرحد اسمبلی کا سیشن شروع ہوا۔ مسلم لیگی کارکنوں نے اسمبلی ہال کے سامنے مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ صبح صبح ایک عظیم الشان جلوس اسمبلی ہال کی طرف روانہ ہوا۔ ریڈیو اسٹیشن کے قریب پھاٹک کے پاس جلوس پہنچا۔ تو سامنے سے پولیس کے ایک دستے نے اچانک فائرنگ شروع کر دی۔ جس میں دس پندرہ آدمی مارے گئے۔ اور بے شمار زخمی ہوئے۔

پھر ایک دن خبر آئی۔ کہ جیل میں سیاسی قیدیوں کو ایک احاطے میں بند کر کے ان پر اشک آور گیس چھوڑی گئی۔ اور ہینڈ گرانیڈ بم پھینکے گئے۔ جس سے پشاور شہر کے دو نوجوان شہید ہوئے۔

جب اس ایجی ٹیشن نے طول کھینچا۔ اور مرکز میں خبریں پہنچیں تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن خود حالات کا جائزہ لینے کے لیے پشاور آیا۔ اس موقع پر جا بجا صوبہ سرحد کے طول و عرض سے لاکھوں انسان ماؤنٹ بیٹن کے سامنے مظاہرہ کرنے کے لیے کنگھم پارک کے قریب جمع ہو گئے۔ جن میں بے شمار عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس وقت مسلم لیگی رہنما جیلوں میں تھے۔ سردار عبدالرب نشتر جو مرکز میں کمیونی کیشن کے وزیر تھے۔ دہلی سے خاص طور پر آئے ہوئے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی

بیوی اور سر جارج کیرو گورنر سرحد کے ہمراہ کنگھم پارک پہنچے۔ لیڈی مونٹ بیٹن نے عورتوں کا اور مونٹ بیٹن نے مردوں کا مظاہرہ دیکھا۔ سردار عبدالرب نشتر اور فیروز خان نون نے لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے انہیں بتایا۔ کہ سرحد کے لوگ اس خطے کو پاکستان میں شامل دیکھنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ وائسرائے نے دہلی جا کر صوبائی کانگرس گورنمنٹ اور مسلم لیگی رہنماؤں کے وفد سرحد سے منگوائے۔ سنٹرل جیل پشاور میں مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ جس میں تمام جیلوں سے اراکین منگوائے گئے۔ صدارت سمین جان خان مرحوم نے کی۔ اس جلسے میں ایک وفد دہلی بھیجنے کے لیئے چنا گیا۔ جس کی قیادت پیر صاحب مانکی شریف کو سونپی گئی۔

یہ وفد دہلی پہنچا۔ تو قائداعظم کے مشورہ سے انہوں نے لارڈ مونٹ بیٹن سے بات چیت کی۔ اور آخر فیصلہ ہوا۔ کہ سرحد میں پاکستان اور ہندوستان کے مسئلہ پر ریفرنڈم کرایا جائے چنانچہ لارڈ مونٹ بیٹن۔ قائداعظم اور پنڈت نہرو نے ایک ہی رات دہلی ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے تقسیم ملک کے متعلق سلہٹ اور سرحد میں ریفرنڈم کرنے کا اعلان کیا۔

اس کے بعد تمام مسلم لیگی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ اور صوبہ میں ریفرنڈم کی تیاریاں پورے زور شور سے ہونے لگیں۔ سرحد کانگرس نے ریفرنڈم میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ سرحد میں کانگرس کا اثر کافی تھا۔ لیکن ریفرنڈم کا فیصلہ مسلم لیگ کے حق میں ہوا۔ اور اس طرح اسے پاکستان کا حصہ تسلیم کر لیا گیا۔

آخر ۳؍جون ۱۹۴۷ء کو اس برصغیر کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ اور ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو اسے دو حصوں پاکستان اور بھارت میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور اس طرح پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اور ملک کے دونوں حصوں میں کانگرس اور مسلم لیگ نے حکومتیں سنبھال لیں۔

مُسلم لیگیوں کی خود غرضی

قیام پاکستان کے بعد کانگرس اور مُسلم لیگ کی اصولی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ تمام نیشنلسٹ اور نیشنل خیال کے لوگوں نے بغیر مشروط طور پر پاکستان کو تسلیم کر لیا۔ اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ پاکستان کے عملی طور پر سامنے آنے کے بعد یوں بھی اب اسے ماننے سے انکار کرنا حماقت کے مترادف تھا۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ کچھ ایسے ہٹ دھرم بھی تھے۔ جو اپنی ضد پر اڑے رہے۔ تقسیم ملک کا فیصلہ ان کی توقعات کے خلاف تھا۔ انہیں حقیقتاً اس چیز سے دلی شاق ہُوا۔ اور وہ پاکستان کو چھوڑ کر ہندوستان میں جا بسے۔

لیکن جو سوجھ بُوجھ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ اور اپنے وطن کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ سچ پوچھئے تو ان کا پاکستان میں رہ جانا ہی اس امر کی دلیل تھا۔ کہ وہ اسے برضا و رغبت تسلیم کر چکے ہیں۔ لیکن جب مخالفین کی نیت میں فتور دیکھا۔ تو انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ پاکستان ہمارا وطن ہے۔ اور ہم اس کے وفادار شہری ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ وہ ہماری اصُولی جنگ تھی۔ اور اب کسی اختلاف کی گنجائش نہیں رہی۔

اب چاہیئے تو یہ تھا کہ مُسلم لیگی حضرات سپورٹس مین سپرٹ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے نیشنلسٹ بھائیوں کے دوستی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ سابقہ تمام اختلافات بھُول کر انہیں گلے لگا لیتے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بعض معاملہ فہم اور نیک نیت مُسلم لیگی جن میں قائداعظم مرحوم کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس کے لیئے تیار بھی تھے۔ لیکن جب خود غرض اور اقتدار پرست لیگیوں کے کانوں میں یہ بھنک پڑی۔ تو وہ تلملا اُٹھے۔ انہیں اس اتحاد کے پردے میں اپنی موت نظر آنے لگی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ان عوامی لوگوں کو سامنے آنے کا موقع ملا۔ تو ان کے تمام سنہرے رو پہلے خواب تشنۂ تعبیر ہو کر رہ جائیں گے۔ انہیں کوئی کوڑیوں کے مول بھی

نہیں پوچھے گا۔ ملک کی لیڈر شپ ان کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ کیونکہ درحقیقت وہی عوام کے پیچھے لیڈر ہیں۔ اس لیئے انہوں نے طرح طرح کی سکیمیں بنائیں۔ ان پر غیر وفادار ہونے کا الزام لگایا۔ ہندوستان سے ان کے رابطے کے افسانے گھڑے۔ اور ملک کی ہائی کمانڈ کے دل میں گوناگوں غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں معتوب و مقہور بنایا۔ کشمیر کے پیچھے عوامی رہنما شیخ عبداللہ اور قائد اعظم کے درمیان سمجھوتے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ اور باچا خان اور قائد اعظم کو ایک دوسرے سے دور کرنے کے لیئے نہایت اہم پارٹ ادا کیا گیا۔ اس لیئے کہ اس مصالحت کی زد براہ راست بعض برسراقتدار لوگوں پر پڑتی تھی۔ ان دنوں ملک کی لیڈر شپ ان کے ہاتھ میں تھی۔ وزارتوں کے منصب انہیں حاصل تھے۔ اور باچا خان اور اس کی پارٹی کے میدان میں آنے سے ان کی بساط اقتدار کا الٹ جانا بالکل یقینی تھا۔

مسلم لیگ ہائی کمانڈ نے شیخ عبداللہ اور باچا خان کی دوستی کھو کر ایسی شدید غلطی کی جس پر اسے خود بھی بعد میں سخت پشیمان ہونا پڑا۔ لیکن اس وقت موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اور یہ پشیمانی لاحاصل تھی۔ اگر اس معاملے کو خوش اسلوبی سے نبھایا جاتا۔ اور بروقت ان دونوں رہنماؤں کا تعاون حاصل کر لیا جاتا۔ تو یقیناً آج ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ نہ کشمیر بھارت کے تصرف میں جاتا نہ صوبہ سرحد میں حکومت کو اس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ نہ ملک میں غلط لیڈر شپ کو من مانی کرنے کا موقع ملتا۔ نہ سیاسی حلقوں میں اس قدر انتشار نظر آتا۔ نہ ملک میں غیر جمہوری روایات پروان چڑھتیں۔ اور نہ ہی ملک کے عوام کو اس قدر ابتر حالت کا سامنا کرنا پڑتا۔

ان خود غرض لوگوں کو مستقبل کا مورخ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ جنہوں نے محض اپنی ہوس اقتدار مٹانے کے لیئے ملک کو نہ صرف ان مخلص لیڈروں کی رہنمائی سے محروم کیا۔ بلکہ اسے

ایسی الجھنوں میں گرفتار کرایا۔ جن سے شاید ہماری آئندہ نسلیں بھی عہدہ برآنہ ہو سکیں گی۔

انہوں نے قائداعظم کو دھوکا دیا۔ قوم کو دھوکا دیا۔ ملک کو دھوکا دیا۔ بلاشبہ اس حادثے کی ذمہ داری ان لالچی، خوشامدی اور حریص لوگوں کے سر ہے۔ اور اس سنگین الزام کے لیے ثبوت موجود ہیں۔ جن سے وہ انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

تقسیم ملک اور فرقہ وارانہ فسادات

تقسیم ملک کے وقت جو حادثے گذرے، پڑھے لکھے لوگ اس سے بے خبر نہیں۔ قائداعظم مرحوم بڑے زیرک اور معاملہ فہم انسان تھے۔ لیکن انگریزوں کی دیانت داری کے متعلق انہیں حد سے زیادہ حسن ظن تھا۔ انہوں نے حد بندی کمیشن کے انگریز ممبروں پر کلی اعتماد کیا۔ اور وہ کچھ ایسی غیر منصفانہ حد بندی کر گئے۔ جس میں پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اور بعض مسلم اکثریت والے صوبے بھارت کے حصے میں چلے گئے۔ دوسری فرو گذاشت قائداعظم سے یہ ہوئی۔ کہ انہوں نے ریاستوں کو اختیار دے دیا۔ کہ وہ ملک کے دونوں حصوں میں سے جس طرف چاہیں اپنی خوشی سے شامل ہوں۔ حکومت پاکستان ان پر کوئی محاسبہ نہیں کرے گی۔ یہ اسی فیصلے کا نتیجہ ہے۔ کہ آج کشمیر کی کٹھ پتلی حکومت نے ہندوستان سے الحاق کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔

تقسیم کے بعد دونوں طرف سے آبادی کا تبادلہ شروع ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک کے دونوں حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا لاوا پھوٹ پڑا۔ ان فسادات میں مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے لوگوں پر جو قیامتیں ٹوٹیں وہ کچھ انہی کا دل جانتا ہے۔

انسانی تاریخ ظلم و ستم کے واقعات سے بھری ہے۔ لیکن جو مظالم ان فسادات میں مظلوم و بے بس اور بے گناہ انسانوں پر توڑے گئے۔ شاید ہی کہیں ان کی مثال مل سکے۔ اس مرگ انبوہ

میں کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ سالہا سال کی مذہبی قدروں کا جنازہ نکل گیا۔ اور انسان تمام انسانی خصائص کو جھٹک کر ننگا ہو گیا۔ بالکل حیوان بن گیا۔ اور درندوں کی طرح اپنے بھائی بندوں کو پھاڑنے اور چبانے لگا۔

لوگوں کے جان و مال کے علاوہ ان کا شرم و حیا اور عزت و عفت تک محفوظ نہ رہی۔ لوٹ کا بازار گرم تھا۔ جس میں ہر چیز لٹ رہی تھی۔ والدین کے سامنے ان کی بچیوں کی عصمتیں لٹ رہی تھیں۔ اور وہ بے بس تھے۔ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بڑے بڑے جغادری مذہبی انسان اور اخلاق و شرافت کے ٹھیکیدار بھی اس جذباتی طوفان سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔

ملک میں وسیع طور پر خون کی ہولی کھیلی گئی۔ بڑے بڑے معقول انسان غنڈے بن کر میدان میں کود پڑے۔ ہندوؤں مسلمانوں کی بھری ہوئی ٹرینیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دی گئیں۔

یہ ہنگامہ سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ صوبہ سرحد اس سے بالکل متاثر نہ ہوا۔ آخر وقت تک نہ یہاں سے غیر مسلم جانے کو تیار تھے۔ اور نہ مسلمان انہیں نکالنے پر مصر تھے۔

مسلم لیگیوں نے پہلے تو لوٹ کا سلسلہ شروع کیا۔ اور چند ایک باضمیر لوگوں کے سوا باقی سب نے خوب جی بھر کر غیر مسلموں کی دوکانوں اور مکانوں کو لوٹا۔ اس وقت مسلم لیگی وزارت بن چکی تھی۔ مسلم لیگی غنڈوں کو حکومت کی شہ حاصل تھی۔ اس لیئے پولیس سے مل کر انہوں نے مہینوں لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔

ادھر بھارت سے مسلم مہاجرین کا بے پناہ سیلاب امڈ پڑا۔ لٹے پٹے تباہ حال، حیران و پریشان ہزاروں، لاکھوں انسان جن پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ جو اپنے وطن، گھر بار، مال، املاک کو چھوڑ کر مہاجر بن گئے تھے۔ جو اپنے خاندان پاکستان آنے کی لگن پر بھینٹ

بڑھا آئے تھے۔ جو پشتوں کے رشتے توڑ کر، صدیوں کے بندھن کاٹ کر اسلامی سلطنت میں پناہ لینے کی دھن میں مرمٹ کر یہاں تک آ پہنچے تھے۔ اب انہیں یہاں سر چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ غیر مسلموں کے ترکے پر مسلم لیگیوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ اور یہ بے چارے اپنی جوان لڑکیوں، بیویوں اور ماؤں بہنوں کے ساتھ کھلے کیمپوں کی نمائش گاہ میں بے درد اور سنگ دل لوگوں کے لیئے تماشا بنے ہوئے تھے۔

عبدالقیوم خان اور مسلم لیگ

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ملک کا اعلان کر دیا گیا۔ اور ملک کے دونوں حصوں میں کانگرس اور مسلم لیگ نے حکومتیں سنبھال لیں۔ لیکن اس وقت تک سرحد میں بدستور کانگرس وزارت قائم تھی۔ مسلم لیگیوں کو یہ بات بہت ناگوار گذر رہی تھی۔ انہوں نے قائد اعظم سے جا کر کہا کہ باچا خان اور اُن کے ساتھی پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور انہوں نے جشن پاکستان کی تقریب میں جھنڈا لہرانے کی رسم میں حصّہ نہیں لیا۔ اور جب بھی انہیں موقع ملے وہ پاکستان کو نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ چنانچہ قائد اعظم نے بحیثیت گورنر جنرل کے سرحد کی کانگرس وزارت کو توڑ دیا۔ اور صوبے میں مسلم لیگی وزارت بنانے کے لیئے گفت و شنید ہونے لگی۔

اس وقت صوبائی مسلم لیگ میں بڑا اختلاف پیدا ہو گیا۔ پیر صاحب مانکی شریف اور ارباب عبدالغفور خان وغیرہ کی یہ رائے تھی۔ کہ سرحد لیگ یا سرحد لیگ اسمبلی پارٹی کو اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی مرضی سے وزیر اعلیٰ کا انتخاب کرے۔ اور انہوں نے عبدالقیوم خان کی غیر جمہوری لیڈر شپ کی سخت مخالفت کی۔ لیکن عبدالقیوم خان نے قائد اعظم اور لیاقت علی خان مرحوم پر کچھ ایسا جادو پھونک رکھا تھا۔ کہ انہوں نے عبدالقیوم خان کو مسلم لیگ پارٹی کا لیڈر مقرر کر دیا اور اس کے ساتھ عباس خان اور میاں جعفر شاہ وزراء لیئے گئے۔

اس کے بعد اختلافات کی خلیج بڑھ گئی۔ پیر صاحب مانکی شریف اور ان کی پارٹی کو عبدالقیوم خان کی بعض حرکتیں بہت ناگوار گزریں۔ چنانچہ انہوں نے بہت سے وفد، خطوط اور شکایات مرکز کو بھیجیں۔ لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔

اسی دوران میں کل پاکستان مسلم لیگ کا ایک اجلاس کراچی میں طلب کیا گیا۔ تاکہ پاکستان لیگ کونسل کا انتخاب کیا جائے اس اجلاس میں صوبہ سرحد کے تمام مسلم لیگیوں نے شرکت کی۔ وہاں لیاقت علی خان نے آل پاکستان مسلم لیگ کونسل کے لیئے مجوزہ قواعد بنا کر منظوری کے لیئے پیش کیئے۔ اس موقع پر وہاں پیر صاحب مانکی شریف نے ایک ترمیم پیش کی۔ کہ جو مسلم لیگی حضرات سرکاری عہدوں پر متمکن ہیں۔ انہیں مسلم لیگ میں جماعتی طور کوئی حصّہ نہ لینا چاہیئے اس ترمیم کا اثر قائداعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان پر بھی پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں ایک طرف مسلم لیگ جماعت کے صدر اور جنرل سیکرٹری تھے۔ اور دوسری طرف مسلم لیگی حکومت کے گورنر جنرل اور وزیراعظم بھی تھے۔ ارباب عبدالغفور خان نے پیر صاحب کی اس ترمیم کی تائید کی اور دوسرے لوگوں کے علاوہ مولانا شبیر حسن عثمانی مرحوم نے بھی اس کے حق میں رائے دی ——
ادھر قائداعظم، لیاقت علی خان اور تمام حکومتی پارٹی اس کے سخت خلاف تھی۔ چنانچہ اس ترمیم پر پورے تین دن تک بحث ہوتی رہی۔ اور روزانہ قائداعظم خود اس موضوع پر تقریریں کرتے رہے۔ اس کے باوجود تیسرے دن رائے شماری میں دس ووٹوں کی اکثریت سے یہ ترمیم پاس ہو گئی۔

اس کے بعد چودھری خلیق الزمان کو پاکستان مسلم لیگ کا آرگنائزر مقرر کیا گیا۔ جو اس کام کے لیئے بڑا نااہل ثابت ہوا۔ اس نے تنظیم کا کام تمام صوبائی حکومتوں کو سونپ دیا۔ سرحد میں عبدالقیوم خان کو بحیثیت وزیراعلیٰ یہ کام سپرد کیا گیا۔ جس نے مسلم لیگ کو ایک خانہ ساز ادارہ بنا ڈالا اور

پیر صاحب مانکی شریف اور اُن کی پارٹی کو ابتدائی رکنیت کے فارم تک نہ دیئے۔ اس کے خلاف بہت شور و غوغا ہوا۔ مرکز کو وفد بھیجے گئے۔ لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

عبدالقیوم خان مسلم لیگ کو اپنی لونڈی بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ تمام مخلص، دیانت دار اور جمہوریت پسند لوگوں کو اس نے مسلم لیگ سے نکال باہر کیا۔ جن میں فدا محمد خان، الٰہ بخش یوسفی۔ رحیم بخش غزنوی۔ اقبال شاہ۔ سلطان محمد خان، آغا بابا خان۔ ارباب سکندر خان، ڈاکٹر عبدالرحیم ارباب محمد آصف۔ ابراہیم خان جھگڑا۔ میر آفتاب، دم ساز خان وغیرہ شامل تھے۔

رحیم بخش غزنوی پر ایک من گھڑت مقدمہ کھڑا کیا گیا۔ ان کے اخبار روزنامہ سرحد کو بند کر دیا گیا۔ اور دفتر کا تمام سامان ضبط کر لیا گیا۔ اور دوسرے مخلص مسلم لیگیوں پر جا و بے جا مظالم توڑے گئے۔ اور اپنے گرد عبدالقیوم خان نے ایسے لوگوں کو جمع کر لیا۔ جو غلط قسم کے لوگ تھے اور اس کی ہاں میں ہاں ملانا ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا۔ کہ مسلم لیگ کا وقار گر گیا۔ اور مسلم لیگی حکومت سے لوگ نفرت کرنے لگے۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں عام الیکشن میں صوبے کے تمام اضلاع میں عبدالقیوم خان نے وہ دھاندلی مچائی۔ کہ دُنیا حیران رہ گئی۔ اس نے صرف اپنے حاشیہ نشینوں کو کامیاب بنانے کے لیئے قانونی اخلاقی اور انسانی قدروں اور پابندیوں کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیا۔ اور ایسی ایسی حرکتیں کیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ ووٹروں کو ڈرانے دھمکانے کے علاوہ مخالفین کے بکس توڑ کر ووٹوں کی پرچیاں اپنے بکس میں ڈالی گئیں۔ ووٹروں کو اغوا کیا گیا۔ ان پر دباؤ ڈالا گیا۔ انہیں خریدنے کی کوشش کی گئی۔ غرض جس طرح بھی بن پڑا۔ اس نے اپنے مخالفین کو ناکام بنانے کی کوشش کی یہاں تک کہ جن لوگوں مثلاً یوسف خٹک، ابراہیم خان جھگڑا وغیرہ کو مسلم لیگ نے ٹکٹ دے دیئے تھے۔ لیکن وہ عبدالقیوم کے مخالف تھے۔ ان کے مقابلہ میں غیر مسلم لیگیوں

کو اس نے کامیاب بنایا۔

الیکشن میں کامیابی کے بعد اس نے بے دھڑک ہو کر اور زیادہ تشدد شروع کیا۔ لیکن آخر اپریل ۱۹۵۳ء میں مرکزی وزارت میں انقلاب آیا۔ اور عبدالقیوم خان کا اقتدار بھی سرحد میں ختم ہوا۔ اور اسے مرکزی حکومت میں وزیر مواصلات بنا دیا گیا۔

ادھر سرحد سے جاتے جاتے عبدالقیوم خان نے یہاں سردار عبدالرشید خان کو اپنا جانشین بنایا۔ جو اس وقت یہاں انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ یہ انتخاب جمہوری اصولوں کے سراسر خلاف تھا۔ کہ کسی سرکاری افسر کو اس کے عہدے سے مستعفی کرا کر براہ راست وزیر اعلیٰ نامزد کیا جائے۔ لیکن یہ دھاندلی مسلم لیگ کے دور میں سارے ملک میں اسی طرح چل رہی تھی۔ عبدالقیوم خان نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اپنے ایک نجی ملازم شمس الحق کو پہلے اسمبلی میں بلامقابلہ ممبر منتخب کرایا۔ اور بعد میں وزیر بنا دیا۔

عبدالقیوم خان اور عوامی لیگ

جب مسلم لیگ کے راہ راست پر آنے کا کوئی امکان نہ رہا۔ تو قطعی مایوسی کے بعد فیصلہ کیا گیا۔ کہ عوامی لیگ کے نام سے ایک مضبوط حزب مخالف بنائی جائے۔

۱۹۴۹ء میں پیر صاحب مانکی شریف اور ارباب عبدالغفور خان اور غلام محمد خان لوند خوڑ نے مل کر مولانا شبیر حسین عثمانی۔ جی ایم سید اور نواب افتخار حسین ممدوٹ سے مشورہ کیا۔ اور پھر پشاور میں سرحد کے طول و عرض سے اپنے ہم خیال لوگوں کا ایک اجلاس بلایا جس میں مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت کی۔

پیر صاحب مانکی شریف۔ پیر صاحب زکوڑی شریف۔ ارباب عبدالغفور خان۔ غلام محمد خان لوند خوڑ۔ اسد اللہ جان خان۔ تاج علی خان۔ قاضی شفیع الدین۔ محمد آصف خان۔ مولانا

شاکر اللہ، میاں محمد شاہ - ارباب عطاء اللہ خان - نثار محمد خان - محمد سرفراز خان - میاں مشرف شاہ - قاضی محمد اسلم، سید عبدالخالق میاں جی - میر عثمٰن خان، اتاج محمد خان، محمد فرید خان - حاجی فقیرا خان، محمد عباس خان - عبدالقیوم خان سواتی - فضل حق شیدا۔

اس جلسے میں صوبائی عوامی لیگ کا ڈھانچہ بنایا گیا۔

پیر صاحب مانکی شریف	صدر
قاضی محمد اسلم	جنرل سیکرٹری
فضل حق شیدا	اسسٹنٹ سیکرٹری

عوامی لیگ بن گئی تو اس کے بعد صوبے میں تنظیمی کام شروع کیا گیا اس وقت سارے پاکستان میں کوئی اپوزیشن جماعت نہیں تھی۔ اب ضلعی تنظیم کی مہم کا آغاز ہوا۔ پشاور میں ضلعی تنظیمی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ اور جب ارباب عبدالغفور خان کوہاٹ کے دورہ پر جانے لگے۔ تو انہیں درۂ کوہاٹ میں کوتل کے مقام پر معہ اپنے ساتھیوں قاضی محمد شفیع، محمد آصف خان وکیل، ہمایوں شاہ وکیل اور سالار عبدالحمید خان کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ پیر مانکی شریف، پیر زکوڑی شریف اور غلام محمد خان لوند خوڑ کو راستے ہی سے واپس کر دیا گیا اور کوہاٹ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی۔ چونکہ یہ عوامی لیگ کے سلسلہ میں پہلی گرفتاریاں تھیں۔ اس لیے حکومت کو اتنا تجربہ نہیں تھا۔ ملزمین کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ مقدمہ کی پیروی کے لیے پشاور اور کوہاٹ کے تمام وکلاء نے ڈیفنس کمیٹی بنا کر مقدمے میں حصہ لیا۔ اور گرفتار شدگان کو ضمانت پر رہا کرایا۔ کچھ دنوں بعد جنوں میں عوامی لیگ کے بہت سے کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ اور ارباب عبدالغفور خان اور ان کے ساتھیوں کو دوبارہ گرفتار کر کے دفعہ ۴۰ سرحدی کے تحت تین تین سال کی سزا دی گئی۔ پیر زکوڑی

اور عبدالحمید خان کو بھی یہی سزا دی گئی۔ اور تمام قیدیوں کو سنٹرل جیل مچھ (بلوچستان) بھیج دیا گیا۔ جہاں ان کے پہنچنے سے پہلے صوبہ سرحد کے کانگرسی رہنما باچا خان، قاضی عطاء اللہ مرحوم۔ امیر محمد خان اور عبدالولی خان موجود تھے۔

عبدالقیوم خان نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیئے میدان صاف کرنا شروع کر دیا۔ سارے صوبے میں جگہ جگہ گرفتاریاں ہونے لگیں۔ ہر جگہ دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دیا گیا۔ پیر صاحب مانکی شریف پر پابندی لگادی گئی۔ اور غلام محمد خان لوند خوڑ کو جلا وطن کر دیا گیا۔ یہ پکڑ دھکڑ ۱۹۵۴ء تک صوبہ سرحد میں جاری رہی اور حزب مخالف کو کسی قسم کا تنظیمی کام کرنے کا موقع نہ دیا گیا۔

عبدالقیوم خان اور خدائی خدمت گار

عبدالقیوم خان بہت بعد میں سیاسی میدان میں آیا۔ اور بہت جلد اگلی صفوں میں پہنچ گیا۔ غالباً ۱۹۳۶ء میں وہ پہلی دفعہ کانگرس میں شامل ہوا۔ آدمی ذہین تھا۔ اور ڈپلومیٹ بھی بہت جلد باچا خان اور ڈاکٹر خان صاحب کے منہ چڑھ گیا۔ خصوصاً ڈاکٹر خان صاحب کی سادہ لوحی سے تو اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور انہیں اپنی وفاداری کا ایسا اعتماد دلایا۔ کہ وہ اس کے گن گانے لگے۔ سردار عبدالرب نشتر جو شہری حلقے میں خان برادران کا حلقہ بگوش تھا۔ ان دنوں کانگرس سے کٹ چکا تھا۔ چنانچہ اس کی کمی عبدالقیوم خان نے آکر پوری کر دی۔ لیکن وہ عوام میں مقبول نہیں تھا۔ کیونکہ ہمیشہ قربانی دینے کے وقت وہ پیچھے ہٹ جاتا۔ اور قید و بند سے گھبراتا تھا۔ اس لیئے دو دفعہ یکے بعد دیگرے صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں عبدالرب خان نشتر اور پیر بخش خان کے مقابلے میں اسے بری طرح ہزیمت اٹھانی پڑی۔

۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر خان صاحب نے صوبہ سرحد میں پہلی کانگرس وزارت بنائی۔ تو انہیں سنٹرل اسمبلی سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس وقت عبدالقیوم خان نے ڈاکٹر خان صاحب کو رام کرنے کے لیئے نامعلوم کیا کیا جتن کیئے اور آخر ڈاکٹر صاحب کو یہاں تک آمادہ کر لیا۔ کہ انہوں نے اسے نہ صرف اس سیٹ کے لیئے بلامقابلہ منتخب کرایا۔ بلکہ کانگرس ہائی کمانڈ سے کہہ کر کانگرس پارٹی کا ڈپٹی لیڈر بھی منتخب کرا دیا۔

ان دنوں عبدالقیوم خان مسلم لیگ۔ اور پاکستان کا حامی نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے مسلم لیگ میں شمولیت سے صرف چند دن پہلے ایک انگریزی کتاب "گولڈ اینڈ گن" لکھی۔ جس میں پاکستان کے متعلق کوئی اچھی رائے کا اظہار نہیں تھا۔ اور باچا خان کی ملکی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ اور انہیں اپنے ملک کا سب سے بڑا لیڈر تسلیم کیا۔ لیکن لطف یہ ہے۔ کہ ابھی اس کتاب کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی۔ کہ وہ سودا بازی کر کے مسلم لیگ میں شریک ہو گئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب تقسیم ملک میں صرف چند ماہ باقی تھے اور قیام پاکستان کے امکانات صاف نظر آ رہے تھے۔

عبدالقیوم خان نے صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کا منصب سنبھالتے ہی سب سے پہلا وار اپنے محسنوں باچا خان۔ ڈاکٹر خان صاحب اور ان کی جماعت خدائی خدمتگار پر کیا۔ اس نے علی الاعلان ان کی مخالفت شروع کر دی۔ اور محض اپنی لیڈرشپ کے تحفظ کے لیئے باچا خان اور قائداعظم کے مابین طے شدہ مصالحت کو نہایت پراسرار سازشوں سے ناکام بنایا اور قائداعظم کو خان برادران کی پاکستان دشمنی کے من گھڑت افسانے سنا سنا کر ان سے اس حد تک بدگمان کر دیا۔ کہ قائداعظم جیسے قول کے پکے شخص باچا خان سے ملاقات کا وعدہ کر لینے کے باوجود بعد میں انہیں ملنے سے انکاری ہو گئے۔

ہم تفصیل سے بیان کر آئے ہیں۔ کہ باچا خان اور قائد اعظم کی مفاہمت میں بعض لوگوں کو اپنے اقتدار کی موت نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ وہ سرحدی عوام کے بلا شرکت غیرے مقبول اور عوامی لیڈر تھے۔ اور ان کے سامنے آنے سے کسی اور کے لیئے برسر اقتدار رہنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیئے وہ کسی قیمت پر بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ قائد اعظم کے قریب ہوں۔ اور انہیں آزادی سے کام کرنے کا موقع ملے۔ چنانچہ وہ لوگ آخر کار اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے اور اُن کی طرف سے قائد اعظم کے دل میں ایسی غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ جن کی وجہ سے باچا خان ہمیشہ کے لیئے معتوب بن گئے۔

باچا خان کے معتوب ہونے کے بعد عبدالقیوم خان بالکل مطمئن تھا۔ یہاں کوئی اس کا مدِ مقابل نہ تھا۔ کوئی اسے ٹوکنے والا نہ تھا۔ محاسبہ کرنے والا نہ تھا۔ اب وہ ایک ڈکٹیٹر کے روپ میں سامنے آیا۔ اور ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنے لگا۔ اس نے اپنا راستہ صاف کرنے کے لیئے دُوسری جماعتیں تو ایک رہیں خود اپنی جماعت مسلم لیگ کے جمہوریت پسند اور نیک نیت رہنماؤں کا بھی پوری طرح صفایا کر ڈالا۔ عوامی لیگ کو ختم کرنے کی ٹھانی۔ اور خدائی خدمت گاروں کو تو اس بُری طرح کچلنے کی کوشش کی کہ تشدد اور استبداد کا کوئی حربہ ایسا نہیں تھا۔ جو ان کے خلاف استعمال نہ کیا گیا ہو۔

اس نے سب سے پہلے ۱۹۴۸ء میں موضع چارسدہ میں بابڑہ کے مقام پر خدائی خدمت گاروں کے ایک پُر امن جلوس پر اس بے دردی سے فائرنگ کرائی کہ لوگوں کو عہد انگریزی کے مظالم بھی بھول گئے۔ اس وحشیانہ فائرنگ میں سینکڑوں لوگ شہید اور زخمی ہوئے۔ جن میں سے بیشتر لاشوں کو نہایت پُر اسرار طریقے سے ٹھکانے لگایا گیا۔ زخمیوں کو سرکاری ہسپتال میں داخل کرنے کی اجازت نہ دی اور انہیں طبی امداد سے محروم رکھا گیا۔

اس سے پہلے باچا خان کو ۱۵ر جون ۱۹۴۸ء کو گرفتار کر کے تین سال کی سزا دی گئی۔ اور اس کے اختتام پر بنگال ریگولیشن کے تحت انہیں تین سال کے لیے مزید قید و بند کی صعوبت جھیلنا پڑیں۔ اور وہ ۱۹۵۴ء میں رہا ہوئے۔ اسی طرح ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کو ایبٹ آباد میں چھ برس تک نظر بند رکھا گیا۔ اور باچا خان کے بیٹے ولی خان اور ان کے دوسرے تمام ساتھیوں کو بھی ایک طویل عرصہ کے لیے جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ جن میں ولی خان۔ امیر محمد خان۔ حسین بخش کوثر۔ عبدالصمد اچکزئی۔ ماسٹر عبدالکریم وغیرہ شامل تھے

ان رہنماؤں کو جیل بھیجنے کے بعد خدائی خدمت گار تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اور بابڑہ میں وحشیانہ فائرنگ کی گئی۔ اور تحریک کے باقی ماندہ کارکنوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور رضاکاروں پر ایسے ایسے شرمناک مظالم توڑے جانے لگے۔ جن کی مثال برطانوی دورِ حکومت میں بھی نہیں ملتی۔

رضاکاروں کو ننگا کر کے ان کے جلوس نکالے گئے۔ ان کے مال و املاک ضبط کیے گئے۔ خانہ تلاشیاں، عورتوں کی بے عزتی۔ بر سرِ عام پٹائی اور اس قسم کے سینکڑوں دوسرے واقعات نے لوگوں میں دہشت پیدا کر دی۔ اور ہر طرف ایک عام مایوسی اور بددلی چھا گئی

بابڑہ فائرنگ کے فوراً بعد چوک یادگار پشاور میں عبدالقیوم خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا، "کہ بہ گشتنی روزِ اول" کے اصولوں پر اس نے بابڑہ میں خدائی خدمت گاروں کو وہ سبق دیا ہے۔ کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ یہ انگریزوں کی حکومت نہیں۔ یہ مسلم لیگی حکومت ہے۔ اور اس کا نام عبدالقیوم ہے۔ خدائی خدمت گار ملک کے غدار ہیں۔ اور وہ یہاں سے ان کا نام و نشان مٹا دے گا۔

کشمیر کا قضیہ

تقسیم ملک کے بعد قائد اعظم نے ریاستوں کے متعلق اعلان کر دیا۔ کہ وہ اپنی مرضی سے ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کر سکتی ہیں۔ بھارت کی تمام ریاستوں میں حیدر آباد دکن اور کشمیر کی ایک جداگانہ حیثیت تھی۔ حیدر آباد دکن بھارت کی ریاستوں میں پہلی ریاست تھی جس کا والی مسلمان تھا۔ اور اکثریت آبادی ہندوؤں کی تھی۔ اور ہندو صوبوں میں گھری ہوئی تھی۔ دوسری ریاست کشمیر تھی۔ جو بڑی بھی تھی۔ اور محل وقوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اور پاکستان کا ہر اعتبار سے ایک لازمی حصہ تھی لیکن اس کا حاکم ڈوگرہ ہندو اور آبادی مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل تھی۔ کشمیر کی ریاست پنجاب اور سرحد کی مسلم آبادی میں گھری ہوئی تھی۔ لیکن تقسیم کے موقع پر انگریزوں نے گہری چال چلی اور مسلمانوں کی اکثریت کے ایک صوبے گورداسپور کو بھارت کے حوالے کر دیا۔ جس سے کشمیر کی ایک شاہراہ بھارت کے قبضے میں چلی گئی۔

تقسیم کے ہنگام پاکستان کے ساتھ کشمیر نے ایک معاہدہ کیا۔ کہ وہ آخری فیصلے تک اپنی سابقہ حالت برقرار رکھے گا۔ اور بھارت کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں رکھے گا۔ لیکن اس معاہدے کے بعد جلد ہی ثابت ہو گیا۔ کہ کشمیر کا ڈوگرہ مہاراجہ بھارت سے ساز باز کر رہا ہے چنانچہ اس سازش کو ناکام بنانے کے لیئے کشمیر پر صوبہ سرحد کے قبائلی پٹھانوں نے حملہ کر دیا کشمیر میں قبائلی بڑی بے جگری سے لڑے۔ اور قریب تھا۔ کہ وہ کشمیر پر قبضہ کر لیتے۔ لیکن بعض خود غرض لوگوں کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں اور غیر دانشمندانہ دخل اندازی نے اس مہم کو ناکام بنا دیا انہیں مجبوراً پسپا ہونا پڑا۔ اور ایسے حالات پیدا ہو گئے۔ جن کی وجہ سے کشمیر کا معاملہ آج تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔

عبدالقیوم خان کی آمریت

عبدالقیوم خان نے اقتدار سنبھالتے ہی بے اعتدالیاں شروع کر دیں۔ اور حزب مخالف کے لیئے سازشوں کے جال بچھا دیئے۔ اس نے مسلم لیگ کو جماعتی طور پر ختم کرنا چاہا۔ خدائی خدمت گار جماعت کے تمام رہناؤں کو جیلوں میں ڈال کر اس جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ خاکسار، مجلس احرار، اور دوسری تمام جماعتوں پر جلسے جلوس کی پابندیاں عائد کر دیں۔ عوامی لیگ کے رہناؤں کو گرفتار کر کے اسے معطل کر دیا۔ وہ کوئی جماعتی تنظیم برداشت نہ کر سکتا تھا۔

اسی اثنا میں مسلم لیگ پارٹی نے کوشش کی۔ کہ عبدالقیوم خان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جائے۔ لیکن بعض کانگرسی ممبروں، جن میں میاں جعفر شاہ۔ نوابزادہ اللہ نواز۔ محمد اسلم سالار۔ ارباب عبدالرحمٰن گل گڑھی اور عبداللہ خان وغیرہ شامل تھے۔ عبدالقیوم خان کے ساتھ خفیہ معاہدہ کر کے مسلم لیگ پارٹی میں شریک ہو گئے۔ اس کے باوجود مندرجہ ذیل حضرات نے تحریک عدم اعتماد پیش کرنے کا تہیہ کر لیا۔

میاں مشرف شاہ۔ سردار اسد جان خان۔ نواب قطب الدین خان۔ راجہ سردار خان ارباب محمد شریف خان اور عبدالقیوم خان سواتی —— انہوں نے اپنی ایک مضبوط پارٹی بنالی۔ اور انہیں یقین تھا کہ عدم اعتماد کی تحریک ایوان میں بھاری اکثریت سے پاس ہو گی۔

عبدالقیوم خان کو اس بات کا پتہ چلا۔ تو اس نے فوراً اس تحریک کو ناکام بنانے کے لیئے یہ چال چلی کہ اسمبلی کے سیشن سے صرف ایک دن پہلے اسمبلی میں حزب مخالف کے کانگرسی ممبر عبدالقیوم خان سواتی۔ حاجی فقیرا خان اور بعض دوسرے لوگوں کو گرفتار کر لیا اور بتایا کہ انہوں نے اس کے قتل کی سازش کر رکھی تھی۔

پیر صاحب مانکی شریف نے لاہور میں صاحب اختیار لوگوں کو چیلنج کیا۔ کہ اس معاملہ

کی آزادانہ تحقیق کی جائے۔ اور اگر یہ الزام ثابت ہو تو ان لوگوں کو پھانسی دے دی جائے ورنہ عبدالقیوم خان کو اس سیاسی دروغ بیانی کی سزا دی جائے۔ اور اسے سرحد کی وزارت سے ہٹایا جائے۔ لیکن تحقیق وغیرہ کچھ نہ ہوئی۔ اور کچھ دنوں بعد عبدالقیوم خان نے انہیں بغیر مقدمہ چلائے رہا کر دیا۔ کیونکہ اس وقت عدم اعتماد کی تحریک کا خطرہ ٹل چکا تھا۔

کچھ دنوں بعد پھر مسلم لیگ کونسل میں عبدالقیوم خان کے خلاف ایک بہت بڑا ہنگامہ ہوا کیونکہ اس کے آمرانہ طرز عمل سے سب بے زار تھے چنانچہ حضرت بادشاہ گل جو عبدالقیوم خان کے حامی اور صوبائی لیگ کے صدر تھے انہوں نے مجبوراً استعفےٰ دے دیا۔ اور عبدالقیوم خان خود صدارت سنبھالنے کے لیئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس سلسلہ میں ایبٹ آباد میں ایک ہنگامہ خیز جلسہ ہوا۔ جس کی صدارت لیاقت علی خان مرحوم نے کی۔ اس اجلاس میں نہایت جانب داری اور بے انصافی سے کام لیتے ہوئے غیر نمائندہ لوگوں کو شامل کر کے صوبائی لیگ کی صدارت عبدالقیوم خان کو دے دی گئی۔

اسی طرح اس نے عباس خان اور جلال بابا کو بھی اپنے راستے سے ہٹانے کے لیئے نہ صرف وزارتوں سے ہٹایا۔ بلکہ پانچ سال تک انتخاب کا نا اہل قرار دے دیا۔ اور مسلم لیگ سے بھی خارج کر دیا۔

ان ہی دنوں پیر صاحب مانکی شریف کی سرکردگی میں سرحد کے پانچ وکیلوں نے پروڈا داخل کیا۔ جس میں عبدالقیوم خان پر سنگین الزامات لگائے گئے ۔ ان میں سلطان محمد خان فدا محمد خان۔ قاضی محمد اسلم۔ ارباب آصف خان اور ڈاکٹر عبدالرحیم شامل تھے۔ لیکن مرکز کی رسہ کشی کے باعث گورنر جنرل نے پروڈا نامنظور کر دیا۔ اور تحقیقات کی زحمت گوارا نہ کی۔

عبدالقیوم خان کا زوال

قائداعظم محمد علی جناح پہلے گورنر جنرل پاکستان کی وفات جن افسوس ناک حالات میں ہوئی۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ ان کے بعد لیاقت علی خان نے قلمدان وزارت خود سنبھال لیا۔ اور خواجہ ناظم الدین کو جو بنگال کے وزیراعلیٰ تھے بلاکر گورنر جنرل بنا دیا۔

لیاقت علی خان کی وزارت عظمےٰ کے زمانہ میں پاکستان میں اپوزیشن کا وجود ختم کرنے کے لیئے تمام حربے استعمال کیئے گئے۔ ان کی حیثیت بالکل ایک آمر مطلق کی سی تھی۔ ملک میں شہری آزادی کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ جس سے عوام میں سخت بے چینی اور مایوسی پھیل گئی۔ سرحد پنجاب اور بنگال میں لیاقت علی خان کے خلاف سخت مظاہرے ہوئے۔ اور کالی جھنڈیوں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ لاہور کے ایک جلسے میں انہیں تقریر تک نہ کرنے دی گئی اور مرکز میں بھی ان کے خلاف شدید مظاہرے ہونے لگے۔

عوام کے علاوہ فوج میں بھی ان کے خلاف بددلی پھیل گئی۔ اور فوج کے تمام بڑے بڑے افسروں نے پاکستان میں فوجی انقلاب لانے کی کوشش کی۔ یہ واقعہ "راولپنڈی سازش" کے نام سے مشہور ہے۔ لیاقت علی خان کی زندگی میں ہی اس سازش کا انکشاف ہوا۔ اور میجر جنرل اکبر خان میجر جنرل نذیر۔ ائیر کموڈور محمد خان جنجوعہ۔ بریگیڈیر لطیف۔ کرنل ارباب نیاز محمد خان۔ فیض احمد فیض۔ سجاد ظہیر۔ محمد حسین عطا اور بعض دوسرے فوجی افسروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور پارلیمنٹ کے ایک خاص قانون کے تحت ان کے مقدمہ کے لیئے فیڈرل کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایک خاص ٹریبونل مقرر کیا گیا۔ جس نے انہیں مقدمہ کی سماعت کے بعد بھاری سزائیں دیں۔

اسی دوران میں لیاقت علی خان راولپنڈی کے ایک جلسۂ عام کو خطاب کرنے کے لیئے

آئے ہوئے تھے۔ کہ اس جلسہ میں سید اکبر نامی ایک افغان نے پستول کے دو فائروں سے انہیں شہید کر دیا۔ سازشیوں نے نہایت ہوشیاری سے ملزم کو بھی وہیں ڈھیر کر دیا تاکہ قتل کا سراغ نہ مل سکے۔ چنانچہ آج تک یہ سازش بے نقاب نہ ہو سکی۔

لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین نے جو اس وقت گورنر جنرل تھے۔ اپنے آپ کو کابینہ کے ایک غیر رسمی اجلاس میں خود ہی وزیر اعظم منتخب کر کے تاج برطانیہ سے ملک غلام محمد مرحوم کے لیے گورنر جنرل بننے کی سفارش کی جو منظور ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد ہی گورنر جنرل اور وزیر اعظم کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور یہ کش مکش رفتہ رفتہ شدت اختیار کر گئی۔ اگرچہ خواجہ ناظم الدین پاکستان کے وزیر اعظم۔ وزیر دفاع اور آل پاکستان مسلم لیگ کے صدر تھے۔ لیکن عوام کو ان سے سخت نفرت تھی۔ اور ان کا دور ملک میں ذلت اور نحوست کا دور کہلاتا ہے۔

گورنر جنرل نے عوام کی مخالفت سے فائدہ اٹھا کر کابینہ کے اکثر ممبروں کی حمایت سے اور کمانڈر انچیف محمد ایوب خان کے مشورے سے خواجہ ناظم الدین کو وزارت عظمیٰ کے عہدے سے معزولی کا حکم دے دیا۔ اور محمد علی بوگرا کو جو امریکہ میں سفیر تھا۔ بلا کر وزیر اعظم بنا دیا۔

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی پر پاکستان کے عوام کو بڑی مسرت ہوئی۔ اور گورنر جنرل کے اس اقدام کو سارے ملک میں سراہا گیا۔ اس وقت عبد القیوم خان کراچی میں تھا۔ اسے سرحد جانے سے روکا گیا۔ کیونکہ وہ خواجہ ناظم الدین کے دھڑے میں تھا۔ لیکن عبد القیوم خان نے اجلاس ختم ہونے سے پہلے ہی سرحد جانے کی کوشش کی۔ جس کی اطلاع پاتے ہی گورنر جنرل نے لاہور میں میجر جنرل اعظم خان کو جو ان دنوں لاہور میں فوجی ایڈمنسٹریٹر تھے۔ ٹیلیفون پر

حکم دیا۔ کہ عبدالقیوم خان کو لاہور سٹیشن پر حراست میں لے کر کراچی پہنچا دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

سردار عبدالرب خان نشتر جو شروع میں مرکزی کابینہ میں وزیر مواصلات پھر گورنر پنجاب اور پھر وزیر صنعت رہ چکے تھے۔ بدقسمتی سے خواجہ ناظم الدین کے دھڑے میں شمار ہوتے اور کابینہ سے الگ کر دیئے گئے۔ اور سردار صاحب کی وزارتِ صنعت گورنر جنرل نے عبدالقیوم خان کے حوالے کر کے سرحد کی سیاست سے اس کا رشتہ توڑ دیا۔

عبدالقیوم خان کے وزارت سے الگ ہونے پر سارے سرحد میں لوگوں نے یوم تشکر منایا۔ شادیانے بجائے۔ چراغاں کئے —— اب سوال درپیش تھا کہ یہاں وزارت اعلیٰ کا عہدہ کسے سونپا جائے۔ عبدالقیوم خان کی اشک شوئی کے لئے اسے سرحد بھیجا گیا۔ کہ وہی نئے وزیر اعلیٰ کا انتخاب کرے۔ یہاں اس کے پہلے کابینہ کے وزرار میاں جعفر شاہ۔ ملک الرحمن کیانی اور سالار محمد ایوب خان کے درمیان بڑی کش مکش جاری تھی۔ اور ہر ایک اپنی پارٹی بنانے کے لئے دوڑ دھوپ میں مصروف تھا۔ لیکن عبدالقیوم خان نے سب کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اور غیر متوقع طور پر عبدالرشید خان کو وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ جس پر سارے ملک میں تعجب کا اظہار کیا جانے لگا۔ اس نادر روزگار سیاسی چال بازی کے بعد قیوم خان نے اپنے مخصوص دوست شمس الحق کو بھی سرحد کابینہ میں وزیر صحت مقرر کر دیا۔ جو اس کا بھی ملازم پھر منشی اور پھر لطف خاص کے باعث اس کا پارلیمنٹری سیکرٹری رہ چکا تھا۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد ہی شمس الحق کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دی گئی شمس الحق یہ صورتِ حال دیکھ کر فوراً کراچی پہنچا۔ اور قیوم خان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ اس نے شمس الحق کے خلاف اس تمام مخالفت کا سرچشمہ سردار عبدالرشید کو ٹھہرایا۔ اور کراچی

سے اس ارادہ پر روانہ ہوا۔ کہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے سردار رشید کے خلاف پوری کوشش کرکے اسے ہٹا دے اور نئی وزارت بنا دے۔

اس مقصد کے لیئے وہ سرحد کے دورے کے بہانے روانہ ہوا۔ لیکن یہ تمام سکیم قیوم خان کے آنے سے پہلے ہی سردار رشید کو معلوم ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی حیثیت خوب مضبوط بنالی۔ اور قیوم خان کی آمد پر اس کے استقبال کو بھی نہ گیا۔ اور نہ ہی اس سے کوئی التفات برتا قیوم خان گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرا۔ اور ان واقعات سے اتنا مایوس اور پریشان ہوا۔ کہ فوراً شمس الحق کو ساتھ لے کر پنجاب چلا گیا۔ اور وہاں جاتے ہی اس کا استعفےٰ وزیر اعلےٰ کو بھجوا دیا اور بعد میں خود بھی مجبور ہو کر سرحد لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو گیا۔ چنانچہ یہ صدارت سردار عبدالرشید نے سنبھال لی۔

سردار عبدالرشید کو وزیر اعلےٰ بنانے میں بھی قیوم خان کی ایک خاص چال تھی۔ اس کا خیال تھا۔ کہ چونکہ وہ کوئی سیاسی تجربہ نہیں رکھتا۔ اس لیئے اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہے گا۔ اور وہ اپنی من مانی کر سکے گا۔ اسی لیئے اس نے مسلم لیگ کی صدارت اور اسمبلی کی رکنیت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ تاکہ یہ بتا سکے۔ کہ وہی دراصل سرحد لیگ پارٹی کا لیڈر ہے۔ لیکن اچانک واقعات نے پلٹا کھایا۔ اور رشید اور قیوم کے درمیان اختلافات کی وسیع خلیج حائل ہو گئی ان اختلافات کے بعد شروع شروع میں سردار رشید نے لوگوں میں اپنے آپ کو ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں اس نے متعدد اعلانات اور وعدے بھی کیئے۔ کہ وہ شہری آزادی بحال کر دے گا۔ حزب اختلاف کو کام کرنے کا موقع دے گا۔ اور آئندہ انتخابات غیر جانب دارانہ کرائے گا۔ اس چیز نے وقتی طور پر اسے عوام میں کسی قدر مقبول بنا دیا۔ چنانچہ جب وہ ڈیرہ اسماعیل خان کے ضمنی انتخاب میں کھڑا ہوا۔ تو حزب مخالف نے اسے

جا مقابلہ کامیاب ہونے کا موقع دیا۔ اس نے ۵ر جنوری ۱۹۵۲ء میں صوبے کے تمام سیاسی قیدیوں کو بھی غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔

لیکن جب یہ نظر بند باہر آئے۔ تو اس کا رویہ بدلنے لگا۔ خدائی خدمت گار تحریک پر بدستور پابندی رہی۔ اور باچا خان کو سرحد میں داخلے کی اجازت نہ دی گئی۔

صوبے میں پورے پانچ سال کے تعطل کے بعد عوامی لیگ نے جماعتی تنظیم کے لیے کام شروع کیا۔ لیکن عبدالرشید خان حزب مخالف کی سرگرمیاں برداشت نہ کر سکا۔ اور مئی ۱۹۵۲ء میں سرحد کے بدنام کالے قوانین اور سیفٹی ایکٹ کے تحت حزب مخالف کے تمام رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ اس سلسلہ میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ ان کے نام درج ذیل ہیں۔

ارباب عبدالغفور خان۔ ارباب سکندر خان۔ محمد افضل خان بنگش۔ صنوبر حسین خان۔ خوشحال خان خٹک۔ عمر فاروق۔ ماسٹر شیر علی۔ مولانا نور الحق نور۔ مولانا امام شاہ۔ غلام محمد لالما۔ ماسٹر خان گل سید فارغ بخاری۔

ان گرفتاریوں سے صوبہ سرحد کے عوام میں رشید وزارت کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اس دوران میں ایک بڑا واقعہ یہ پیش آیا کہ صوبے میں ضمنی انتخاب ہونے لگے۔ ایک ہزارہ میں اور دو مردان میں —— ان میں حزب مخالف کی طرف سے مردان کے دونوں حلقوں میں غلام محمد خان لوند خوڑ اور ہزارہ میں محمد ہارون کو ٹکٹ دیئے گئے۔ لیکن انتخابی پروپیگنڈا کے دوران میں میاں جعفر شاہ۔ سردار رشید اور کیانی نے جو تقریریں کیں۔ ان میں تمام جمہوری طریقوں کو بالائے طاق رکھ کر پوری فسطائیت کا مظاہرہ کیا گیا۔ انہوں نے اعلانیہ حزب مخالف پر پاکستان دشمن ہونے کا الزام لگایا۔ اور یہاں تک کہا کہ حزب مخالف کے نمائندے حکومت کی کرسیوں پر ہماری لاشوں سے گذر کر ہی پہنچ سکتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا تھا۔ کہ حکومت مسلم لیگی امیدواروں کو کامیاب بنانے

شریک ہونے کی اجازت دی گئی۔

ان دنوں ایک یونٹ کا ہنگامہ گرم تھا۔ حکومت پروپیگنڈا کر کے اس کے لیئے زمین ہموار کر رہی تھی۔ اور اسے ہر قیمت پر نافذ کرنا چاہتی تھی۔ ادھر بہت کم لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ کابینہ کے ممبروں نے باچا خان سے مل کر انہیں ایک یونٹ کی حمایت پر آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن انہوں نے صاف کہہ دیا۔ کہ یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے ملک کو نقصان پہنچنے اور اعزاجات بڑھ جانے اور بدنظمی پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہا۔ کہ جہاں تک وہ لوگوں کے خیالات معلوم کر چکے ہیں۔ تو ان کے خیال میں عوام بھی اس کے حق میں نہیں ہیں۔ اس لیئے پہلے تو انہیں یہ خیال ہی ترک کر دینا چاہیئے۔ ورنہ عوام کی رائے معلوم کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھانا چاہیئے۔ لیکن انہوں نے باچا خان کی باتوں پر دھیان نہ دیا۔ اور کہا کہ اب تو ایک یونٹ قائم ہو کر ہی رہے گا۔ کیونکہ یہ حکومت کے وقار کا سوال ہے۔

ادھر گورنر جنرل نے ڈاکٹر خان صاحب سے بات چیت شروع کر رکھی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر خان صاحب سے سمجھوتہ ہو گیا۔ ایک یونٹ بنا دیا گیا۔ اور ڈاکٹر خان صاحب کو اس کا وزیر اعلےٰ مقرر کیا گیا۔ باچا خان کا اس سلسلہ میں ڈاکٹر خان صاحب سے اختلاف تھا۔ لیکن انہوں نے پروا نہ کی۔ اور وزارت قبول کر لی۔

باچا خان پنجاب واپس آئے۔ اور ضلع کیمبل پور میں خورغشتی گاؤں میں سکونت اختیار کی۔ صوبہ سرحد کے لوگ باچا خان پر ان عائد کردہ پابندیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے سول نافرمانی کی تجویز پیش کی۔ لیکن باچا خان نے اسے پسند نہ کیا۔

۱۹۵۵ء میں نئی پارلیمنٹ کے مری سیشن میں پنجاب اور بنگال کے سیاست دانوں میں پھر اختلاف پیدا ہو گیا۔ ان دنوں باچا خان کے سرحد میں داخلے پر بدستور پابندی عائد تھی۔ انہوں

نے وہاں بھی ایک یونٹ کی پر زور مخالفت کی۔ پھر اچانک انہیں سرحد میں داخلہ کی اجازت دے دی گئی۔

باچاخان کا تیسرا تاریخی استقبال

۱۰ / جولائی ۱۹۵۵ء صبح آٹھ بجے خدائی خدمت گار کے ممتاز رہنما اور بانی خان عبدالغفار خان نے قریباً سات سال کے طویل عرصہ کی نظربندی کے بعد اپنے صوبے میں پہلی بار قدم رکھا۔ حضرو کے مقام سے آپ کا جلوس ٹھیک آٹھ بجے صبح دریائے اٹک کے پل پر پہنچا۔ یہ جلوس لاتعداد موٹر کاروں، جیپ کاروں بسوں اور ویگنوں پر مشتمل تھا، جس میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ شامل تھے۔ باچا خان کی کار جلوس کی قیادت کر رہی تھی۔ خود باچا خان کار کی پچھلی سیٹ پر دائیں طرف اور پیر صاحب مانکی شریف بائیں طرف بیٹھے تھے۔ جوں ہی یہ جلوس اٹک پار کر کے صوبہ سرحد کی حدود میں داخل ہوا۔ تو فوراً فنہ استقبالیہ کمیٹی کے کارکنوں اور مردان اور صوابی سے آئے ہوئے ہزاروں لوگوں نے باچا خان کا استقبال کیا۔ اور انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے باچا خان زندہ باد اور پیر صاحب مانکی شریف زندہ باد کے نعرے لگائے ——— ۲۱ گولوں کی سلامی کے بعد یہ جلوس خیرآباد کنڈ کی طرف روانہ ہوا، سڑک کے دونوں طرف ہجوم باچا خان کے فلک شگاف نعرے لگا رہا تھا اور باچا خان مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کے سلام کا جواب دے رہے تھے۔ خیرآباد میں بھی باچا خان کو ۲۱ گولوں کی سلامی دی گئی باچا خان کو سات برس کی طویل مدت کے بعد لوگ اپنے درمیان دیکھ کر فرط مسرت سے اچھل رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو پھوٹ رہے تھے۔

خیرآباد کے بازار میں رنگین جھنڈیاں اور مختلف قسم کے اشتہار آویزاں تھے۔ جن میں باچا خان کو خوش آمدید کہا گیا تھا۔ کاروں کا جلوس خیرآباد کے بازار میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اگرچہ

لوگوں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جلوس نہ رُک سکا۔ اور بازار سے نکل کر جہانگیرہ کی طرف روانہ ہوا۔

جہانگیرہ میں باچا خان کا جلوس ۹ بجے پہنچا۔ جہاں آپ کو ۲۱ گولوں کی سلامی دی گئی۔ اور شاندار استقبال کیا گیا۔ وہاں آپ نے ہزاروں لوگوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ــــ

"میں آپ کی محبت اور خلوص کا شکریہ ادا کرتا ہوں میں کافی عرصہ آپ سے دور رہا۔ لیکن یقین کیجئے ہمارے جسم ایک دوسرے سے ضرور دُور تھے۔ مگر رُوحیں جُدا نہیں تھیں۔ قوموں پر اس قسم کے امتحانات آتے رہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ ہم اس آزمائش میں پُورے اُترے۔ خدائی خدمت گار تحریک پشتونوں میں اتحاد پیدا کرنے اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے شروع کی گئی۔ اس تحریک نے عوام کے لیئے جو کام کیا کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس تحریک نے عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ اور آپ نے آزادی حاصل کی۔ لیکن اپنی خودغرضیوں کی بنا پر آزادی کو مستحکم بنانے میں ناکام رہے۔ اور ملک کو بُھوک، ننگ اور بے روزگاری کی مشکلات میں مبتلا کر دیا۔

انہوں نے کہا۔ میں نے جب اپنے صوبے میں یہ تحریک شروع کی۔ تو لوگوں کو خودغرضی ترک کرنے اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا کرنے کی تلقین کی۔ لیکن لوگ اس تعلیم کو بھول گئے۔ میرا یہ پیغام دیہات میں پہنچا دیجئے۔ اور لوگوں سے کہیئے۔ کہ وہ میری بتائی ہوئی باتوں پر عمل کریں۔ کیونکہ اسی صورت میں وہ اپنے ملک اور آئندہ نسلوں کو خوشحال بنا سکیں گے۔"

جلوس جہانگیرہ سے اکوڑہ خٹک کو روانہ ہوا۔ تو ہزاروں لوگ باچا خان کو دیکھنے کے لیئے میلوں تک ان کی کار کے ساتھ پیدل اور سائیکلوں پر جانے لگے۔ یہ جلوس ابھی ایک فرلانگ بھی نہیں گیا تھا۔ کہ سڑک پر کھڑے ہوئے لوگوں کے ہجوم نے اسے رُکنے پر مجبور کر دیا۔ عقیدت مند آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کرتے۔ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے۔ شدید گرمی کے باوجود باچا خان ایک کُھلی کار میں بیٹھے

تھے۔ اور کھدر کے کپڑوں میں ملبس تھے۔ ان کے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اور وہ مسکرا رہے تھے۔ موضع شیدو سے گزر کر یہ جلوس دس بجے اکوڑہ خٹک پہنچا۔ یہاں اجمل خٹک۔ پیر صاحب اکوڑہ۔ بادشاہ گل صاحب اور ان کے عقیدت مندوں اور ہزاروں لوگوں نے باچا خان کا استقبال کیا۔ انہیں پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا۔ اور گولوں کی سلامی بھی دی۔ باچا خان نے اکوڑہ میں بھی لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔

اکوڑہ سے یہ جلوس نوشہرہ پہنچا۔ جہاں لاتعداد شہریوں اور دیہاتیوں نے باچا خان کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ پھولوں کے ہار پہنائے اور گولوں کی سلامی دی۔ نوشہرہ بازار میں لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ یہاں بھی باچا خان نے عوام سے خطاب کیا اور کہا۔

"وہی قومیں ہمیشہ کامیاب ہوتی ہیں۔ جو اپنا وقت باتوں میں ضائع کرنے کے بجائے زیادہ تر عمل کی طرف توجہ دیتی ہیں۔ انگریزوں کا دور ختم ہوا۔ اب ہم آزاد ہیں۔ اس لئے ہمیں آزادانہ طور پر سوچنا چاہیئے۔"

جلوس گیارہ بجے نوشہرہ سے روانہ ہو کر راستے میں مختلف مقامات پر رکتا ہوا بارہ بجے پبی پہنچا۔ وہاں بھی زبردست استقبال کیا گیا۔ اور ۲۱ گولوں کی سلامی دی گئی۔ پبی کے بازار کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ اور جگہ جگہ رنگ برنگی جھنڈیاں آویزاں تھیں۔

باچا خان نے وہاں بھی عوام سے خطاب کیا۔ اور ان سے متحد و متفق رہنے کی اپیل کی۔ وہیں آپ نے میاں قیمت شاہ کے ہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اور کچھ دیر آرام کیا۔

باچا خان کا جلوس ساڑھے چار بجے پبی سے پشاور روانہ ہوا۔ اور مختلف مقامات پر رکتا ہوا ساڑھے چھ بجے پشاور پہنچا۔ اٹک سے پشاور تک تمام راستے میں لوگوں کی طرف سے سینکڑوں خوش نما دروازے لگائے گئے تھے۔ جگہ جگہ لوگ بینڈ باجے بجا رہے تھے اور ناچ رہے تھے۔ پولیس کا انتظام

معقول تھا۔ راستے میں کئی جگہ باچا خان کو سپاسنامے پیش کیے گئے۔

آپ کا جلوس جو میلوں لمبا تھا۔ جب پشاور کے قریب پہنچا۔ تو لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر نے جلوس کو تیزی سے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اب یہ جلوس نہایت معمولی رفتار سے پشاور کے مختلف بازاروں سے گزرتا ہوا کنگھم پارک پہنچا۔

یہ جلوس سرحد کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ تھا۔ قدم قدم پر ہزاروں عقیدت مند چشم براہ کھڑے تھے۔ شہروں قصبوں اور بستیوں کے لوگوں نے عید کی سی خوشی منائی۔ جلوس پشاور پہنچنے سے پہلے چار لاریاں اور ایک سٹیشن ویگن جن میں خدائی خدمت گار سوار تھے۔ مسرت کے نعرے لگاتے قصہ خوانی سے گذرے۔ اس کے بعد ڈھول سرنا بجانے والوں کی ٹولیاں گزریں۔ کچھ دیر بعد ۱۹۔ اونٹوں کا ایک قافلہ گزرا۔ یہ قافلہ نوبت بجانے والوں کا تھا۔ اس کے بعد جیپ گاڑیوں کا قافلہ اور پھر موٹر کاریں۔

ان کے درمیان پھولوں سے لدی ہوئی ایک سفید کار میں باچا خان اپنے عقیدت مندوں کے نعرہ ہائے مسرت کا جواب محبت بھری مسکراہٹ سے دے رہے تھے۔ جلوس آگے بڑھتا گیا۔ اور قصہ خوانی سے ہوتا ہوا بالا حصار کی مغربی سڑک سے ہو کر کنگھم پارک پہنچا۔ جہاں آپ نے عوام سے خطاب کیا۔

"میرے بھائیو!

ہم بڑی مدت تک ایک دوسرے سے جدا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے دل کبھی جدا نہیں ہوئے ان آٹھ برسوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں آیا جب میں نے آپ کو یاد نہ کیا ہو۔ آپ جانتے ہیں۔ میں باتیں بہت کم کیا کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میرا عقیدہ ہے۔ کہ جو لوگ باتیں زیادہ کرتے ہیں وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ باتوں سے زیادہ عمل کرنا چاہیے۔ لہٰذا میں مختصر الفاظ میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ پر جو اُفتاد پڑی ہے۔ اس کا باعث کیا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا۔ ہم نے اپنی تحریک کا نام خدائی خدمت گار رکھا تھا۔ اور خدا

سے وعدہ کیا تھا۔ کہ ہم لوگوں کی جو خدمت کریں گے۔ وہ صرف اللہ کے لیئے کریں گے۔ لیکن جب آزمائش کا وقت آیا۔ تو ہم اس میں ناکام ہوئے۔ اور جو کامیابی ہمیں حاصل ہوئی۔ اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ہماری ناکامی کا سبب یہ تھا۔ کہ ہم میں سے ہر شخص یہ چاہتا تھا۔ کہ کامیابی اسکے حصے میں آئے چنانچہ جب انہیں حکومت مل گئی۔ تو انہوں نے وہ تمام وعدے بھلا دیئے۔ جو انہوں نے خدائی خدمت گار کی حیثیت سے کیئے تھے۔ یہی وہ کمزوری تھی۔ جس کی وجہ سے ہم پر افتاد پڑی۔ قوموں پر ایسی مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ اس لیئے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو محسوس کریں۔ اور ان کی اصلاح کریں۔ لیکن خدا کا شکر ہے۔ کہ اب مصیبت کا زمانہ گذر گیا۔ تاریکی دور ہو گئی۔ اور اجالا پھیل گیا۔

جن دنوں میں جیل میں تھا۔ ہر چند آپ کو ڈرایا دھمکایا جاتا رہا۔ تاہم میرے دل میں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا۔ کہ کوئی ہماری تحریک کو دبانے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اس لیئے کہ مجھے یقین تھا کہ یہ ہمارا ملک ہے۔ اور اس پر ہم ہی حکومت کریں گے۔ اور یہاں کوئی بھی حکومت نہیں کر سکتا۔

میں نے ہمیشہ حکومت سے یہی کہا ہے۔ کہ میرا اصول عدم تشدد یعنی محبت ہے۔ میں تشدد کا قائل نہیں ہوں اس لیئے کہ تشدد قوموں میں نفرت پھیلاتا ہے۔ اس موقع پر آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں۔ جن دنوں میں جیل میں تھا۔ ان دنوں میں نے وہاں مرغیوں کے بچے پال رکھے تھے۔ مرغیاں جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ انسان کو اپنا دشمن سمجھتی ہیں۔ اس لیئے کہ وہ ان سے اچھا سلوک نہیں کرتا۔ انہیں ذبح کرتا ہے۔ لیکن مرغیوں کے یہ بچے مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئے۔ کہ جب بھی میں انہیں بلاتا۔ وہ بھاگ کر میرے پاس آجاتے۔ اور کوئی گود میں بیٹھ جاتا۔ تو کوئی کندھے پر چڑھ جاتا۔ ایک دن میں اسی طرح مرغیوں کے بچوں کو دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ کہ اتفاقاً کرنل سمتھ جیلر صاحب سے خاموشی کے ساتھ آکر یہ کھیل دیکھنے لگے۔ میری نظر ان پر پڑی۔ تو وہ قریب آگئے۔ اور پوچھنے لگے۔ یہ تم کیا کر رہے

ہو۔ میں نے کہا جو تم دیکھ رہے ہو۔۔۔ بولے کیا مطلب؟ میں نے کہا تم مجھ کو تو یہ تمہارے لیے ایک سبق ہے۔ تم جانتے ہو مرغیاں انسان کو دشمن سمجھتی ہیں۔ لیکن یہ مرغیوں کے بچے میرے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف محبت ہے۔

خیر یہ تو ایک قصہ تھا۔ ویسے میں نے لیاقت علی خان کے زمانے میں موجودہ گورنر جنرل سے یہ بات کہی تھی۔ کہ حکومت جو ظلم چاہے ہم پر کرے۔ لیکن ہمیں اپنا قصور تو بتائے۔ میں نے کہا تشدد کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ اس سے نفرت پھیلتی ہے۔ مگر میری بات کسی نے نہ مانی۔ انہوں نے جو چاہا کیا۔ مگر آپ نے دیکھ لیا۔ کہ پٹھانوں کا جذبہ کوئی ختم نہ کر سکا۔ آج بھی یہی کہتا ہوں۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ پاکستان ترقی کرے۔ اور ایک مضبوط ملک بن جائے۔ تو اسے اپنے عوام کا اعتماد حاصل کرنا ہو گا۔ اور اسے ہر کام عوام کی رائے اور مشورے سے کرنا ہو گا۔ اور اگر حکومت ایسا نہیں کرے گی۔ تو ہم ایک دوسرے سے دُور رہیں گے۔

پنجاب کے لوگ کہتے ہیں۔ سرحد میں صوبہ پرستی پیدا ہو چکی ہے۔ میں آج ہی یہاں آیا ہوں۔ مجھے علم نہیں۔ اگر ایسا ہے۔ تو اس میں پٹھانوں کا قصور نہیں۔ قصور ان لوگوں کا ہے۔ جنہوں نے یہ سوال پیدا کیا ہے۔ اور پٹھان اور پنجابی کے مسئلے کو ہوا دی ہے۔ وہ لوگ حقیقتاً چاہتے ہیں کہ پٹھان اور پنجابی میں نفرت پیدا ہو۔

ہم پنجابیوں کے خلاف نہیں ہیں۔ ان سے نفرت نہیں۔ محبت کرتے ہیں۔ اور محبت چاہتے ہیں۔

یہ ہمارا ملک ہے۔ میں اب بھی ان کی خدمت کے لیے تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ جمہوری طریقوں پر چلیں۔ اور ہر کام لوگوں کی مرضی سے کریں۔ میں یہاں کی تمام جماعتوں سے خواہ وہ عوامی لیگ ہو یا مسلم لیگ ہو یا خدائی خدمت گار ہو۔ یا کوئی اور پارٹی ہو یہی کہتا ہوں کہ یہ ہمارا ملک ہے ہم اس میں آباد

ہوں گے۔ اگر ملک تباہ ہوگیا۔ تو ہم بھی تباہ ہو جائیں گے۔

حکومت کیا ہے۔ حکومت آج بھی ہمارے قدموں میں ہے۔ مگر ہم قبول نہیں کرتے۔ اس لیے کہ آپ حکومت سنبھالنے کے اہل نہیں۔ میں اس وقت تک حکومت سنبھالنے کو تیار نہیں ہوں جب تک آپ میں حکومت سنبھالنے کی لیاقت پیدا نہیں ہوتی۔"

جلسے کے آغاز میں پشتو کے مشہور شاعر اجمل خٹک کی یہ نظم ترنم سے پڑھی گئی۔ جس نے حاضرین پر وجد کا سا عالم طاری کر دیا۔

فخر افغانہ ستا راتگ سرہ ژوندون راغئی ہر کلہ راشہ

(اے فخر افغان تیری آمد سے ہم میں زندگی آ گئی ہے خوش آمدید)

اور فنا نے اپنی پشتو نظم پڑھی جس کا مصرع تھا۔ کہ پشتنو لویہ بابا ہر کلہ (پٹھانوں کے باپ خوش آمدید)

ون یونٹ فرنٹ کا قیام

ادھر باچا خان کو سرحد میں داخلے کی اجازت ملی۔ ادھر ایک یونٹ کو عملی شکل دے دی گئی۔ باچا خان نے سرحد عوامی لیگ کے رہنماؤں پیر صاحب مانکی شریف اور ارباب عبدالغفور خان سے مل کر سرحد میں اینٹی یونٹ فرنٹ بنایا۔ اور نہایت وسیع پیمانے پر اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ سارے صوبہ کا دورہ کیا۔ اور تقریروں اور جلسے جلوسوں کی صورت میں ایک یونٹ کے خلاف ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔

اب مرکز میں ایک اور انقلاب بھی آ چکا تھا۔ غلام محمد کی جگہ گورنر جنرل کا عہدہ میجر سکندر مرزا نے سنبھال لیا تھا۔ وزیر اعظم چودھری محمد علی تھے۔ لیکن کچھ دنوں بعد انہیں ہٹا کر کل پاکستان عوامی لیگ کے کنوینر مسٹر حسین شہید سہروردی کو وزارت عظمیٰ کا قلمدان سونپ دیا گیا۔

ادھر مری میں پارلیمنٹ کے خصوصی اجلاس کے بعد صوبہ سرحد کے وزیروں میں سے ہر ایک

کو بھی یقین دلایا گیا۔ کہ مغربی پاکستان کا وزیر اعلےٰ اسے بنایا جائے گا۔ چنانچہ مری سے واپسی پر سرحد
اسمبلی کے اجلاس میں سردار عبدالرشید وزیر اعلےٰ سرحد نے ایک یونٹ کی تجویز پیش کی۔ جو پاس
ہو گئی۔ اور اس طرح سارے پاکستان میں اس نے سب سے پہلے یہ تجویز پاس کرانے کا سہرا حاصل کیا
لیکن صرف چند دنوں بعد ہی جب انہیں معلوم ہوا کہ مغربی پاکستان کی وزارت اعلیٰ کا منصب ڈاکٹر
خانصاحب کو مل رہا ہے۔ اور ان کے لیئے عام وزارت کی بھی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ تو سردار رشید
اور میاں جعفر شاہ سرحد کی وزارت سے مستعفی ہو کر ایک یونٹ کی کھلم کھلا مخالفت کرنے لگے۔

اس عبوری دور کے لیئے یہاں سردار بہادر کو گورنر بنا کر بھیجا گیا اور پھر یونٹ بن گیا۔ اور ڈاکٹر
خان صاحب اس کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اور مشتاق احمد گرمانی کو گورنر بنایا گیا۔ اور پھر ڈاکٹر
خانصاحب نے ری پبلکن پارٹی کے نام سے ایک جماعت بنا ڈالی جس میں تمام اقتدار پرست مسلم
لیگی جمع ہو گئے۔ اور بعد میں سردار رشید اور میاں جعفر شاہ نے بھی مسلم لیگ کو چھوڑ کر ری پبلکن پارٹی
کو اپنا لیا۔ چنانچہ سردار رشید بھی مغربی پاکستان کی کابینہ میں وزیر لے لیئے گئے اور میاں جعفر شاہ
کو مرکزی وزارت میں جوڑ دیا گیا۔

باچا خان کا عدالت عالیہ میں تحریری بیان

فخر افاغنہ خان عبدالغفار خان نے جن پر تعزیرات پاکستان کی دفعات ۱۲۳-ا، ۱۲۴-ا اور ۱۵۳-ا کے تحت مقدمہ چل رہا تھا - ۲۰ ستمبر ۱۹۵۶ء کو مغربی پاکستان کی عدالتِ عالیہ میں ایک تحریری بیان پیش کیا۔ اس تحریری بیان کا متن نذرِ قارئین ہے۔

مائی لارڈ (جناب والا)

یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے۔ کہ پاکستان اسلامی تصورات پر مبنی ایک اسلامی جمہوریہ ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ ایک ظالم اور بگڑے ہوئے (جابر) سلطان کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنا بہترین جہاد ہے۔ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ادنیٰ پیروکار کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جناب والا کے سامنے یہ حدیث بیان کرنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ کہ میرے مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت یہ حدیث آپ کے سامنے رہے۔ براہ کرم مجھے اجازت دیجئے۔ کہ میں اپنے مقدمہ، اپنے کام، اپنی زندگی اور اپنی سرگرمیوں کے متعلق چند حقائق اس فاضل عدالت کے سامنے پیش کروں

ابتدائی حالات

میں نے جب ۱۹۰۸ء میں میٹریکولیشن کا امتحان دیا۔ تو میرے والد کی خواہش یہ تھی۔ کہ میں انگلستان جا کر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کروں۔ ہم دو بھائی ہیں۔ ہم میں سے ایک جو اب ڈاکٹر خان صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ اس زمانے میں انگلستان میں تھے۔ اور وہاں ڈاکٹری کی تعلیم پا رہے تھے۔ اس طرح بیٹوں میں سے صرف میں گھر میں تھا۔ میری والدہ مجھے انگلستان بھیجنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ چنانچہ میں نے اپنی والدہ کی خوشنودی کی خاطر باہر جانے کا خیال ترک کر دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا۔ کہ ماں کی خوشنودی حاصل کرنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔

اس زمانے میں میری قوم .... تاریکی میں تھی۔ ہمارے علاقے

میں سکول نہیں تھے۔ اگر کوئی سکول تھا بھی تو ملا ان سکولوں میں تعلیم دلانے کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ یہ سکول انگریزوں نے قائم کیئے ہیں۔ اور وہاں تعلیم حاصل کرنا کفر ہے۔

تحریکِ خلافت

چنانچہ ترویجِ علم کے لیئے بعض رفیقوں کے تعاون سے میں نے ایک مسلم سکول کے قیام کی تحریک شروع کی۔ بعد میں ہم کئی سکول قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دریں اثنا تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ اور اسلام کے ایک ادنےٰ نثار کی حیثیت سے میں اس میں شامل ہو گیا۔ اسی تحریک کے دوران میں مجھے تین سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ اس مرحلے پر میں نے یہ محسوس کیا۔ کہ اگرچہ ہماری تعلیمی صورتِ حال میں اصلاح کے کچھ آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ لیکن ہمارے سماجی حالات بدستور خراب ہیں۔

خدائی خدمت گار

کچھ عرصہ بعد میں نے "خدمت گار" تحریک شروع کی۔ یہ ایک خاص سماجی اور اصلاحی تحریک تھی۔ اور اس کا مقصد ان بُری رسوم کا قلع قمع کرنا تھا۔ جو اس وقت ہماری قوم میں راہ پا چکی تھیں۔ لیکن ابھی تحریک کی عمر چند مہینے بھی نہیں ہونے پائی تھی۔ کہ حکومت نے ہمیں گرفتار کر لیا۔ یہ امر میرے لیئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ پھر حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کے لیئے ایسے غیر انسانی طریقوں سے کام لیا۔ کہ میں انہیں یہاں بیان کرتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتا ہوں۔

کئی سال گذر گئے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں میں نے اپنے آپ کو گجرات سپیشل جیل میں محبوس پایا۔ یہ جیل اس وقت پنجاب کے سیاسی قیدیوں کے جیل کی حیثیت رکھتی تھی یہاں ہمارے ایک یا دو پرانے ساتھی ہم سے ملنے آئے۔ اور انہوں نے ان مظالم کی افسوس ناک داستانیں بیان کیں۔ جو انگریزی حکومت ہماری قوم پر توڑ رہی تھی۔ اُن کی باتیں سُن کر ہمیں بہت صدمہ پہنچا۔ اور آپس میں صلاح مشورہ

کے بعد ہم نے اپنے دوستوں کو ہدایت کی۔ کہ وہ دہلی۔ لاہور اور شملہ جائیں۔ اور مسلم لیگ اور دوسری مسلم تنظیموں کے لیڈروں سے رابطہ قائم کریں۔ انہیں ہم اپنا مسلمان بھائی سمجھتے تھے اور ہمیں بڑی امید تھی کہ وہ اس خوف ناک صورتِ حال میں ہماری مدد کریں گے۔ کچھ عرصہ بعد میرے دوست واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ مسلم لیگ ہماری مدد کے لیے تیار نہیں ہے کیونکہ ہماری جنگ انگریزوں کے خلاف ہے۔ اور مسلمان لیڈر انگریزوں سے لڑائی چھیڑنے کے حق میں نہیں ہیں۔

کانگریس سے اتحاد

اس کے بعد ہمارے ساتھی کانگریسی رہنماؤں کے پاس پہنچے۔ کانگریسی لیڈروں نے ان سے کہا کہ اگر ہم کانگریس کی حمایت کریں۔ تو وہ بھی ہماری مدد کے لیئے تیار ہو جائیں گے۔ یہ تھے وہ حالات جن کے تحت ہم نے کانگریس سے اتحاد قائم کیا۔ اور اس طرح انگریزوں پر بے اعتمادی اور شک کے باعث ہماری سماجی تحریک ایک سیاسی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن اب بھی اس میں اور ملک کی دوسری ہم عصر سیاسی تحریکوں میں بڑا فرق تھا۔ ہماری تحریک نے سیاسی بن جانے کے باوجود اپنی مذہبی اور روحانی خصوصیات اور سماجی و اقتصادی اصلاح کی نوعیت برقرار رکھی۔

میں نے وہ حالات جن کے تحت ہم کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔ اس لیئے بیان کیے ہیں۔ کہ پنجاب کے بعض اخبارات آج بھی ہمیں بدنام کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اور وہ ہمیں کانگریسی کہہ کر ہمارے بارے میں غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں۔ غلطی پر ہم تھے یا مسلم لیگ؟ اس کا اندازہ کرنے کے لیئے ان حقائق پر پوری طرح سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ ہم تنہا انگریزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں مدد کی ضرورت تھی۔ اور ان حالات میں جب کہ مسلم لیگ اور مسلمان لیڈروں نے مدد دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ہم کانگریس سے اتحاد کے سوا اور کیا

راستہ اختیار کر سکتے تھے؟

نون سے ملاقات

۱۹۳۱ء میں جب گاندھی ارون معاہدہ ہوا۔ تو مجھے اور میرے دوسرے رفقائے کار کو رہا کر دیا گیا۔ اسی سال کے آخر میں مجلس عاملہ کا اجلاس شملہ میں منعقد ہوا جس میں میں نے بھی شرکت کی۔ شملہ میں کسی کالج کے ایک طالب علم نے ہمیں سیسل ہوٹل میں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت میں سر فیروز خان نون بھی موجود تھے۔ جو اس وقت پنجاب کی وزارت کے ایک رکن تھے۔ سر فیروز خان نون نے مجھ سے کہا۔ کہ ہم نے کانگریس میں شامل ہو کر انہیں دغا دی ہے۔ میں نے انہیں بتایا۔ کہ انگریز ہمیں کچلنا چاہتے تھے۔ اور چونکہ ہم تنہا ان کے مقابلے کے اہل نہیں تھے۔ اس لیئے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ سب سے پہلے ہم نے مسلم لیگ سے مدد کی درخواست کی تھی۔ ہم مسلم لیگی لیڈروں کو اپنا مسلمان بھائی تصور کرتے تھے۔ اور ہمیں امید تھی کہ وہ ہماری ضرور مدد کریں گے۔ لیکن جب انہوں نے ہمیں مدد دینے سے انکار کر دیا۔ تو ہم نے کانگرس کی طرف دست تعاون بڑھا دیا اگر سر فیروز خان نون اور مسلمان لیڈر مسلمانوں کی تباہی نہیں چاہتے تو اب بھی کوئی نقصان نہیں ہوا پنجاب کے مسلمانوں اور لیڈروں کو ہمارے ساتھ اتحاد کرنا چاہیئے حقیقت یہ تھی کہ ہم انگریزوں کی غلامی کے خاتمے اور آزادی کے خواست گار تھے۔ اور اگر مسلمان لیڈر جدوجہد آزادی میں شامل ہونے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ تو ہم بھی مہاتما گاندھی کو چھوڑنے اور کانگریس سے مستعفی ہونے پر تیار تھے۔ میں نے سر فیروز خان نون سے کہا۔ کہ انہیں اپنا سرکاری عہدہ چھوڑنا پڑے گا۔ ملک صاحب نے کہا۔ کہ وہ اس ضمن میں اپنے رفقائے کار سے صلاح مشورے کے بعد مجھے جواب دیں گے — مجھے اس جواب کا آج بھی انتظار ہے۔

۱۹۴۰ء میں ہندو مسلم فسادات کے دوران پٹنہ میں میری ملک صاحب سے اتفاقیہ

ملاقات ہو گئی۔ وہ اس وقت مسٹر پولسن کے ہوٹل میں تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ کہ اب میرے تاثرات کیا ہیں۔ میں نے کہا کہ میرا جواب اب بھی وہی ہے۔ جو میں پہلے دے چکا ہوں

پاکستان کا نظریہ

میں پاکستان کے نظریہ کا کبھی مخالف نہیں تھا۔ لیکن پاکستان کے بارے میں میرے اپنے تصورات قدرے مختلف اور نئے تھے مسلمانوں کے وطن کا میرے ذہن میں جو تصور تھا۔ اس کے تحت پنجاب اور بنگال کی تقسیم کسی طرح ممکن نہ تھی۔ اس کے علاوہ میں اس بات پر بھی یقین نہیں رکھتا تھا۔ کہ بہت سے مسلمان لیڈروں کا یہ دعوٰے خلوص پر مبنی ہے۔ کہ وہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ مسلمان عوام کی خاطر کر رہے ہیں میرے نزدیک ان میں اکثر انگریزوں کے پٹھو تھے۔ انہوں نے اپنی عمر میں کبھی مسلمان عوام یا اسلام کی خدمت نہیں کی تھی۔ اور نہ ان مقاصد کے لیئے کوئی قربانی ہی دی تھی۔ میں سمجھتا تھا۔ کہ یہ لوگ پاکستان اور اسلام کے نام پر عوام کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ محض اپنے لیئے پاکستان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ میری رائے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائی مذہبی نہیں۔ بلکہ اقتصادی تھی۔ اور میں سمجھتا تھا کہ انگریزوں نے اس لڑائی کو زیادہ سنگین بنا دیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ انگریزوں کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے بعد جب ملک آزاد ہو گا۔ اور ایک قومی حکومت قائم ہو گی۔ تو تمام ذمہ داری ہمارے کاندھوں پر آپڑے گی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ فضا بدل جائے گی۔ اور ہمارے آپس کے تعلقات بہتر ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس وقت بھی حالات بہتر نہ ہوئے۔ اور یہ محسوس کیا گیا کہ ہم مطمئن نہیں ہیں تو پھر ہم ہندوؤں سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ اور ہم ایسا کر سکتے تھے۔ کانگریس کمل صوبائی خود مختاری کا اصول تسلیم کر چکی تھی۔ اور صوبوں کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر ان کی اکثریت مرکز سے علیحدگی کا فیصلہ کرے تو وہ خود مختار مملکت بن جائیں۔

شملہ کانفرنس

صوبہ سرحد میں مسلمان آباد ہیں۔ ہمارا ہندوؤں سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ کانگریس میں ہم جو کچھ کہتے تھے اُسے منظور کر لیا جاتا تھا۔ اس جانب سے ہمیں کسی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ وہ (کانگریسی لیڈر) اس بات کا اعتراف کرتے تھے۔ کہ ہم نے جہدِ آزادی میں ہر ممکن قربانی پیش کی ہے۔ اور ملک کی آزادی کے لیے ہمیشہ سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں۔ شملہ کانفرنس میں جب ایک بنیادی مسئلہ پر شدید اختلافات رونما ہوئے تو میں نے سردار عبدالرب نشتر سے ملاقات کی۔ اور ان سے کہا کہ مسٹر گاندھی مسلمانوں کو اُن کے واجبی حقوق سے زیادہ دینے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ مسٹر جناح کانگریس کی مخالفت ترک کر دیں۔ میں خود مسلمانوں کے تمام مطالبات کی تکمیل اور اُن کے حقوق کی ضمانت دینے کے لیے تیار تھا ——— اس پر سردار صاحب مسٹر جناح سے مشورہ کرنے گئے۔ اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اُن پر غالب نہ آ سکے۔ اور کانفرنس ناکام ہو گئی۔

ہندوستانی فیڈریشن

متحدہ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان آباد تھے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ اتنی بڑی تعداد کو آسانی کے ساتھ زیر نہیں کیا جا سکتا۔ میری رائے تھی۔ کہ کوئی طاقت ہمیں نیست و نابود نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر کسی نے ہمیں محکوم بنانے کی کوشش کی۔ اور ہمارے کانوں میں اس کی بھنک پڑ گئی۔ تو پھر ہم علیحدہ ہو جائیں گے۔ اسی خیال کے تحت میں اس نقطۂ نظر کا حامی تھا۔ کہ اگر کانگریس ہماری شرائط تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اور اس بات کا یقین دلائے۔ کہ ہندوستان کی آئندہ حکومت سوشلسٹ ری پبلک ہو گی۔ تو مسلمانوں کو مجوزہ ہندوستانی وفاق میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ اور اس میں اُن کا مفاد مضمر ہے۔ میرے نزدیک سوشلسٹ ری پبلک طرزِ حکومت میں مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی کشش یہ تھی۔ کہ وہ بہ حیثیت قوم ہندوؤں کے مقابلے میں غریب طبقوں سے

تعلق رکھتے تھے۔ اگر کانگریس ان شرائط کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتی۔ تو ہم مسلم اکثریت کے صوبوں میں ضروری فیصلے کر کے فیڈریشن سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔ میں اب بھی اس بات پر یقین رکھتا ہوں۔ کہ اس طرح ہم فائدے میں رہتے۔ کیونکہ اس منصوبے میں ــــ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی کوئی تجویز شامل نہیں تھی۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں نے میرے اس مشورے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اور مجھے ہندو گردان لیا گیا۔

ہندوستان اور پاکستان کے قیام کے موقعہ پر ایک افسوس ناک المیہ کھیلا گیا۔ لاکھوں افراد نقل وطن کر کے ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلے گئے۔ اور ہزاروں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اتنی بھاری تعداد میں لوگوں کے ترک وطن سے جو صورت حال پیدا ہوئی۔ اس سے عہدہ برآ ہونا حکومت کے لیئے کوئی آسان بات نہیں تھی۔ بیشتر افراد کے پاس سر چھپانے تک کو جگہ نہیں تھی۔ اور بہت سے کیمپوں کی بدانتظامی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کیمپوں میں مصیبت اور مایوسی کا دور دورہ تھا۔ لوگوں کو طبی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ اور بیماروں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کیلئے معدودے چند افراد ہی آگے بڑھے تھے۔ ان ہی دنوں ایک صاحب محمد حسین عطا میرے مرکزی ہیڈکوارٹر سردہاب پہنچے۔ وہ ۱۹۴۲ء میں میرے ساتھ جیل میں رہ چکے تھے۔ انہوں نے مجھ سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ اور کہا کہ ہم اپنے آپ کو خدائی خدمت گار کہتے ہیں۔ ہمیں لاہور جا کر مہاجروں کا دکھ درد بٹانا چاہیئے۔ میں نے اُن سے کہا۔ کہ میں مہاجروں کی خدمت کے لیئے تیار ہوں۔ لیکن کوئی بھی مجھے خدمت کی اجازت نہیں دے گا۔ وہ ناراض ہو گئے۔ اس پر میں نے انہیں مشورہ دیا۔ کہ وہ لاہور جائیں۔ اور ہمیں مہاجروں کی خدمت کی اجازت دلا دیں۔ اگر وہ اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور اس کے بعد ہم انکار کر دیں۔ تو پھر وہ غصہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ انہوں نے میری تجویز مان لی۔ اور

لاہور روانہ ہو گئے۔ لیکن ایک ماہ بعد ناکام واپس آئے۔ اور اعتراف کیا کہ میں نے جو کچھ اُن سے کہا تھا۔ حرف بحرف درست تھا۔ مسلم لیگ اب بھی مسلمانوں میں ہمارے خلاف مہم چلا رہی تھی۔

محمد حسین عطا نے کہا لیڈروں کو یہ اندیشہ بھی ہے۔ کہ اگر ہمیں عوام کی خدمت کا موقعہ دیا گیا۔ تو ہم انہیں متاثر کر لیں گے۔ اور اس طرح ان لیڈروں نے ہمارے خلاف پروپیگنڈے کی جو مہم شروع کی ہے۔ اس پر پانی پھر جائے گا مجھے بتایا گیا۔ کہ اگرچہ کیمپوں میں کام کرنے والوں کی شدید کمی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں ہمارے لیئے کوئی گنجائش نہیں۔

وزارت بنانے کی پیش کش

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سر جارج کننگھم میرے صوبے کے پہلے گورنر بنے۔ وہ ایک منتعد اور ہوشیار برطانوی افسر تھے۔ اور اُن کا شمار مسلم لیگیوں کے قریبی معاونوں اور با اعتماد دوستوں میں کیا جاتا تھا۔ وہ آٹھ سال سے میرے صوبے کے گورنر تھے۔ اُنہوں نے چند ہفتوں تک صورت حال کا مطالعہ کیا۔ اور اس کے بعد میرے بیٹے عبدالغنی کی معرفت مجھے پیغام بھیجا۔ کہ میں مسلم لیگیوں اور خدائی خدمت گاروں پر مشتمل ایک مخلوط حکومت کے قیام پر رضامند ہو جاؤں۔ میں نے اُن سے کہا کہ مسلم لیگ اس پر کبھی آمادہ نہیں ہو گی۔ ہم خدمت اور تعمیر نو کے کام پر یقین رکھتے تھے جب کہ مسلم لیگ عوام پر حکومت کی خاطر حصول اقتدار کی خواہش مند تھی۔ سر جارج کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ میں نے گورنر کو بتایا۔ کہ اگر لیگ قومی فلاح و بہبود کے لیئے کام کرے۔ تو ہم حکومت میں شامل ہوئے بغیر اس سے تعاون کرنے کے لیئے تیار ہیں۔ لیکن ہمیں اس قسم کی خدمت کا بھی موقعہ نہیں دیا گیا۔

پختونستان

۱۹۴۸ء میں جب میں پاکستان پارلیمنٹ کے اجلاس میں پہلی بار شریک ہوا۔ تو میں نے اعلان کیا۔ کہ جو کچھ ہونا تھا وہ چکا ہے۔ پاکستان ہم سب کا مشترکہ ملک ہے۔ اگر برسر اقتدار طبقہ اس ملک کی خدمت کا خواہش مند ہے۔ تو ہم ہر مطلوبہ طریق پر اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ میں حکومت پر کسی قسم کے اخراجات کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے پیش کش کی۔ کہ اپنے اخراجات ہم خود ہی برداشت کریں گے۔ ہم ملک کی پُرخلوص خدمت کے سوا اور کسی چیز کے خواہش مند نہیں تھے۔ میری تقریر کے دوران نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے پوچھا۔ کہ پختونستان سے میرا مطلب کیا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ کہ یہ پٹھانستان نہیں بلکہ پختونستان ہے۔ اور یہ صرف ایک نام ہے۔ انہوں نے پھر دریافت کیا۔ کہ یہ نام کس قسم کا ہے؟ اس پر میں نے کہا کہ جس طرح پنجاب۔ بنگال۔ سندھ اور بلوچستان پاکستان کے صوبوں کے نام ہیں۔ اسی طرح یہ بھی پاکستان کے ڈھانچے کے اندر ایک نام ہے۔ ہمیں کمزور کرنے کے لیئے انگریزوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں ہمارے عوام کے حصے بخرے کر دیئے۔ اور ہمارے علاقے کا نام تک مٹا دیا۔ ہم اپنے پاکستانی مسلمان بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ براہ کرم وہ اس ناانصافی کا ازالہ کریں۔ جو انگریزوں نے ہمارے ساتھ کی ہے۔ پٹھانوں کو متحد کریں۔ اور ہمیں پنجاب کی طرح ایک نام دیں۔ کیونکہ جب بھی پنجاب کا نام لیا جاتا ہے تو لوگ سمجھ جاتے ہیں۔ کہ اس سے مراد وہ علاقہ ہے۔ جہاں پنجابی بستے ہیں۔ اسی طرح بنگال۔ سندھ اور بلوچستان سے ان علاقوں کا تصور ذہن میں آ جاتا ہے۔ جہاں علی الترتیب بنگالی۔ سندھی اور بلوچ آباد ہیں۔ ہم بھی صرف اسی طرح کا ایک نام پاکستان کے ان علاقوں کے لیئے چاہتے ہیں۔ جہاں پشتون رہتے ہیں۔

قائداعظم سے ملاقات

اس کے بعد مجھے قائداعظم نے ملاقات کی دعوت دی۔ اور ہم کھانے کے بعد بڑی دیر تک بات چیت میں مصروف رہے۔ میں نے اُن سے کہا "آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ ہماری تحریک معاشرتی اصلاح کی تحریک ہے۔ لیکن انگریزوں کی بدعنوانیوں کے باعث یہ ایک سیاسی تحریک بن گئی ہے۔ اب جب کہ ملک آزاد ہو چکا ہے۔ میری رائے یہ ہے۔ کہ ہماری قوم میں اس وقت تک صحیح سیاسی شعور پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ سماجی اعتبار سے پس ماندہ ہے۔ پسماندہ عوام میں جمہوریت نہیں پنپ سکتی"

قائداعظم بہت خوش ہوئے۔ اُنہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور کہا۔ کہ وہ مجھے ہر قسم کی مدد دینے کے لیئے تیار ہیں۔ ہمارے درمیان ایک سمجھوتہ ہو چکا تھا۔

سرحد میں کھلبلی

کراچی سے روانہ ہوتے وقت قائداعظم نے مجھے بتایا کہ وہ صوبۂ سرحد کے آئندہ دورے میں سرخ پوش لیڈروں سے ملاقات کریں گے۔ آپ نے اپنے لیئے سُوت کاتنے کے کچھ چرخے تیار کرنے کا بھی حکم دیا۔ اور امید ظاہر کی۔ کہ وہ چرخے بہت جلد اُن کو پہنچا دیئے جائیں گے۔ ہم دونوں قوم کی سماجی اور اقتصادی تعمیرِنو کے ایک پروگرام پر عمل درآمد کے لیئے بھی متفق ہو گئے تھے جب میں اپنے صُوبے میں پہنچا۔ تو میں نے یہ تمام چیزیں اپنے رفقائے کار کے سامنے پیش کیں۔ اور اُن سب نے میری تائید کی ہم نے اپنے مرکزی ہیڈکوارٹر میں قائداعظم کے استقبال اور اُن کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔ اور یہ طے پایا کہ اُن سے اُن کے اعلیٰ عہدے کے شایان شان سلوک کیا جائے۔ میرے صوبۂ سرحد پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد فرقہ وارانہ ذہنیت کے پرستاروں اور انگریزوں کو اس حقیقت کا علم ہو گیا۔ اور ان میں کھلبلی مچ گئی۔

وہ جاننا چاہتے تھے۔ کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ انہیں خطرہ تھا۔ کہ اگر قائداعظم اس سمجھوتے پر قائم رہے۔ جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔ تو پھر ان کے لیئے کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ اس زمانے میں میرے صوبے کی تمام کلیدی اسامیوں پر انگریز قابض تھے۔ میں نے اپنی پارلیمنٹ میں مطالبہ کیا کہ پاکستان میں گورنروں اور مختلف محکموں کے سربراہوں کے اعلےٰ عہدے انگریزوں کو نہ دیئے جائیں ——— اس بات سے مرحوم لیاقت علی خان بھی تھوڑا بہت ناراض ہوئے۔ لیکن اس سے میرے صوبے میں انگریزوں کو بہت زیادہ تشویش لاحق ہوئی ——— چنانچہ ان لیڈروں اور انگریزوں نے ایک سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔

قائداعظم کا دورۂ سرحد

اسی دوران میں سر اے۔ ڈی۔ ایف ڈنڈاس نے صوبہ سرحد کے گورنر کی حیثیت سے سر جارج کننگھم کی جگہ لے لی تھی۔ جب انہیں قائداعظم سے میرے سمجھوتے کا علم ہوا۔ تو انہوں نے خاص طور پر اپنے ایک پیغام بر کو بذریعہ طیارہ کراچی بھیجا۔ اور قائداعظم پر زور دیا۔ کہ وہ کسی حالت میں بھی خدائی خدمت گاروں کی میزبانی قبول نہ کریں۔ کیونکہ اس طرح ان خدائی خدمت گاروں کی ساکھ بڑھ جائے گی۔

چنانچہ جب قائداعظم صوبہ سرحد کے دورے پر آئے تو ہمیں ان سے ملاقات کا کوئی موقعہ نہ دیا گیا۔ مسلم لیگیوں نے آپس میں سازش کر لی۔ اور ان میں سے جو بھی قائداعظم سے ملا۔ اس نے انہیں یہی بتایا۔ کہ ہم انتہائی خطرناک لوگ ہیں۔ اور ہم نے انہیں اپنے مرکزی ہیڈ کوارٹر میں لے جا کر قتل کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔ گورنر بھی اس سازش میں شریک ہو گیا۔

ان لوگوں کی چال کامیاب رہی۔ اور قائداعظم نے ہماری دعوت قبول نہیں کی ہمیں ایک خط کے ذریعے مطلع کر دیا گیا۔ کہ قائداعظم نے کسی غیر سرکاری تقریب میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حالانکہ درحقیقت انہوں نے کئی غیر سرکاری تقاریب کے لیئے دعوت قبول کی۔ اور ان میں شریک ہوئے۔ لیکن ہماری دعوت قبول کرنے سے انکار کے باوجود وہ گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں خدائی خدمت گار لیڈروں سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔

قائداعظم سے ایک اور ملاقات

اس پر ہم سب نے اکٹھے ہو کر آپس میں صلاح و مشورہ کیا۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام خدائی خدمت گاروں کی جانب سے میں قائداعظم سے ملاقات کروں۔ چنانچہ میں اُن سے ملا اور ہم دو گھنٹے تک بات چیت کرتے رہے۔ میں نے گفتگو کے دوران میں یہ محسوس کیا کہ اُن کے ساتھیوں نے اُن کے ذہن کو مسموم کر رکھا ہے۔ میں نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ اگر میں مسلمان ہوں۔ تو میری تمام قوت ان کی اپنی قوت ہے۔ اور چونکہ وہ مسلمان ہیں۔ اس لیئے میں اُن کی تمام قوت کو اپنے لیئے طاقت کا سرچشمہ تصور کرتا ہوں۔ اس پر انہوں نے مجھ سے مسلم لیگ میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ اور آیا وہ مجھے کام کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ یا اس بات کے خواہش مند ہیں۔ کہ میں بھی مسلم لیگ کی طرح بے رُوح ہو جاؤں۔ مسلم لیگی لیڈروں کی اکثریت "خانوں" اور "اربابوں" پر مشتمل ہے۔ اور اور انہوں نے قوم کی کبھی کوئی خدمت نہیں کی۔ یہ لوگ ہمیشہ انگریزوں کے چاپلوس اور حلیف رہے ہیں۔ قائداعظم نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ میں نے اُن سے کہا۔ کہ ان کے گرد و پیش جو لوگ جمع ہیں۔ وہ اتنے خود غرض ہیں۔ کہ جہاں کہیں بھی ان کا اپنا مفاد وابستہ ہوتا ہے وہ ان (قائداعظم) کے حکم کی پرواہ نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ ان کے لیڈر ہی نہیں۔ بلکہ

گورنر جنرل بھی ہیں۔ قائدِ اعظم نے مجھ سے اس کا ثبوت طلب کیا۔

متروکہ املاک کی لُوٹ

میں نے انہیں بتایا۔ کہ ہندو یہاں کروڑوں روپے کی جائدادیں چھوڑ گئے تھے۔ یہ جائدادیں مسلم لیگیوں نے لُوٹ لی ہیں۔ یہ جائدادیں پاکستان کی ملکیت ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ لیڈر ایک پائی بھی حکومت کے حوالے کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے قائدِ اعظم کو دعوت دی۔ کہ وہ مجھے کسی ایک اہم لیڈر کا نام بتائیں۔ جس نے لُوٹ میں حصّہ نہ لیا ہو۔

پارٹی کی قرارداد

قائدِ اعظم کے مزید اصرار پر میں اس بات پر رضامند ہوگیا۔ کہ تمام امور اپنے دوستوں کے سامنے پیش کروں گا۔

اس کے بعد میری پارٹی نے اپنے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ ہم جمہوریت پسند ہیں۔ اور ہم نے آزادی اور جمہوریت کے لیئے جدوجہد کی ہے۔ ہم کسی اور پارٹی کی ہدایت پر اپنی پارٹی توڑنے کے لیئے رضامند نہیں ہو سکتے۔

کہا جاتا ہے۔ کہ صوبہ سرحد سے روانگی کے وقت قائدِ اعظم نے خان عبدالقیوم خان اور سر اے۔ ڈی۔ ایف ڈنڈاس کو صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے اور ہماری تحریک کو کچلنے کے لیئے مکمل اختیارات دے دیئے تھے۔

سزا

کافی عرصے سے میں کوہاٹ اور بنوں نہیں گیا تھا۔ اور لوگوں کی خواہش تھی۔ کہ میں اس علاقے کا دورہ کروں۔ چنانچہ ۵ار جون ۱۹۴۸ء کو میں ناجو اور منیر خان سالاروں کے ہمراہ بنوں روانہ ہوا۔ بہادر خیل پہنچنے پر ہم نے دیکھا کہ پولیس نے سڑک روک رکھی ہے۔ مجھے اور میرے دوسرے ساتھیوں سے کہا گیا۔ کہ ہم اپنی کار سے نیچے اُتر آئیں۔ اس کے بعد ہمیں تیری تحصیل لے جایا گیا۔ جہاں تمام دن کھانا دیا گیا۔ نہ پانی۔ شام کو ڈپٹی کمشنر کوہاٹ

وہاں پہنچے۔ مجھے اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُنہوں نے چھوٹتے ہی مجھ سے ضمانت پیش کرنے کو کہا۔ میں نے دریافت کیا۔ کہ وہ کس قسم کی ضمانت چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ کہ میں پاکستان کے خلاف ہوں۔ جب میں نے اس کا ثبوت مانگا۔ تو وہ کہنے لگے۔ کہ بحث کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ضمانت پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اور مجھے تین سال قید بامشقت کی سزا دی مجھے اپنے منتظر دوستوں سے ملنے یا اپنی ضروری اشیاء لینے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ اور منٹگمری جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں میں نے اپنی سزا کے دن کاٹے مجھے سزا میں وہ معافی بھی نہیں دی گئی۔ جو جیل کی طرف سے ملا کرتی ہے۔ اور جب میں پوری سزا بھگت چکا۔ تو ۱۸۱۸ء کے بنگال ریگولیشن کے تحت مجھے پھر نظر بند کر دیا گیا۔ اور اس طرح جنوری ۱۹۵۴ء سے پہلے مجھے رہائی نصیب نہیں ہوئی۔

مسئلہ کشمیر

کشمیر کے سلسلے میں میں نے دو بار اپنی خدمات پیش کیں۔ پہلی بار قائداعظم کی زندگی میں اور دوسری دفعہ اُن کی موت کے بعد۔ لیکن دونوں مواقع پر میری پیش کش قبول نہیں کی گئی۔ برسراقتدار گروہ کا خیال تھا۔ کہ اگر کشمیر کا مسئلہ ہمارے ذریعے طے کرایا گیا۔ تو مسلمان عوام کے دلوں میں ہمارے متعلق اچھے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔ اور ہم ان کے وقار کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ مرحوم نواب زادہ لیاقت علی خان نے ہمارے دو ارکان اسمبلی سے کہا کہ قائداعظم کی وفات کے بعد وہ کوئی ایسا قائد نہیں چاہتے۔ جو عوام کے ذہنوں پر قبضہ کر لے۔ ایک اور موقعہ پر نواب ممدوٹ منٹگمری جیل میں مجھ سے ملنے آئے۔ ہم نے دوسرے امور کے علاوہ مسئلہ کشمیر پر بھی بات چیت کی۔ میں نے انہیں بعض تجاویز پیش کیں۔ نوائے وقت کے مسٹر حمید نظامی بھی اس بات چیت کے دوران میں موجود تھے۔ اس وقت مجھے یہ یقین دلایا گیا۔ کہ حکومت میری تجاویز پر ہمدردانہ غور کرے گی۔ لیکن بعد میں کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اگر حکومت

میری تجاویز مان لیتی۔ تو یہ مسئلہ بہت پہلے حل ہو جاتا۔ میرا تاثر یہ تھا۔ کہ بڑے لوگ درحقیقت کشمیر کے بارے میں مشوش نہیں ہیں۔ بلکہ انہیں اپنی کرسیوں کے بارے میں زیادہ تشویش لاحق ہے۔

ناانصافی کا اعتراف

سنہ ۱۹۵۳ء میں جب کہ میں ابھی جیل ہی میں تھا۔ مسٹر سردار بہادر خان راولپنڈی جیل میں مجھ سے ملنے آئے۔ بات چیت کے دوران میں انہوں نے اعتراف کیا۔ کہ حکومت نے غیر منصفانہ طور پر ہمارے ساتھ سختی برتی ہے۔ اور صوبہ سرحد میں مسٹر عبدالقیوم خان کی حکومت نے ظلم و تشدد سے کام لیا ہے۔ کوئی بھی باعزت حکومت اس صورت حال کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتی۔ نہ اسے جائز قرار دے سکتی ہے۔ انہوں (سردار بہادر خان) نے کہا کہ مرکزی حکومت میری نظر بندی کو جائز تصور نہیں کرتی۔ اور مجھے رہا کرنے کی خواہش مند ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے اندیشہ ہے کہ ہم اس ظلم کو کبھی معاف یا فراموش نہیں کریں گے۔ جو ہم پر روا رکھا گیا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ خدائی خدمت گار عدم تشدد پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں سے کبھی انتقام لینے کی کوشش نہیں کرتے۔ میں نے اُن کی اس بات پر حیرت ظاہر کی۔ کہ حکومت اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے بھی انصاف کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ میں نے سردار بہادر خان پر واضح کر دیا۔ کہ جب تک حکومت میرے اور ہماری تحریک کے بارے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہو جاتی۔ اُس وقت تک مجھے اپنی رہائی کی کوئی فکر نہیں ہے۔ بعد میں وہ مجھ سے پھر ملنے آئے اور بتایا کہ حکومت نے مجھے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

رہائی

سنہ ۱۹۵۴ء میں جیل سے رہائی کے بعد مجھے سرکٹ ہاؤس راولپنڈی میں نظر بند کر دیا گیا۔ میں سرکٹ ہاؤس کی نظر بندی پر جیل کی نظر بندی کو ترجیح دیتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ غالباً میرے بیٹے بھی ارباب عبدالغفور کی طرح کوئی جال بچھایا گیا ہے۔ انہیں پیرول پر جیل سے باہر

جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اور عوام میں غلط طور پر مشہور کر دیا گیا کہ وہ افغان ایجنٹوں سے ساز باز کر رہے تھے۔

بعد میں مجھے پنجاب میں نقل و حرکت کی اجازت دی گئی۔ اور پھر کراچی میں دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کا موقع ملا۔

ون یونٹ

ان دنوں کراچی میں "ون یونٹ سکیم" موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔ اس نازک مرحلہ پر میرے پنجابی بھائیوں کو اس سوال پر بنگالی بھائیوں سے رنج و شکایت تھی۔

اس اجلاس کے دوران میں چودھری محمد علی، مسٹر مشتاق احمد گورمانی، سردار بہادر خان اور ملک فیروز خان نون (جو اس وقت پنجاب کے وزیر اعلےٰ تھے) نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھے "ون یونٹ" کی خوبیوں کا قائل کرنے کی کوشش کی۔ سندھ، بلوچستان اور سرحد کے عوام سے بات چیت کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا تھا۔ کہ عوام اس اقدام کے لیے تیار۔ اور رضامند نہیں۔ اور طاقت کے بل پر "ون یونٹ" کا قیام پاکستان کے لیے مفید نہیں رہے گا۔ میں نے ان اصحاب کو بتایا کہ اس نازک مرحلہ پر "ون یونٹ" مفید ثابت نہیں ہو گا۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ اگر وہ اس معاملے میں واقعی بڑی سنجیدگی سے کام لے رہے ہیں۔ تو انہیں مغربی پاکستان میں دو یونٹ قائم کر دینے چاہئیں۔ ان میں سے ایک یونٹ تو پنجاب کا ہو۔ اور دوسرا چھوٹے صوبوں پر مشتمل ہو۔ چودھری محمد علی نے جو اس وقت وزیر اعظم ہیں۔ کہا کہ یا تو "ون یونٹ" قائم ہو گا۔ یا موجودہ صورت حال برقرار رہے گی۔ اس طرح ہماری ملاقات ملتوی ہو گئی۔ ادھر سیاسی معاملات زیر بحث تھے۔ اور دوسری طرف حکومت سے مصالحت کے لیے گورنر جنرل نے ڈاکٹر خان صاحب سے بات چیت شروع کر رکھی تھی۔ مسٹر غلام محمد نے اس امر سے اتفاق کیا کہ حکومت نے خدائی خدمت گاروں سے سخت ناانصافی کی ہے اور ان کے لیے اس سلوک کو کبھی فراموش کرنا بڑا مشکل ہو گا۔ انہوں نے ہمیں یہ مشورہ دیا کہ ہم یہ

تنظیم توڑ کر ایک نئی پارٹی بنا لیں۔ ہم نے انہیں بتایا۔ کہ یہ کوئی صحیح حل نہیں ہے۔ اور خدائی خدمت گاروں سے ہی نہیں ساری پختون قوم (COMMUNITY) سے ناانصافی ہوئی ہے اس کے باوجود میں نے حکومت کو یقین دلایا۔ کہ ہم ان لوگوں کو معاف کر دیں گے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ انہیں معاف بھی کر چکے ہیں جنہوں نے ہم سے ناانصافی کی۔ اور ہم پر مظالم روا رکھے لہٰذا اب یہ کام حکومت کا ہے۔ کہ وہ محبت سے لوگوں کے دل مسخر کرے۔ اور ان پر اعتماد کرے ڈاکٹر خان صاحب کو یہ مشورہ دیا گیا۔ کہ وہ حکام کو بتائیں۔ کہ ہم حکومت کی طرف سے عوام پر اظہار اعتماد کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

دوسرے ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ کہ آیا حکومت اس ملک میں ہمیں برابر کے ساتھی خیال کرتی ہے۔ یا وہ ہمیں ایسی ادنیٰ حیثیت دیتی ہے۔ کہ ہم ہمیشہ دوسروں کے محکوم ہی رہیں۔ تیسرے ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ کہ آیا ارباب اختیار ہمیں اپنا مسلمان بھائی بھی تصور کرتے ہیں یا نہیں۔ ڈاکٹر خان صاحب نے گورنر جنرل کو مشورہ دیا۔ کہ وہ مجھ سے براہ راست گفتگو کریں۔ لیکن گورنر جنرل کو دوسرے لوگوں نے اس طریق کار کے برعکس مشورہ دیا۔ ابھی یہ سیاسی اور آئینی مذاکرات جاری ہی تھے۔ کہ پارلیمنٹ میں بنگالی اور پنجابی سیاست دانوں میں اس مسئلہ پر اختلافات پیدا ہو گئے۔ کہ آیا آئین کی منظوری اور پاکستان کے جمہوریہ ہونے کے اعلان کے بعد مسٹر غلام محمد صدر ہوں گے؟ بنگالیوں نے کہا۔ کہ اس کا فیصلہ مناسب وقت آنے پر پارلیمنٹ میں دونوں سے کیا جائے گا۔ جب سیاست دانوں کے دو گروہوں میں یہ اختلاف دوبارہ منظر عام پر آیا۔ تو بنگالی ارکان پارلیمنٹ نے "ون یونٹ" کے منصوبہ کی تائید و حمایت سے دست کش ہو جانے کی دھمکی دی۔

علاقائی فیڈریشن

اس مرحلہ پر پارلیمنٹ کے ذریعہ "ون یونٹ" کے منصوبہ کو منظور کرانے کی ساری امیدیں ختم کر دینی پڑیں۔ اور علاقائی فیڈریشن کی متبادل سکیم پیش کر دی گئی۔ سردار بہادر خان کی کوٹھی پر ایک اجلاس ہوا۔ جس میں سردار اسد جان، سردار عبدالرب نشتر، سردار بہادر خان اور میں نے شرکت کی۔ طویل بحث کے بعد میں نے اس شرط پر علاقائی فیڈریشن کی نئی سکیم منظور کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ کہ انگریزوں نے جن پختون علاقوں کو تقسیم کر دیا تھا۔ وہ سب علاقے "ایک وحدت" میں مدغم کر دیئے جائیں۔ اور ان کا ایک مناسب نام رکھا جائے۔ متحدہ ہندوستان میں انگریز، مرہٹوں اور پٹھانوں کو دو اہم اور خطرناک فوجی نسلیں خیال کرتے تھے۔ لہذا انہیں کمزور بنانے کے لیئے انگریزوں نے انہیں کئی حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اب ہندوستان میں تمام مرہٹوں کو متحد کر دیا گیا ہے۔ اور اس امر کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ پاکستان جو ایک اسلامی جمہوریہ ہونے کا داعی ہے پٹھانوں کو ایک صوبہ میں متحد کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے۔ کہ پٹھان علاقوں کو متحد کر دیا جائے۔ اور ہم یہ مکمل یقین دلاتے ہیں کہ ہم سچے پاکستانی اور دوسرے سب پاکستانیوں کے بھائی ہیں۔ اس کے باوجود بعض اخبارات اور لیڈر ہمیں غدار قرار دینے پر مصر ہیں۔ ہم پٹھان مختلف علاقوں میں منتشر ہیں۔ اور ہمارے مختلف علاقوں میں باہمی میل جول اور نقل و حرکت کی آزادی پر پابندیاں عائد ہیں۔ ہم اس طرز عمل کو ناپسند کرتے ہوئے یہ دعوے کرتے ہیں۔ کہ غیر متحد پختونوں کی بنیادوں پر ایک مضبوط پاکستان قائم نہیں ہو سکتا۔ پختونوں سے انصاف کرنے کی صورت میں ہی پاکستان کے استحکام کی ضمانت مل سکتی ہے اور اس طرح پاکستان کی عظمت کا ثبوت فراہم ہوگا۔

پارلیمنٹ علاقائی فیڈریشن کی سکیم بھی منظور نہ کر سکی۔ کیونکہ ہمارے بنگالی بھائیوں نے اس کی حمایت نہ کی۔ چنانچہ پارلیمنٹ کے پنجابی لیڈروں کو کسی دوسرے منصوبہ پر غور کرنا پڑا۔ اس وقت

تک سارے آئین کے متعلق اتفاق ہو چکا تھا۔ صرف مغربی پاکستان کی صوبائی ہیئت طے ہونا باقی تھی۔ اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر محمد علی بوگرہ کو امریکہ جانا پڑا۔ اور اپنی روانگی سے قبل انہوں نے یہ اعلان کیا۔ کہ ان کے واپس آتے ہی سارا آئین مکمل ہو جائے گا۔ اور سال ختم ہونے سے پہلے پہلے پاکستان کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کر دیا جائے گا۔ لیکن جب وزیر اعظم واپس آئے۔ تو پارلیمنٹ توڑ دی گئی۔ اور سارا ملک ایک اضطراب کی کیفیت میں مبتلا کر دیا گیا

نئی وزارت

جب نئی وزارت قائم ہوئی تو ڈاکٹر خان صاحب کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ میں کابینہ میں ڈاکٹر خان صاحب کی شرکت کا حامی نہیں تھا۔ میرا خیال یہ تھا۔ کہ وہ کابینہ میں شامل ہو کر ملک کے لیے کوئی کام نہیں کر سکیں گے۔ لیکن ان کی رائے یہ تھی۔ کہ وہ دوسروں کو ملک کی خدمت پر آمادہ کر سکیں گے۔ اور ناکامی کی صورت میں مستعفی ہو جائیں گے۔ "ون یونٹ سکیم" دوبارہ پیش کی گئی۔ تو مجھے سردار بہادر خان کے مکان پر ایک اجلاس میں مدعو کیا گیا۔ میرے علاوہ ڈاکٹر خان صاحب، میجر جنرل سکندر مرزا اور سردار عبدالرشید خان (جو اس وقت صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے) نے اس بات چیت میں حصہ لیا۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ وہ قوت کے بل پر "ون یونٹ سکیم" کے معاملے میں جلد بازی سے کام نہ لیں اور لوگوں کی رائے معلوم کر لیں۔ کہ انہیں یہ سکیم منظور بھی ہے یا نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ طے پایا تھا۔ کہ "ون یونٹ سکیم" نافذ کرنے سے پہلے لوگوں کا مشورہ حاصل کیا جائے گا۔ میں مرزا صاحب کے ہمراہ اجلاس سے باہر آیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے تعاون کی ضرورت ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگر وہ اور دوسرے ارباب اختیار اسے منظور کر لیں۔ تو میں بھی تعاون کے لیے تیار ہوں۔

میں کراچی سے پنجاب واپس آ گیا۔ کیونکہ میری نقل و حرکت اس صوبہ میں محدود تھی۔ میں نے ضلع کیمبل پور کے گاؤں حضرو میں سکونت اختیار کر لی۔ صوبہ سرحد کے لوگ اس گاؤں میں آیا کرتے

تھے۔ وہ ہماری تنظیم اس کے اخبار اور مجھ پر عائد کردہ پابندیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ عام ذریعوں سے حصول انصاف کی توقع میں مایوسی کے بعد بعض لوگ سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں مشورہ دیا۔ کہ خدائی خدمت گار ہونے کی حیثیت سے ہمیں یہ سب کچھ برداشت کرنا چاہیئے۔ اور کچھ عرصہ اور صبر سے کام لینا چاہیئے۔ دریں اثنائی پارلیمنٹ قائم ہو گئی۔ اور اس کا پہلا اجلاس مری میں طلب کر لیا گیا۔

نئی پارلیمنٹ کا اجلاس

۱۹۵۵ء کی گرمیوں میں نئی پارلیمنٹ کے مری سیشن میں پنجاب اور بنگال کے سیاستدانوں میں کچھ اختلافات پیدا ہو گئے۔ صوبہ سرحد میں میرے داخلہ پر پابندی عائد تھی۔ اور مسٹر دولتانہ نے جو خفیہ دستاویز تقسیم کی۔ اس میں بتایا گیا تھا۔ کہ اگر میرے ساتھ کوئی سمجھوتہ کیا گیا۔ تو ون یونٹ پلان کے نفاذ کے امکانات خطرہ میں پڑ جائیں گے۔ لیکن پارلیمنٹ کے مری سیشن کے دوران میں مجھے انتہائی ڈرامائی حالات میں سرحد میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

مری سے روانہ ہونے سے قبل مری کے گورنمنٹ ہاؤس میں وزراء سے میری ایک اور ملاقات ہوئی۔ مسٹر گرمانی نے میرے سامنے "ون یونٹ" کے منصوبہ کی وضاحت کی۔ اور میں نے انہیں بتایا۔ کہ میرے نزدیک اس سکیم کے نفاذ کا کوئی جواز موجود نہیں۔ مسٹر گرمانی نے سارے مغربی پاکستان میں آبی کنٹرول، بجلی، کانوں، ٹرانسپورٹ اور بڑی صنعتوں کے لیئے مشترکہ انتظامات کی ضرورت پر زور دیا۔ میں نے یہ دلیل پیش کی۔ کہ مغربی پاکستان کے لیئے علاقائی فیڈریشن کی سکیم سے بھی بوجوہ احسن یہ تمام مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ میں نے دعوے کیا۔ کہ "ون یونٹ" کا منصوبہ پاکستان کے قومی مفادات کے لیئے مضرت رساں ہے۔ صوبائی جذبات کا احترام کرنا چاہیئے۔ اور مختلف ثقافتوں کا تحفظ ہونا چاہیئے میں نے یہ بھی کہا۔ کہ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے عوام سیاسی اعتبار سے سرحدی عوام کے مقابلہ

میں کم ترقی یافتہ ہیں۔ میری رائے یہ تھی۔ کہ اگر صوبہ سرحد کے سوا مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں میں دیانت دارانہ انتخابات ہوئے تو بھی ان صوبوں میں رجعت پسند جاگیردار اسمبلی کے رُکن منتخب ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس صوبہ سرحد میں جاگیرداروں کی طاقت کافی کمزور ہو چکی ہے۔ اور زیادہ ترقی پسند لوگ منتخب ہوں گے۔ میں نے زور دیا کہ سارے مغربی پاکستان کے لیئے کوئی اسمبلی قائم کی گئی۔ تو یہ صوبہ سرحد کی مناسب طور پر منتخب ہونے والی کسی اسمبلی سے زیادہ رجعت پسندانہ ہوگی۔ اس طرح پٹھان علاقوں کے لیئے "ون یونٹ" کا منصوبہ ان پر رجعت پسند عناصر کو مسلط کر دے گا چنانچہ میں نے تجویز پیش کی کہ پنجاب میں وسیع اور سرگرم سیاسی کام ہونا چاہیئے۔

دیہی ترقی کی سکیم

جب میں نے "ون یونٹ" کے منصوبہ سے اتفاق نہ کیا۔ اور ملک میں وسیع پیمانہ پر سیاسی کام کی ضرورت پر زور دیا۔ تو چودھری محمد علی نے (جو اس وقت وزیر خزانہ تھے) دیہی ترقی کے متعلق اپنی سکیم کی وضاحت کی۔ اور مجھے اس کا انتظام سنبھالنے کی دعوت دی۔ میں نے اس شرط پہ ایسا کرنا منظور کیا کہ "ون یونٹ" کا مسئلہ مناسب طریقہ سے طے کیا جائے گا۔ مسٹر سہروردی نے بھی دیہی ترقی کی اہمیت پر زور دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا۔ کہ حکومت کی امداد اور سرمایہ کے بغیر کوئی نمایاں کام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہم "ون یونٹ" کے منصوبہ کے سلسلہ میں کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر منتشر ہو گئے۔

جب میں صوبہ سرحد واپس آیا۔ ("ون یونٹ" کا منصوبہ ابھی زیر غور ہی تھا) تو جنرل سکندر مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب دونوں اس صوبہ کے دورے پر آئے۔ ہم سب خان قربان علی خان کے مہمان تھے۔ اور جنرل مرزا نے مجھے دیہی ترقی کے اس منصوبہ کی تفصیلات دکھائیں جس کے متعلق چودھری محمد علی مری میں مجھ سے گفتگو کر چکے تھے۔ انہوں نے مجھے اس کا انتظام سنبھالنے کی دعوت دی۔ میں نے جواب دیا کہ جب تک ہمارے اطمینان کے مطابق "ون یونٹ" کا مسئلہ طے نہیں ہو

جانا۔ مجھے دیہی ترقی کے لیئے سرکاری سکیم کا انچارج بننا منظور نہیں۔ اس پر جنرل مرزا نے مجھے بتایا۔ کہ "ون یونٹ" سکیم اب پاکستان کے لیئے بین الاقوامی وقار کا سوال بن گئی ہے۔ اگر اس مرحلہ پر پاکستان اس سکیم سے دست بردار ہوگیا۔ تو اس کا وقار ختم ہو جائے گا۔ اور افغانستان کے وقار میں اضافہ ہوگا۔ میں نے اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ اور بتایا کہ "ون یونٹ" قائم ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ پاکستان کی داخلی سیاسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں افغان جو کچھ خیال کرتے ہیں۔ اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہونی چاہیئے۔ میں نے یہ دلیل پیش کی۔ کہ اگر پاکستان میں پٹھان خوش اور متحد ہوں گے۔ تو پاکستان اور مضبوط و مسرور ہو جائے گا۔ نیز اگر پاکستان کے پختون علاقوں کے حالات عوام کے اطمینانِ قلب اور جمہوری خواہشات کے مطابق سدھارے گئے۔ تو اس سوال پر پاکستان کے خلاف سارا غیر ملکی پروپیگنڈا بیکار ثابت ہوگا۔

میں نے جنرل مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب پر اعتراض کیا۔ کہ انہوں نے خود تو "ون یونٹ" کے منصوبہ کی حمایت میں سرگرم پروپیگنڈا جاری کر رکھا ہے۔ لیکن ہمیں یہ آزادی حاصل نہیں۔ حالانکہ پاکستان ایک جمہوری ملک ہے۔ ان دونوں نے اس سلسلہ میں میری شکایت کی معقولیت تسلیم کی اور یہ اعتراف کیا۔ کہ مجھے بھی عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا حق حاصل ہے اس طرح ان دونوں کی منظوری اور تائید حاصل کرنے کے بعد میں نے عوام کو سیاسی تربیت دینے کے لیئے اپنا دورہ شروع کیا۔ تاکہ مناسب جمہوری طریقوں سے صحیح فیصلے ہو سکیں۔

جناب والا! اگر میں حکومت کے خلاف نفرت ہی پھیلانا چاہتا۔ تو ہمارے عوام پر جو مظالم کیئے گئے۔ ان کے پیش نظر بغاوت کے لیئے خاصا مواد موجود تھا۔ اس کی بجائے میں نے ہمیشہ عدم تشدد کے فلسفہ کا پرچار کیا ہے۔ اور یہ اعلان کرتا رہا ہوں۔ کہ ہم نے ان لوگوں کو بھی معاف کر دیا۔ جنہوں نے ہم سے ناانصافی کی۔ اور ہماری اس طرح توہین کی۔ کہ عام حالات

میں کوئی پٹھان اسے نہیں بھول سکتا۔ اور نہ ہی معاف کر سکتا ہے۔

ہم پنجابیوں کو اپنے مسلمان اور پاکستانی بھائی سمجھتے ہیں۔ اور ان سے یہی سلوک روا رکھتے ہیں۔ ہم بنگالیوں۔ سندھیوں اور بلوچیوں کے بارے میں بھی بالکل یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ اگر ہم میں سے کسی نے کسی غلط سیاسی فیصلہ کی رُو سے مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں رہنے والوں سے ناانصافی کی تھی۔ تو میں اہلِ پنجاب کے خلاف کبھی نفرت نہیں پھیلا سکتا تھا۔ میں تو ان چند افراد سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ جو صوبہ سرحد کی صوبائی خود مختاری کی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ میرے لیئے اہلِ پنجاب سے نفرت کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں۔ اور نہ ہی میں اُن سے نفرت کر سکتا تھا۔ انہوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ہم پر "ون یونٹ" مسلط کرنے کے سلسلہ میں اہلِ پنجاب پر کوئی جمہوری ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی۔ اس کے متعلق تو ان سے کبھی مشورہ تک نہیں کیا گیا۔

میں ہمیشہ ایک پکا مسلمان اور محبِ وطن رہا ہوں۔ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے۔ میں نے ہمیشہ پاکستان کی خدمت اور اس کے استحکام کی کوشش کی ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر پاکستان میں رہنے والے پختونوں کو متحد کر دیا جائے۔ تو پاکستان اور مضبوط ہو جائے گا۔ پختونستان کے نام کو بھی بالکل وہی اہمیت حاصل ہے۔ جو پنجاب۔ بنگال۔ سندھ اور بلوچستان کے ناموں کی ہے۔ یہ پاکستان کے بعض علاقوں کے نام ہیں۔ جہاں بعض پاکستانی مقیم ہیں۔ میرا ایمان ہے۔ کہ پاکستان کی عظمت کا راز اس میں مضمر ہے۔ کہ پختونوں کے ساتھ اس بے انصافی کو ختم کیا جائے جو انگریزوں نے اپنی پالیسی کی مصلحتوں کے پیش نظر کی تھی۔ اور جس کے مطابق انہوں نے پختونوں کو ٹکڑوں میں منتشر کر دیا تھا۔

اپنی پوزیشن اور سیاسی موقف کی وضاحت کے بعد میں سارا معاملہ جناب والا پر چھوڑتا

ہوں۔ میں نے "ون یونٹ" کے خلاف تقریریں کرتے ہوئے وہی کچھ کیا۔ جسے میں ایک اسلامی جمہوریت کے دعوے دار ملک میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے اپنا فرض اور حق تصور کرتا تھا کوئی چیز مجھے یہ دعوےٰ کرنے سے نہیں روک سکتی۔ کہ انگریزوں نے پختونوں سے جو ناانصافی کی تھی۔ اب اس کا ازالہ کیا جائے۔ اگر جناب والا اس نتیجہ پر پہنچیں کہ میں نے مملکت کے احکام کے برعکس اپنے عوام اور ملک کو نقصان پہنچایا ہے۔ تو میں بخوشی اور کسی سے نفرت کیے بغیر وہ سزا بھگتوں گا۔ جو تقاضائے انصاف کی رو سے میرے لیے تجویز کی جائے گی۔

دستخط

(عبدالغفار خان)

آخری بار گرفتاری اور رہائی ۵۷ - ۱۹۵۶ء

باچا خان اینٹی یونٹ فرنٹ پر پورے زور شور سے کام کر رہے تھے۔ برسراقتدار گروہ انہیں رہا کر کے اور پھر سرحد میں داخلے کی اجازت دے کر ناخوش تھا۔ ان کی سرگرمیاں اسے بُری طرح کھٹک رہی تھیں۔ - - - - - - - - لیکن اب ملک کا آئین بن چکا تھا۔ اور پہلی سی دھاندلی نہیں چل سکتی تھی۔ اب آئین کی رُو سے کسی شخص کو اس کا جرم بتائے اور ثابت کئے بغیر زیادہ دنوں قید و بند میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

دن گذرتے گئے۔ باچا خان کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں۔ برسراقتدار گروہ انہیں ہاتھ ڈالنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ آخر جون ۱۹۵۶ء میں باچا خان کو ان کے اپنے حقیقی بھائی ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلےٰ مغربی پاکستان کے ہاتھوں گرفتار کرایا گیا۔ وہ چھ سات مہینے لاہور جیل میں رہے۔ ان کے خلاف ارمڑ پایان۔ نواں کلی اور گمبٹ میں تقریریں کرنے پر تعزیرات پاکستان کی دفعات ۱۲۳۔ الف، ۱۲۴۔ الف، اور ۱۵۳۔ الف کے تحت حکومت کے خلاف بغاوت اور پاکستانی باشندوں میں نفرت پھیلانے کے الزام میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب شبیر احمد کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ جہاں سے آپ کو ۲۴ جنوری ۱۹۵۷ء کو فاضل جج نے تابرخاست عدالت سزائے قید اور ۱۴ ہزار روپے جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا۔

انہوں نے رہا ہوتے ہی اخباری نمائندوں سے کہا "میں بیمار ہوں۔ نہ تو مجھ میں جلسے جلوسوں اور تقریریں کرنے کی سکت ہے۔ اور نہ میں نام و نمود اور نمائش کا قائل ہوں۔ اس لیے کسی کو اطلاع دیئے بغیر چپکے سے صبح اپنے گاؤں چلا جاؤں گا۔ تاکہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔ اور آرام سے وہیں بھی پہنچ جاؤں۔ و لی ان سب لوگوں سے کہہ دو کہ واپس چلے جائیں۔ اور جا کر لوگوں سے کہہ دیں کہ صحت اچھی ہو جائے تو میں خود ان کے پاس جا کر ان کے ساتھ

بات چیت کروں گا۔"

باچا خان نے اپنے بیٹے اور معتقدین کو لاہور ہی میں یہ کڑی ہدایت کر دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ۲۵ جنوری ۱۹۵۶ء کو ۱۲ بجے دن جب اچانک آپ کی کار اٹک پل کو عبور کرنے لگی۔ تو آپ کے معتقدین کی کاریں پہلے ہی سے آپ کے استقبال کو وہاں موجود تھیں۔ اور جب آپ اٹک سے لے کر پشاور تک پچاس میل کی مسافت طے کر رہے تھے۔ تو ہر گاؤں قصبے بلکہ چپہ چپہ پر ہزاروں پشتون آپ کے استقبال کے لیئے پھولوں کے ہار لیئے کھڑے تھے۔ یہ پچاس میل کا راستہ پورے آٹھ گھنٹوں میں طے کرنا پڑا۔ کیونکہ اٹک۔ جہانگیرہ۔ اکوڑہ خٹک۔ نوشہرہ۔ پبی۔ تاروجبہ۔ چمکنی اور رحمان پورہ میں استقبال کرنے والوں نے آپ کو روکا۔ اور ہزاروں عوام آپ کو ایک نظر دیکھنے کے اتنے مشتاق تھے۔ کہ ان کے مجبور کرنے پر ڈرائیور کو موٹر بالکل رینگنے کے انداز میں چلانا پڑی باچا خان اپنے عزیز سرانجام خان کی کیڈلاک کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور موٹروں کا ایک لمبا قافلہ آپ کی کار کے پیچھے تھا۔ آپ صبح چھ بجے لاہور سے بذریعہ کار روانہ ہوئے اور پورے چھ بجے پشاور پہنچے۔ جہاں توقف کیئے بغیر اپنے گاؤں روانہ ہو گئے۔

پشاور میں آپ کی آمد کی خبر سنتے ہی لوگ جوق در جوق جمع ہونے لگے۔ اور چشم زدن میں ہزاروں عوام آپ کے استقبال کے لیئے شہر سے دو میل باہر نکل گئے۔ جب آپ کی کار پہنچی۔ تو جی۔ ٹی ورکشاپ سے باقاعدہ جلوس شروع ہوا۔ جسے کابلی دروازہ کے باہر پہنچ کر ختم کر دیا گیا۔

قصہ خوانی بازار میں باچا خان کا جلوس پہنچا۔ تو یادگار شہیداں کے مقام پر عوام کے تقاضے پر باچا خان نے ایک نہایت مختصر سی تقریر کی۔

آپ نے کہا پشتون قوم جب تک آپس کی دشمنیاں اور منافق ترک نہیں کرے گی۔ اس وقت تک وہ آباد نہیں ہو سکتی۔ آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اب وہ دن نہیں رہے۔ جب اس ملک پر فرنگی کی حکومت تھی۔ اب یہ ملک تمہارا ہے۔ یہ ایک اسلامی جمہوریہ ہے۔ یہ صرف میں نہیں کہتا۔ وہ لوگ بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔ جو آج برسر اقتدار ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ جمہوری حکومتوں میں اقتدار اعلےٰ عوام ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے عوام جسے چاہیں کرسی پر بٹھا دیتے ہیں۔ اور جسے چاہیں محروم کر دیتے ہیں۔ ان معنوں میں ہماری حکومت اس وقت نہ تو جمہوری ہے۔ اور نہ ہی اسلامی ہے۔

آخر میں آپ نے لوگوں سے کہا۔ کہ حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ جلد از جلد ملک میں آزادانہ انتخابات کرائے۔

اس دفعہ آپ جیل سے آئے تو آپ کی صحت بہت گر چکی تھی۔ انہوں نے بتایا۔ کہ انہیں جن کوٹھڑیوں میں رکھا گیا۔ وہ سنہ ۱۹۳۰ء سے بند پڑی تھیں۔ اور وہاں کسی فرد بشر نے قدم نہیں دھرا تھا۔ یہ کوٹھڑیاں قبرستان کے ایک حصے میں بنائی گئی تھیں۔ اور لوگوں میں مشہور تھا۔ کہ وہاں جنوں کا سایہ ہے۔ باچا خان نے بتایا کہ انہیں وہاں بالکل تن تنہا رکھا گیا۔ خوراک بے حد ناقص ملتی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو گئی۔ اور وہاں شدید طور پر بیمار ہو گئے۔ انہیں سر دردی کا مستقل عارضہ ہو گیا۔ ہاضمہ بے کار ہو گیا۔ اور بے خوابی کی شکایت نے جسم کے سارے نظام کو بگاڑ دیا۔ اخبارات میں واویلا مچا تو آپ کو ہسپتال بھجوایا گیا۔ اور ایک عرصہ کے علاج معالجہ کے بعد ذرا حالت سنبھلی۔ رہا ہونے کے بعد بھی ابھی تک آپ کی صحت بحال نہیں ہو سکی۔ اور بدستور زیر علاج ہیں۔

خدائی خدمت گار تحریک

کا

تیسرا دور

سنہ ۱۹۵۷ء

باچا خان کی رہائی اور پاکستان نیشنل پارٹی میں شمولیت

باچا خان ابھی جیل ہی میں تھے کہ اُن کے مشورے سے مغربی پاکستان کے تمام جمہوریت پسند رہنماؤں نے مل کر ایک نئی جماعت پاکستان نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی۔ جس میں سندھ ہاری کمیٹی۔ آزاد پاکستان پارٹی، اور خدائی خدمت گار جماعت کو مدغم کر دیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد خدائی خدمت گار جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ اور وہ آزادانہ طور پر کام کرنے کے قابل نہ تھی۔ اس کے علاوہ ملک میں صحیح معنوں میں کوئی ایسی حزب مخالف جماعت بھی موجود نہیں تھی۔ جو حقیقی طور پر جمہوریت پسند ہو۔ اور محض اقتدار کے حصول تک ہی اس کی جد و جہد محدود نہ ہو۔ بلکہ ملک اور قوم کی مخلصانہ خدمت اور دیانت دارانہ رہنمائی کرنا اس کے فرائض میں شامل ہو۔

پاکستان کے عوام اقتدار پرست رہنماؤں اور خود غرض جماعتوں سے تنگ آ چکے تھے وہ چاہتے تھے۔ کہ کوئی ایسی بے غرض جماعت یہاں بنائی جائے۔ چنانچہ پاکستان نیشنل پارٹی نے اس ملک کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کر دیا۔ اور اسی لیے سارے ملک میں اسکا پُر جوش خیر مقدم کیا گیا۔

باچا خان نے بھی رہا ہوتے ہی پاکستان نیشنل پارٹی میں اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا۔ آپ نے ۱۴ جنوری ۱۹۵۸ء کو اپنی رہائی کے روز ہی تیسرے پہر پاکستان نیشنل پارٹی کی طرف سے ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے ملک میں عام انتخابات کی ضرورت پر زور دیا اور کہا۔ کہ برسر اقتدار لوگ اس وقت تک انتخابات نہیں کرائیں گے۔ جب تک کہ عوام انہیں مجبور نہ کریں۔ انہوں نے راجہ غضنفر علی خان کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ اگر برسر اقتدار لوگ انتخابات کرانے میں حیل و حجت سے کام لیں۔ تو عوام کو ایک مہم شروع کر کے حکومت کو جلد از

جلد انتخابات کرانے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ باچا خان نے ایسی مہم شروع کرنے کے سلسلہ میں راجہ غضنفر علی خان کو اپنی خدمات پیش کیں۔ انہوں نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا۔ کہ بھارت میں دوسری مرتبہ انتخابات ہو رہے ہیں۔ لیکن پاکستان میں آزادی کے بعد اب تک انتخابات نہیں کرائے گئے۔ انہوں نے کہا میری صحت خراب ہے۔ اور جونہی میں صحت یاب ہوا۔ میں لاہور واپس آکر سابق صوبہ پنجاب کے قصبات اور دیہات کا دورہ کروں گا۔ اور برسراقتدار لوگوں نے میرے خلاف جو پروپیگنڈے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں عوام پر اپنی پوزیشن کی وضاحت کروں گا۔

نیشنل پارٹی میں ادغام کے بعد خدائی خدمت گار تحریک کا ۱۹۵۷ء سے تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ غور کیا جائے۔ تو خدائی خدمت گار تحریک کو اپنے پہلے دور میں جن حالات سے گزرنا پڑا۔ تقریباً اسی قسم کی مشکلات سے اسے آج بھی دوچار ہونا پڑا۔ اور جس طرح اس وقت اسے آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں مدغم ہونے کے لیئے مجبور ہونا پڑا۔ بالکل اسی طرح آج پاکستان نیشنل پارٹی میں ضم ہونے کے لئے اسے حالات و واقعات نے مجبور کر دیا۔

اس وقت غیر ملکی حکومت کو یہ تنظیم گوارا نہ تھی۔ اور وہ اسے خطرناک سمجھتے تھے۔ تو آج ملکی حکمرانوں کو اس سے خدشہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ اسے آزادانہ طور پر کام کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس بے ضرر سی تحریک میں جو محض پشتون قوم کی اصلاح اور تنظیم کے لیئے شروع ہوئی۔ اور آج بھی اپنے انہی اصولوں پر قائم ہے۔ آخر ایسی کیا خوف دلانے والی چیز ہے۔ جس سے حکمران طبقہ ہمیشہ گھبراتا چلا آیا ہے۔ ملک میں بیسیوں سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ان کے علاوہ سندھ۔ بنگال۔ پنجاب غرض ہر جگہ ہر قوم کی اپنی جدا تنظیمیں بھی کام کر رہی

ہیں۔ جنہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ اور ہر قسم کی سہولتیں میسر ہیں۔ وہ اپنی زبان کو ترقی دینے کے لیئے بھی کام کر رہے ہیں۔ قوم کو منظم کرنے کے لیئے بھی سرگرم عمل ہیں۔ لیکن بدقسمت پشتون قوم سے آج اپنی قومی حکومت بھی سوتیلی ماں کا سا سلوک کر رہی ہے۔ آج بھی اس پسماندہ قوم کی جہالت دُور کرنے۔ ان کی اصلاح کرنے۔ اور انہیں منظم کرنے کے لیئے کوئی تحریک شروع کی جائے۔ تو اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور فرضی بے بنیاد اور من گھڑت خطرات کے پیش نظر اس پر پابندیاں عاید کی جاتی ہیں۔ حتےٰ کہ پشتو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج کے لیئے کام کرنا بھی حکومت کے عتاب اور قہر و غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے

اجنبی حکمرانوں سے ہمیں کوئی گلہ نہیں۔ انہوں نے پشتون قوم کو کچلنے، دبانے اور پسماندہ رکھنے کے لیئے جو اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اس میں ان کی بعض سنہری رو پہلی مصلحتیں کار فرما تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس جنگ جو، بہادر اور تیغ آزما قوم نے نہایت اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ سالہا سال تک انہوں نے ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ ان میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ گذرے ہیں۔ اور اپنی حکومت چھن جانے کے بعد غیر پشتون حکومتوں کے عہد میں بھی ہمیشہ فوجی طاقت ان کے ہاتھوں میں ہی ہے۔ اس لیئے انہیں خدشہ تھا کہ اگر کہیں اس قوم کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ تو ہماری خیر نہیں۔ لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب ملک آزاد ہو چکا ہے۔ یہاں اپنی قومی حکومت قائم ہے اس کا فرض تھا۔ کہ وہ غیر ملکی حکمرانوں کی بے انصافیوں کا ازالہ کرتی اور اپنے ہمدردانہ رویہ سے پشتونوں کا دل موہ لیتی۔ پاکستان کا یہ بازوئے شمشیر زن اس کا سب سے بڑا محافظ ہے اس کی حوصلہ افزائی کر کے اسے اپنے قریب لا کر اجنبیت اور غیریت دُور کر کے انہیں اپنانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت تھی۔ لیکن افسوس کہ ہماری اپنی حکومت بھی انگریزوں کی

اسی رسواکن پالیسی پر آج تک عمل پیرا ہے۔ اور پشتون قوم کو اس پسماندگی، جہالت اور افلاس کے عمیق گڑھوں سے نکالنے کے لیے نہ صرف یہ کہ اس نے خود کوئی توجہ نہیں دی۔ بلکہ ان کے سچے اور مخلص رہنماؤں کو بھی ایسا کرنے سے باز رکھنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کیا۔

نتیجہ یہ کہ پشتون قوم جو آج تک تعصب اور منافرت سے کوسوں دُور تھی۔ اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ کہ موجودہ نظام حکومت میں بھی اس کی ترقی اور اصلاح بہبود کا کوئی امکان نہیں۔ یہاں بحیثیت مسلمان قوم کے بحیثیت پاکستانی کے سوچنے کے بجائے ہمارا برسر اقتدار طبقہ بحیثیت بنگالی، سندھی اور پنجابی کے سوچ رہا ہے۔ اس لیے کیوں نہ وہ بھی بحیثیت پشتون کے سوچے۔

ہماری حکومت کو خدا توفیق دے۔ تو وہ معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے اب بھی اپنے پشتون بھائیوں کو اپنا سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ پیار محبت اور ہمدردانہ سلوک ہے۔ ان ہی چیزوں سے ان کے دل جیتے جا سکتے ہیں۔ اور انہیں احساس دلایا جا سکتا ہے۔ کہ یہ ان کا اپنا ملک ہے۔ اپنی حکومت ہے۔ اور ان کی بہتری حکومت کا مطمح نظر ہے۔ وہ انہیں مہذب، منظم اور خوش حال دیکھنا چاہتی ہے۔ اور اس کے لیے تمام ممکن ذرائع استعمال کرنے کو تیار ہے۔

حصّهٔ

دوم

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

باچا خان بحیثیت سیاست دان

باچا خان کا شمار ملک کے چند چوٹی کے سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ گاندھی جی ہمیشہ آپ کی رائے کو بڑی وقعت دیتے تھے۔ اور کوئی کام بھی آپ کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں ملک کے بڑے بڑے بلند نظر اور صاحب الرائے لوگ موجود تھے۔ لیکن گاندھی جی کو باچا خان کی سیاسی بصیرت پر بھروسہ تھا۔ اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کے معترف تھے۔

باچا خان خصوصی طور پر انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اس کے مطابق ہمیشہ اپنی پارٹی کا لائحہ عمل مرتب کرتے رہتے تھے۔ لیاقت علی خان مرحوم نے ان کے متعلق کہا تھا۔ کہ "وہ بہت گہرے آدمی ہیں"

شخصیت

باچا خان کی شخصیت بڑی مرعوب کن ہے۔ کوئی شخص بھی ان سے ایک دفعہ ملنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ اونچی لمبی، سادہ مگر بھرپور شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی کھلی پیشانی اور گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی گھٹی گھٹی آنکھیں ان کے تدبر کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ عموماً نہایت سنجیدہ رہتے ہیں۔ باتیں کھل کر کرتے ہیں۔ لیکن متانت کو کسی موقع پر ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ بہت خوش ہوں تو مسکرا دیتے ہیں۔ لیکن انہیں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے شاید آج تک کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔

آل انڈیا کانگرس کے ایک اجلاس میں آپ نے کہا "میں بڑا لیڈر نہیں ہوں۔ میں تو قوم کا خادم ہوں۔" اس پر مس سروجنی نائیڈو نے ازراہ مذاق آپ سے مخاطب ہو کر کہا "آپ تو بڑے

بڑے لیڈروں سے بھی دو ہاتھ بڑے نظر آتے ہیں۔ پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ آپ بڑے لیڈر نہیں ہیں۔"

قوم پر نفوذ جتنا نفوذ باچاخان کا اپنی پشتون قوم پر ہے۔ اتنا بہت کم کسی اور لیڈر کا دیکھا گیا ہے۔ ان کی آواز پر ساری قوم ہر وقت لبیک کہنے کو تیار رہتی ہے۔ آپ نے خدائی خدمت گار تحریک کو ایک دن کانگرس میں مدغم کرنے کا اعلان کیا تو دوسرے دن تمام خدائی خدمت گار کانگرسی تھے۔ اس موقع پر بعض رہنماؤں نے خدشہ ظاہر کیا کہ ہماری علیحدہ حیثیت ختم ہو جائے گی۔ لیکن آپ نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اس وقت ان میں سے بعض کو یقین نہ آیا۔ اور وہ علیحدہ ہو گئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب ایک موقع ایسا آیا۔ کہ آپ نے کانگرس ورکنگ کمیٹی سے اختلاف کرتے ہوئے کانگرس سے علیحدہ ہونے کا اعلان کیا۔ تو اگلے روز ہی تمام خدائی خدمت گاروں نے آپ کی تائید کر دی۔ اور پھر جب اس کے چند دنوں بعد کانگرس نے جنگ میں انگریزوں سے تعاون کرنے کا ریزولیوشن واپس لے لیا۔ اور آپ نے کانگرس میں شمولیت کا دوبارہ ارادہ ظاہر کیا۔ تو بغیر کسی اعتراض کے سب نے سر خم کر دیئے۔ وہ کہیں رات ہے تو لوگ کہتے ہیں بے شک رات ہے۔ وہ کہیں دن ہے تو قوم کہتی ہے لاریب دن ہے۔ پشتون ان کی پرستش کرتے ہیں۔ انہیں اپنا باپ سمجھتے ہیں۔ اور ان کا نام سنتے ہی جھک جاتے ہیں۔

باچاخان کا پشتون قوم پر اتنا اثر ہے۔ کہ اکثر لوگوں نے تو آپ کو کوئی بزرگ یا پیر سمجھ کر آپ کے ہاتھ پاؤں چومنے شروع کر دیئے۔ لیکن آپ نے انہیں سختی سے منع کیا۔ اور بار بار اپنی تقریروں میں کہا۔ کہ میں نہ پیر ہوں نہ بزرگ ہیں تو ایک سیاسی اور انقلابی آدمی ہوں۔ بلکہ انہوں نے بناوٹی پیروں اور بے عمل بزرگوں کی سخت مذمت کی اور فرمایا۔ کہ جس شخص کو

غلامی کا احساس نہیں، قوم کی عزت وجاہت اور ذلت کا احساس نہیں۔ مذہب اسلام اور مسلمانوں کی توہین کا احساس نہیں۔ اور وہ قوم کو اس پستی سے نکالنے کے لیے میدان میں نہیں آتا جدوجہد نہیں کرتا میں اسے بزرگ پیر اور عالم تو کیا مسلمان بھی نہیں سمجھتا۔

باچا خان کا اتنا اثر ہے۔ کہ ان کا نام سنتے ہی لوگوں کے چہرے چمک اُٹھتے ہیں۔ ان میں زندگی کی روح دوڑ جاتی ہے۔ اور ان کی آنکھوں میں امید کی کرنیں جگمگانے لگتی ہیں وہ انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ سچا اور مخلص رہنما جانتے ہیں۔ اور ان کے ادنٰے حکم پر اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار ہیں۔

سوشل ورکر

باچا خان کی تحریک خدائی خدمت گار جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ محض خدمت خلق کے لیے ہی بنائی گئی۔ اور باچا خان خود بھی بحیثیت ایک سوشل ورکر کے مجسم خدائی خدمت گار ہیں۔ وہ اپنا تمام کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ اپنے کپڑے خود دھوتے ہیں۔ اپنے کمرے میں جھاڑو خود دیتے ہیں۔ اپنا کھانا خود پکاتے ہیں— اور صرف اپنے ہی نہیں لوگوں کے کام بھی نہایت خوشی سے انجام دیتے ہیں۔ وہ لوگوں کے حجروں میں جاکر غریب کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ اور حتی الوسع ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

باچا خان میلوں پیدل چل کر دیہات کا دورہ کرتے ہیں۔ بیماروں کی مزاج پرسی کرتے ہیں۔ بے کاروں کے لیے کام ڈھونڈتے ہیں۔ بے سہاروں کو سہارا دیتے ہیں۔ ناامیدوں کی ڈھارس بندھاتے ہیں۔

باچا خان کو خدمت خلق سے اتنی رغبت ہے۔ کہ ہمیشہ لوگوں کو اس کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اور ہر دم یہی کہتے ہیں کہ لوگوں سے محبت سے پیش آؤ۔ ان کی خدمت کرو انہیں

اپنا بھائی سمجھو۔ ہر کسی سے نیک سلوک کرو۔ ایک دوسرے کی مدد کرو۔ گروں کو اٹھاؤ، ڈوبتوں کو بچاؤ۔

خطابت

باچا خان کوئی بہت بڑے خطیب نہیں، نہ ہی خطابت کے مخصوص اصولوں پر ان کی تقریروں کو پرکھنے سے ان کی تعریف کی جا سکتی ہے۔ وہ کوئی پرجوش اور ہنگامہ خیز مقرر بھی نہیں بلکہ ان کا تو اپنا ایک الگ ہی انداز ہے۔ دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ یوں بولنا جیسے کوئی کسی سے بے تکلف باتیں کر رہا ہو۔ نرم نرم باتیں۔ میٹھی میٹھی باتیں۔ دل کو موہ لینے والی باتیں —— جیسے دھرتی کے خشک اور بے نور سینے پر ہلکی ہلکی خوش گوار پھوار پڑ رہی ہو۔

بعض لوگ کہتے ہیں صوبہ سرحد میں بحیثیت خطیب کے باچا خان کا جواب نہیں مل سکتا۔ اور دیکھا جائے تو وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ باچا خان تقریر کر رہے ہوں تو مجمع پر یوں خاموشی چھا جاتی ہے جیسے تمام لوگ مسحور ہو گئے ہوں۔ ان کے پاس ایسا جادو ہے۔ کہ وہ اپنی روزمرہ گفتگو میں بھی مخاطب کو انتہائی طور پر متاثر کرتے ہیں۔

باچا خان کی تقریریں عموماً بڑی طویل، سادہ مگر باربط اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ وہ تقریر کے دوران میں چھوٹی چھوٹی مثالوں اور کہاوتوں سے تقریر کی خشکی اور یبوست کو دور کر کے اس میں حلاوت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقرے نہایت سہل الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اتار چڑھاؤ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن محض ہنگامی نعرے نہیں ہوتے۔ بلکہ ٹھوس اور پائیدار باتیں ہوتی ہیں۔

باچا خان کی تقریروں پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ ان میں مضمون کی تکرار بہت ہوتی ہے ایک ہی بات وہ ہر جگہ، بار بار مہینوں دہراتے رہتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں یہ ان کی خوبی ہے۔ وہ ایک سیاسی خطیب ہیں۔ اور ایک ضروری بات عوام کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لیے ایک سیاسی رہنما کے لیے ضروری ہے کہ وہ بار بار اس کا اعادہ کرتا

رہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں اور زاویوں پر روشنی ڈالے اور مختلف انداز سے لوگوں کو سمجھائے چنانچہ اس اعتبار سے باچا خان نہایت کامیاب خطیب ہیں۔ انہیں اپنا پیغام کونے کونے میں پہنچانا ہوتا ہے۔ اس لیئے لازمی طور پر انہیں ہر جگہ ذرا نئے ڈھنگ سے ہیر پھیر کر وہی باتیں کہنا پڑتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کو ان کی تقریروں کے اقتباسات ازبر ہو چکے ہیں۔

عوامی رہنما

باچا خان صحیح معنوں میں ایک عوامی رہنما ہیں۔ وہ عوام کی نفسیات کو جانتے ہیں۔ ان کے رجحانات کو سمجھتے ہیں۔ ان کی کمزوریوں اور خوبیوں سے واقف ہیں۔ وہ عوام میں گھل مل کر رہتے ہیں۔ انہیں محبت سے ملتے ہیں۔ اور ان سے اتنا قریب ہو جاتے ہیں کہ وہ انہیں اپنا ہمدرد، غمگسار اور سچا دوست جان کر ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ اپنے نجی معاملات میں بھی ان سے مشورہ لیتے ہیں اور ان کی رائے طلب کرتے ہیں۔

باچا خان پشتون عوام کے محبوب رہنما ہیں۔ اور بلاشبہ انہیں تمام پشتون قوم کا پورا پورا اعتماد حاصل ہے۔ لوگ ان کا احترام کرتے ہیں۔ ان کے سامنے نہایت احتیاط سے بولتے ہیں یہاں تک کہ ان کی موجودگی میں کسی کو چلم یا سگرٹ پینے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

عوام انہیں دل و جان سے چاہتے ہیں۔ وہ انہیں اپنا خیر خواہ اور مخلص رہنما سمجھتے ہیں۔ انہیں یقین ہے۔ کہ باچا خان جو کچھ بھی کرتے ہیں ان کے بھلے کے لیئے ہی کرتے ہیں۔ اس لیئے وہ ان کی ہر بات کو بلا چون و چرا مانتے ہیں۔

باچا خان گذشتہ چالیس برس سے سرحد کی سیاسیات پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے دوست دشمن سب انہیں پشتون عوام کا بلا شرکت غیرے واحد رہنما تسلیم کرتے ہیں۔ عوام ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ انہیں اپنا بے تاج بادشاہ سمجھتے ہیں اور محبت، پیار اور احترام سے انہیں "باچا خان" کہہ کر پکارتے ہیں۔

باچا خان کی نظر میں خدائی خدمت گار کا تصوّر

اگر میں یہ کہوں کہ باچا خان کی نظروں میں ایک سچے خدائی خدمت گار کا تصوّر اقبال کے مردِ مومن سے بہت حد تک مشابہ ہے۔ تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اس لیئے کہ باچا خان اور اقبال دونوں نے یہ تصور پشتو کے عظیم شاعر خوش حال خان خٹک ہی سے لیا ہے۔ جیسا کہ ان مثالوں سے واضح ہے۔

خوش حال خان خٹک

خدمتِ خلق کر، بھلائی کر بھولے بھٹکے لوگوں کی رہنمائی کر
حرص کو چھوڑ کر حاتم بن جا اور بندہ بن کر خدائی کر

•

مرد وہ ہے جو عیش و آرام چھوڑ کر ہمیشہ سرگرم عمل ہے۔

علامہ اقبال

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ تقریریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

•

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

•

باچا خان

مجھے پکے خدائی خدمت گاروں کی ضرورت ہے۔ یہ ایک روحانی تحریک ہے۔ اس میں تھوڑے سپاہی ہوں لیکن نیک اور ایمان دار ہوں اور اپنے نفس کے تابع نہ ہوں۔

•

میں زیادہ باتوں کا قائل نہیں۔ قومیں باتوں سے نہیں عمل سے بنتی ہیں میں عملی آدمی ہوں اور خدائی خدمت گار میں یقین، عزم اور عمل دیکھنا چاہتا ہوں۔

•

فرق صرف یہ ہے کہ باچا خان عدم تشدد کے قائل ہیں اور اپنے خدائی خدمت گار کو ایک مرد مومن کی تمام خصوصیات کے ساتھ عدم تشدد کا پابند دیکھنا چاہتے ہیں۔

خدائی خدمت گار تحریک کے حلف نامہ میں پہلی شرط
یہ ہے جس کا ہر خدائی خدمت گار کو عہد کرنا پڑتا ہے کہ
میں اپنا نام خدائی خدمت گاری کے لیے صداقت اور ایمانداری سے پیش
کرتا ہوں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ——

میں اپنی جان، مال اور آرام ایمان داری کے ساتھ اپنی قوم کی خدمت اور
وطن کی آزادی پر قربان کروں گا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ ——

میں ہمیشہ نیکی اور اچھائی پر کاربند رہوں گا۔

چوتھی شرط ہے ــــــ

میں اپنی خدمت کے بدلے کسی چیز کی طمع یا لالچ نہیں کروں گا۔

پانچویں شرط ہے ــــــ

میری تمام کوششیں خدا کی رضا کے لیے ہوں گی نمائشی نہیں ہوں گی۔

باچا خان نے اپنی ہر تقریر میں خدائی خدمت گار تحریک کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے یہ تحریک بہت مقبول ہوئی۔ ہزاروں لاکھوں پیرو پیدا ہو گئے جن میں مخلص اور بے غرض لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن باچا خان آخر تک مطمئن نظر نہیں آتے۔ ان کے ذہن میں ایک سچے خدائی خدمت گار کا جو تصور موجود ہے۔ انہیں آج تک ایسے خدائی خدمت گاروں کی تلاش ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے رضاکاروں کے اس جم غفیر میں انہیں اپنے معیار کا آج تک ایک آدمی بھی نہیں مل سکا۔ ان کا معیار بہت اونچا ہے۔ اتنا کہ کوئی عام آدمی اس تک مشکل ہی سے پہنچ سکتا ہے۔

انہوں نے اپنے آپ کو سالہا سال کی ریاضت کے بعد ایک مثالی خدائی خدمت گار بنایا۔ اور وہ چاہتے ہیں۔ کہ سب خدائی خدمت گار اسی مقام پر نظر آئیں۔ وہ تحریک میں زیادہ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر خوش نہیں ہوتے۔ وہ جیل جانے، لاٹھیاں کھانے اور سرخ وردی پہننے کو خدائی خدمت گاری نہیں سمجھتے، وہ انقلاب کے نعرے لگانے، جلسے کرنے، جلوس نکالنے کو تحریک کی کامیابی نہیں خیال کرتے ــــــ پھر وہ کیا چاہتے ہیں۔ وہ عمل چاہتے ہیں۔ صرف عمل ــــــ وہ ہزاروں لاکھوں کے بجائے صرف گنتی کے چند خدائی خدمت گار ایسے پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ان کی طرح مثالی خدائی خدمت گار ہوں۔

جو عمل اور قربانی کا مجسمہ ہوں۔

جو بے غرض اور بے لوث ہوں۔

جو سچے، مخلص اور نیک ہوں۔

جو بے خوف اور نڈر ہوں۔

جو حوصلہ مند اور مستقل مزاج ہوں۔

اور جو

ع زندگی کے آسماں پر مہر و مہ بن کر رہیں۔

وہ سوچتے ہیں کہ اگر وہ ایسے چند مثالی خدائی خدمت گار پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ تو ان کی زندگی کا مشن پورا ہو جاتا ہے۔ ان کا مقصد حل ہو جاتا ہے۔ ان کی کوششیں بار آور ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ بار بار کہتے ہیں کہ مجھے زیادہ لوگوں کی ضرورت نہیں مجھے تو صرف چند سچے خدائی خدمت گاروں کی ضرورت ہے۔ اور ایک موقع پر تو انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اور کوئی نہ ہو تو میں خود اکیلا خدائی خدمت گار ہی کافی ہوں۔

خدائی خدمت گار کی خصوصیات ان کی زبانی سنئیے۔

جو کچھ کہے اسے کر کے دکھائے

پارٹی بازیاں، مقدمے بازیاں اور دشمنیاں نہ کرے۔

کسی پر زور ظلم اور جبر نہ کرے۔

کسی سے بدلہ نہ لے۔

جو کوئی اس کے ساتھ برائی کرے یہ اس سے نیکی کرے۔

اچھے اخلاق، خو بو اور اچھی عادتیں پیدا کرے۔

مظلوم کا ساتھ دے۔

ہمیشہ سچ بولے۔

بدکاریوں سے جان بچائے۔

پاک و صاف رہے۔

باچا خاں ہمیشہ سچا خدائی خدمت گار بننے پر زور دیتے ہیں۔ وہ منافق ہیں نہ منافقت پسند کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدائی خدمت گار بننے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر لوگوں کو اس تحریک میں شامل ہونا چاہیئے۔ تاکہ بعد میں پشیمانی نہ ہو۔ وہ بار بار واضح طور پر کہتے رہے ہیں کہ لوگو سوچ لو سمجھ لو میرا راستہ کٹھن ہے، کانٹوں بھرا ہے۔ اس میں دُکھ ہی دُکھ ہیں۔ میری دوستی بہت مہنگی ہے۔ دشوار ہے تکلیف دہ ہے۔ میرے ساتھ آتے ہو تو تمہیں اپنے تمام دنیاوی سکھ آرام کو ترک کرنا پڑے گا۔ آزمائشوں میں پڑنا پڑے گا۔ بہت بڑا ایثار کرنا پڑے گا۔ ابھی سے خوب غور و فکر کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے۔ اسے آسان کام نہ سمجھو۔ یہ راستہ پُر از خار ہے۔ اس میں حادثے ہیں، خطرے ہیں، زلزلے ہیں، بھونچال ہیں، درد ہیں، دُکھ ہیں—

ہماری منزل دُور ہے بہت دور، ہمیں اس منزل تک پہنچنے کے لیئے ایک ہولناک ریگستان سے گزرنا ہے۔ جس میں میلوں تک نہ کوئی سایہ دار درخت ہے نہ پانی کا چشمہ ہے، نہ سواری ہے۔ اور نہ کوئی غیبی سہارا ملنے کا امکان ہے۔ اس سلسلہ میں باچا خان کی ایک تقریر دیکھئے:۔

”آج میں اس لیئے آیا ہوں کہ آپ کو خدائی خدمت گاری کا مفہوم سمجھا دوں آج کے بعد ہمارے ساتھ صرف دس آدمی ہوں۔ لیکن وہ نام کے خدائی خدمت گار نہ ہوں۔ خدائی خدمت گار ایک ایسی فوج ہے۔ جس میں ہر آدمی بھرتی نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی انگریزی فوج تو نہیں کہ جس میں ہر آدمی

بھرتی ہو سکتا ہے۔ انگریزوں کی فوج میں تو اچھے بُرے کی تمیز نہیں ہوتی۔ پھر یہ تو ایک خدائی فوج ہے۔ اس میں تو وہ آدمی بھرتی ہو گا جو کہ بہت پاک ہو اور ہر قسم کے عیب سے کنارہ کش ہو۔ میرا یہ ایمان ہے کہ پٹھانوں کی نجات صرف اس خدائی خدمت گاری میں ہے۔

سب سے پہلے ایک خدائی خدمت گار کے لیئے ضروری ہے کہ وہ تنہا ایک جگہ بیٹھ جائے، جہاں صرف وہ ہو اور خدا ہو ـــــ اور خدا کو حاضر ناظر جان کر اپنے دل سے پوچھے کہ آیا وہ اصول جو میں نے بیان کیئے ہیں وہ انہیں تسلیم کرتا ہے یا نہیں ـــــ ظاہری طور پر تو آپ مجھے دھوکا دے سکتے ہیں اور میں آپ کو ـــــ مگر خدا کے ساتھ دھوکا بازی نہیں چل سکتی اس لیئے کہ وہ ہمارے دلوں کا حال جانتا ہے ـــــ ایک بار نہیں، دو بار نہیں، بار بار، اپنے دل سے پوچھے اور اگر دل مشورہ دے تو پھر خدائی خدمتگار بنے اور اگر دل کہے کہ یہ سخت کام ہے تو پھر جدا ہی رہے۔

اب میں آپ کو باخبر کرتا ہوں کہ بمبئی میں کانگرس نے فیصلہ کیا ہے کہ یا تو حکومت ہمارے مطالبات مانے اور یا ہم پھر سے صبر کی جنگ شروع کریں گے۔ تو آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ ہماری یہ جنگ پہلی جنگ سے مختلف ہو گی۔ یہ اس پہلے پرانے طریقہ پر نہ ہو گی کہ جس میں زیادہ نقصانات تھے پہلے کی طرح وہ ہنگامی جلسے نہ ہوں گے کہ جن میں گرما گرم تقریریں ہوتی تھیں اور لوگ جوش میں آجاتے تھے اور پولیس مار کٹائی شروع کر دیتی تھی اور بہت سے بے گناہ لوگوں کو جیل بھجوا دیا جاتا تھا۔ تو وہ لوگ تو خدائی

خدمت گار نہیں ہوتے تھے، لیکن لوگوں کے غول میں آجاتے تھے۔ اور پھر تیسرے دن معافیاں مانگ کر جیلوں سے نکل آتے تھے۔ تو پھر لوگ کہتے کہ خدائی خدمت گار معافیاں مانگ رہے ہیں۔ بھاگ رہے ہیں اور پھر بہت سے لوگوں کے مکان لٹتے اور پولیس قسم قسم کے مظالم کرتی تھی —— اس مرتبہ وہ قصے نہ ہوں گے —— اس مرتبہ سول نافرمانی کا یہ طریقہ ہوگا کہ حکومت جس بات کو خلاف قانون قرار دے گی ہم وہی کریں گے، پر کس طرح؟ ——

ایک آدمی غور و فکر کے بعد اپنے آپ کو سول نافرمانی کے لیئے تیار کرے گا اور جب ہر قسم کی تکلیفات و مشکلات کے لیئے وہ تیار ہوگا۔ تو پھر وہ راستے میں، بازاروں میں، گلی کوچوں میں سول نافرمانی کرے گا۔ اور بالکل تن تنہا —— آگے پھر حکومت کی مرضی ہے کہ اسے گرفتار کرے یا نہ کرے —— تو اس صورت میں عام لوگ تباہی سے بچ جائیں گے اور اگر ویسے ہی حکومت کسی کو تکلیف پہنچائے تو اس کا کوئی علاج نہیں —— اس صورت میں یہ فائدہ ہوگا کہ جو شخص جیل جائے گا وہ بڑے صبر و تحمل سے اپنی قید گزارے گا۔

لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ اس مرتبہ جیل میں وہ قصے نہ ہوں گے جو کہ آپ نے ۳۲ و ۳۳ء میں ہری پور جیل میں کئے تھے۔ جس طرح کہ آپ باہر خدائی خدمت گار ہیں اسی طرح جیل میں بھی خدائی خدمت گار رہیں۔ جس طرح یہاں مارپیٹ برداشت کرتے ہیں ویسے ہی جیل میں بھی صبر کرنا ہوگا —— وہ قصے نہ کرنے ہوں گے جو آپ پہلے کرتے تھے ——

دوسری بات یہ ہے کہ اب جو کوئی بھی جیل جائے گا۔ وہ اپنی مشقت کرے گا

اس طرح نہ کرے گا۔ جیسے لوگ رشوت دے کر مشقت سے جان بچا لیتے تھے۔ یاد رکھئے کہ رشوت دینا گناہ کبیرہ ہے۔ اور جو شخص اس طرح کے گناہ کرتا ہے۔ تو اس سے بہتر ہے۔ کہ وہ بالکل جیل نہ جائے۔ اور جیل خانہ میں ان چیزوں کی عادتوں کو چھوڑنا ضروری ہے۔ کہ جن کو جیل خانہ میں بدمعاشی کہتے ہیں۔ جیسے کہ تمبا کو، اخبار وغیرہ منگوانا یا چوری چھپے خط و کتابت کرنا۔ یہ چیزیں انسان میں کمزوری پیدا کرتی ہیں۔ اور ایک خدائی خدمت گار کو بزدل اور ڈرپوک نہیں ہونا چاہیئے۔ خدائی خدمت گار کو ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ جو کچھ کرے برملا کرے مجھے ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے۔ جیسا کہ میں نے آپ کو یہ قصہ کئی مرتبہ سنایا کہ جس وقت میں ۱۹۲۱ء میں تین سال قید ہوا۔ اور مجھے کسی نے ڈرا دیا۔ اور اس کی وجہ سے میرے دل میں ڈر پیدا ہوا تھا۔ تو اس وقت میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ آئندہ پھر میں کبھی ایسا کام نہ کروں گا جو آدمی کے دل میں ڈر پیدا کرے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ جیل میں لوگ بھوک ہڑتال بہت کرتے ہیں۔ اس مرتبہ کوئی بھی بھوک ہڑتال نہ کرے اور اگر کوئی کرے تو پھر وہ پہلے سے فیصلہ کرلے کہ یا تو میں مروں گا یا پھر میرا مطالبہ منظور کیا جائے گا۔ لیکن یہ بات غلط ہے کہ ایک شخص بھوک ہڑتال کرے اور دوسرے بھی اس کی ہمدردی میں بھوک ہڑتال کر دیں۔ دوسرا یہ بات ضروری ہے کہ کوئی اپنی مرضی سے جیل جانے کو تیار نہ ہو تو اس وجہ سے نہ جائے۔ کہ کل لوگ اسے طعنہ دیں گے۔ کہ پٹی باندھ رکھی ہے اور خدائی خدمت گار بھی ہو لیکن جیل نہیں جاتے۔ اس طعنے کے ڈر سے کسی کو

جیل نہ جانا چاہیئے اور نہ ہی لوگوں کو چاہیئے کہ وہ کسی کو اس قسم کے طعنے دیں۔"

جن لوگوں نے سیاسی تحریکیں دیکھی ہیں، رضاکار دیکھے ہیں، لیڈر دیکھے ہیں —— وہ ایمانداری سے بتائیں کہ پاکستان میں کون ایسا لیڈر ہے یا تھا جس نے ایسی صاف صاف کھلی کھلی باتیں کی ہوں۔ خیال کیجئے سول نافرمانی کی تحریک سر پہ ہے اتنا بڑا لیڈر، صوبہ سرحد کی تمام ذمہ داری اس کے سر پر، تحریک کی کامیابی ناکامیابی پر عزت و وقار کا سوال، لیکن بجائے اس کے کہ وہ انہیں اندھا دھند بھاڑ میں جھونکنے کی کوشش کرے اور اپنے نام و نمود کے لیئے ہزاروں رضاکار جیل بھجوانے کے لیئے مضطرب و بے قرار نظر آئے —— یہ حضرت کس اعتماد، کس یقین، کس تحمل سے انہیں کہتے ہیں کہ سوچ سمجھ کر آؤ اور قدم بڑھاؤ تو پھر پیچھے نہ ہٹاؤ —— کسی دباؤ، کسی لالچ، کسی طعنے کی وجہ سے جیل نہ جاؤ —— یہ بات ہو تو اب بھی ارادے بدل لو —— پھر یہ کہ وہاں مشقت بھی کرنی ہوگی۔ نشہ پانی بھی چھوڑنا پڑے گا، تکلیف و اذیت بھی اٹھانا ہوگی —— یہ سب باتیں سوچ لو۔ ان کے لیئے اپنے آپ کو تیار پاؤ تو جیل جانے کا نام لو ورنہ آرام سے گھر بیٹھو، جذباتی نہ بنو، تحریک کو جذباتی آدمیوں کی ضرورت نہیں۔ مستقل مزاج اور بلند حوصلہ لوگوں کی ضرورت ہے —— سچ پوچھیئے تو یہ باتیں باچا خان جیسا ہر دل عزیز اور معقول لیڈر ہی کہہ سکتا ہے۔ ورنہ ہم نے تو تحریکوں میں یوں بھی دیکھا ہے کہ چالاک لیڈروں نے چند آدمیوں کو صرف جوش کے ساتھ جانے پر آمادہ کیا اور کسی تھانے کے سامنے پہنچتے ہی لیڈروں کے ایجنٹوں نے ان بے چاروں کو اچانک پھولوں کے ہار پہنا کر نعرے لگانے شروع کر دیئے اور انہیں گرفتار کرا کے اپنی فریب کاری پر اتراتے ہوئے لوٹ آئے۔

دراصل باچا خان کی اس تحریک کا مقصد ہی کچھ اور تھا وہ آئیڈیل انسان اپنی پشتون قوم میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جو افسوس کہ وہ پیدا نہ کر سکے۔ اس لیئے کہ انہیں سیاست میں آنا پڑا اور کام کرنے کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ خدائی خدمت گار کے متعلق باچا خان کا تصور

ہمیشہ نہایت بلند اور ارفع رہا ہے۔ وہ کردار اور عمل اچھائی اور دیانت، محبت اور پیار، صبر اور تحمل کا ایک ایسا مجسمہ بنانا چاہتے تھے جس کا نام "خدائی خدمت گار" ہو

باچا خان اور عدم تشدد

"عدم تشدد قریب قریب میرا مذہب بن گیا ہے۔ میں گاندھی جی کی اہنسا کا پہلے بھی قائل تھا لیکن اس تجربہ کو جو بے نظیر کامیابی میرے صوبہ میں حاصل ہوئی اس کے بعد تو میں دل و جان سے عدم تشدد کا حامی بن گیا ہوں۔ انشاء اللہ میرے صوبے کے لوگ کبھی تشدد سے کام نہیں لیں گے۔ ممکن ہے کہ میں ناکامیاب رہوں اور میرے صوبہ میں تشدد کا طوفان برپا ہو جائے۔ ایسا ہوا تو میں اپنی قسمت پر صبر کر کے بیٹھ رہوں گا۔ مگر اس سے میرے اس عقیدے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ کہ عدم تشدد اچھی چیز ہے اور میری قوم کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔"

یہ وہ فقرے ہیں جو باچا خان نے خود اپنے عدم تشدد کے عقیدے کے بارے میں ارشاد فرمائے ہیں۔ اور ان میں ان کا نظریہ اتنا واضح ہے کہ اس سلسلہ میں مزید کسی تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس میں شک نہیں کہ عدم تشدد کا فلسفہ باچا خان نے گاندھی جی سے لیا۔ اور اس بات کا انہوں نے اعتراف بھی کیا ہے لیکن آخر میں اس چیز کو انہوں نے اس حد تک اپنایا کہ شاید گاندھی جی سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ کانگرس کے بڑے بڑے لیڈر جو گاندھی جی سے بہت قریب تھے عدم تشدد پر اس سختی سے پابند نہ رہ سکے۔ جس طرح باچا خان رہے۔ اس بات کے سب معترف ہیں

تھے کہ گاندھی جی نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی تو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے متفقہ طور پر اس جنگ میں انگریزوں کی حمایت کا اعلان کیا۔ لیکن گاندھی جی نے جنگ کی مخالفت کی اور انگریزوں کی مدد کرنا اپنے اہنسا کے اصولوں کے منافی سمجھا۔ اس موقع پر باچاخان واحد شخص ہیں جنہوں نے گاندھی جی کا ساتھ دیا اور کانگرس سے مستعفی ہو گئے۔ اس بات سے گاندھی جی بڑے متاثر ہوئے اور اپنے اخبار "ہریجن" میں لکھا ــــــ

"کانگرس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر اپنے عقیدے سے پھسل گئے لیکن ایک باچاخان تھا جو پہاڑ کی طرح اپنے اصولوں پر محکم رہا۔"

پنڈت جواہر لال نہرو گاندھی جی کو اپنا گرو مانتے تھے اور ہمیشہ انہیں باپو جی کہہ کر پکارتے تھے۔ اور کبھی کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف نہیں کرتے تھے لیکن انہیں بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ــــــ

"گاندھی جی کے بعد خان عبدالغفار خان ہی ایک ایسے شخص ہیں جو عدم تشدد کو اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ اور اپنے اس اصول کو کسی حالت میں بھی چھوڑنا پسند نہیں کرتے وہ اس معاملہ میں گاندھی جی کے پکے پیرو ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

باچاخان عدم تشدد کو اپنی پشتون قوم کی خرابیوں کا واحد حل سمجھتے ہیں ان کی خانہ جنگیاں، قتل و غارت گری اور ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے کی مذموم عادتوں کا علاج کرنے کے لیے انہیں یہی ایک تریاق نظر آیا۔ اور اسی لیے انہوں نے اس کا خوب خوب پرچار کیا۔ خود اس کا عملی نمونہ بن کر دکھایا اور تقریر و تحریر کے ذریعے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ

اور اہمیت جتائی۔

انہوں نے اسے اور زیادہ وسعت دی اور نہ صرف اپنی جنگ آزادی کے لیے عدم تشدد کو ایک مفید اور کارآمد ہتھیار سمجھا بلکہ اسے تمام دُنیا کے امن و آشتی کا ذریعہ قرار دیا فرماتے ہیں ——

"جنگ دو طرح سے لڑی جاتی ہے ایک تشدد سے دوسری عدم تشدد سے یعنی صبر سے —— تشدد کی جنگ میں فتح و شکست دونوں کا امکان ہے لیکن عدم تشدد کی جنگ میں شکست کا احتمال ہی نہیں اس میں ہمیشہ ہی فتح ہے۔ تشدد سے قوموں میں نفرت اور بغض و کینہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ دوسری اور تیسری جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس طرح ۱۹۱۴ء کی تشدد کی جنگ کا نتیجہ موجودہ خون ریز جنگ کی صورت میں سامنے آیا۔ لیکن عدم تشدد قوموں میں محبت پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ امن ہے اور یہ عدم تشدد کی جنگ کوئی نئی اور عجیب چیز نہیں یہ جنگ وہی ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے ہمارے رسول اکرمؐ نے مکّہ کی زندگی میں لڑی تھی۔ لیکن جو لوگ عدم تشدد کے اصول سے ناواقف ہیں۔ ان کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہم کو شکست ہوگئی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ جب ہم ۱۹۳۱ء میں جیلوں سے باہر آئے تو قوم میں ہمدردی اور محبت کے جذبات کس قدر بڑھے ہوئے تھے پھر ۱۹۳۲ء میں حکومت نے جو ذلّت آمیز تشدد روا رکھا اور مجھے آپ سے چھ سال کے لیے جدا رکھا گیا لیکن حکومت ہمارے جذبات کو نہ دبا سکی۔"

باچا خان میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو کچھ وہ اپنی زبان سے کہتے ہیں اس کا خود مثالی نمونہ بن کر بھی دکھایا ہے۔ عدم تشدد کی پالیسی پر بھی وہ سب سے پہلے خود کاربند ہوئے۔ اس کے بعد

انہوں نے دوسروں کو اس کی تعلیم دی۔ عدم تشدد کو اپنانے کے لیے انہیں کتنی ریاضت کتنی نفس کشی کرنی پڑی یہ کچھ اُن ہی کا جی جانتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں کو نہیں چھپاتے بلکہ صاف کہتے ہیں کہ مجھ میں بہت کمزوریاں تھیں جن کی رفتہ رفتہ میں نے اصلاح کی اور ان پر قابو پایا۔ عدم تشدد پر بھی وہ ایک دم سے حاوی نہیں ہو گئے۔ بلکہ کافی محنت، کافی داخلی اور خارجی جدوجہد کے بعد اسے اپنا شعار بنایا اور سچ پوچھیے تو ایک پشتون کا عدم تشدد پر ایمان لانا ہے بھی نہایت عجیب و غریب بات ـــــ کیونکہ اس کی صدیوں کی روایات، اس کا ماحول، اس کی فطرت اور اس کا مزاج سب کے سب اس کے بالکل برعکس واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے ایک عام آدمی کی نسبت، عدم تشدد کو اپنانا ایک پشتون کے لیے زیادہ دشوار ہے۔ اور چونکہ باچا خان بھی پشتون ہیں اس لیے یقیناً انہیں اپنی فطرت کے خلاف جنگ لڑنے میں بہت کچھ کرنا پڑا ہوگا۔ لیکن وہ بڑے عزم کے انسان ہیں۔ جو شخص اپنا راج پاٹ چھوڑ کر پچیس برس قید و بند میں گذار سکتا ہے۔ اس کے لیے اپنے آپ میں ایسی تبدیلی پیدا کرنا کہ ایک سر ایک نئے قالب میں ڈھل جائے کچھ مشکل نہیں۔

وہ اپنے عدم تشدد کے فلسفے کو مختلف طریقوں سے پیش کر کے اسے لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

"انسانی تباہی کا باعث نفرت ہے۔ دنیا کی بڑی سامراجی طاقتیں جب نفرت کی چٹان سے ٹکرائیں تو پاش پاش ہو کر رہ گئیں۔ مختلف فرقوں، مختلف گروہوں مختلف عناصر میں نہیں بلکہ ایک ہی نظریے کے قائل دوستوں کے درمیان بغض و نفرت کے شعلے بلند ہوئے تو وہ اس میں بھسم ہو کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ ہندوستان کی موجودہ [illegible] ش بھی نفرت کا نتیجہ ہے۔ کیا ایک ہی مادرِ وطن کے فرزند ایک دوسرے کو آنکھیں نہیں دکھا رہے۔ نفرت قتل و غارت کی بنیاد ہے

نفرت انسانیت کی بربادی کا موجب ہے۔ نفرت کو دُور کرنے کے لیے میری یہ بات یاد رکھو کہ جس آدمی کے دل میں ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ فلاں نے میری توہین کی ہے۔ میری غیبت کرتا ہے۔ مجھے برباد کرنے کی مذموم تجاویز سوچتا ہے۔ اس کے دل سے کبھی نفرت نہیں جاتی۔ لیکن جس کے دل میں یہ خیالات نہیں ہیں۔ اس کے دل میں کبھی نفرت پیدا نہیں ہوتی۔ نفرت، نفرت سے دُور نہیں ہو سکتی۔ بلکہ محبت سے دُور ہوتی ہے۔ اس لیے نفرت کو محبت اور بدی کو نیکی سے فتح کیا جا سکتا ہے۔

غصہ ایک نشہ ہے اور اس نشے کے تحت انسان بڑے سے بڑے کام کر بیٹھتا ہے۔ اور ایسی چیزیں کھو بیٹھتا ہے۔ کہ تمام عمر پشیمانی رہتی ہے۔ اور اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ غصے کے وقت انسان کو اس کی عقل جواب دے جاتی ہے۔ اور وہ اچھے کام کا ارادہ نہیں کر سکتا۔ یاد رکھو دوسروں کو گرانے سے کوئی آدمی بڑا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص بڑا بننا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ دوستانہ اور محبت پر مبنی جذبات اپنے اندر پیدا کرے۔

اس سلسلہ میں ان کی نواں شہر (ایبٹ آباد) کیمپ کی جیبی تقریر بڑی کارآمد، ٹھوس اور معلومات افزا ہے۔ جسے میں اپنی اختصار پسندی کے باوجود یہاں نقل کرنے پر مجبور ہوں۔

"لوگ کہتے ہیں ہمارا کام عدم تشدد ہے تو پھر ہم یہ پریڈیں کیوں کرتے ہیں۔ ہماری ان وردیوں سے کیا فائدہ اور پھر ہمارے یہ قواعد کس غرض کے لیے ہیں۔ تو اس لیے میں آپ کو اس بارے میں بتاتا ہوں کہ عدم تشدد کا مطلب نہیں ہے کہ ہم ہر کس و ناکس کے آگے ہاتھ باندھیں اور ہر ایک

ہمارے سروں پر پیر رکھے اور ہم سر نہ اٹھائیں۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے۔ کہ عدم تشدد کے راستہ پر ہم اس لیئے چل رہے ہیں کہ ہم کمزور ہیں، ہمارا بس نہیں چلتا اور جس وقت طاقت پکڑ گئے تو پھر ہم تشدد پر اتر آئیں گے یہ بات بالکل غلط ہے۔ ہم نے جو یہ چیز اختیار کی ہے تو یہ ہمارا اصول ہے ہمارا خدائی خدمت گاری کا راستہ ایک اصولی راستہ ہے۔ یہ چند روزہ نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ کے لیئے ہے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہ ہو گی۔ آج ہم کمزور ہیں۔ اور اگر کل ہم طاقت پکڑ گئے تو بھی عدم تشدد کا راستہ نہیں چھوڑیں گے اور آپ یہ بھی سمجھ لیں کہ عدم تشدد کمزور لوگوں کا کام نہیں ہے۔ ان اصولوں پر وہی قوم عمل کر سکتی ہے جو مضبوط قوم ہو اس کے ارادے مضبوط ہوں اور ایک مقصد ان کے سامنے ہو اس لیئے میں آپ سے کہتا ہوں کہ خدائی خدمتگاری کو سمجھیں اور اس کے اصول پہچانیں۔ میں نے پہلے بھی ایک مثال پیش کی تھی آج پھر بیان کرتا ہوں۔ گذشتہ جنگ عظیم میں جرمنی نے شکست کھائی تو ان سے تاوان جنگ طلب کیا گیا کچھ عرصہ تو تاوان دیتا رہا آخر بد حالی کی وجہ سے تاوان دینا بند کر دیا تو فرانسیسیوں نے اس کے عوض جرمنی کا کوئی علاقہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اور "رائن لینڈ" پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت جرمنیوں نے تشدد کے بجائے عدم تشدد پر عمل کیا اور وہاں کے عوام نے فرانس سے عدم تعاون کر دیا۔ مزدوروں نے کانوں، ملوں اور کارخانوں میں کام کرنا چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ کہ آخر تنگ آکر فرانس کو مجبوراً اس علاقے سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ اس لیئے میں کہتا ہوں کہ ایک طاقت ور قوم عدم تشدد کے ذریعے

بہ نسبت کمزور قوموں کے بہت جلد کامیابی حاصل کرسکتی ہے امید ہے اب آپ لوگ سمجھ گئے ہوں گے کہ عدم تشدد کمزور لوگوں کا کام نہیں چنانچہ اس بات کو اپنے دل سے نکال دو ——— رہی یہ بات کہ پھر یہ پریڈیں اور وردیاں کس لیئے ہیں۔ تو میں آپ کو سمجھاتا ہوں کہ جس طرح تشدد کی فوج ہوتی ہے اسی طرح عدم تشدد کی بھی فوج ہے اور ہماری یہ فوج ایک خدائی فوج ہے۔ اور اس کا عمل عدم تشدد ہے۔ اور یہ بات بھی سمجھ لو کہ ہر فوج کے اپنے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔ جس طرح تشدد کی فوج کی تربیت ہوتی ہے ان کو پریڈیں سکھائی جاتی ہیں اسی طرح عدم تشدد کی فوج کی بھی ایک پریڈ ہے اور اس کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ ہاں اتنی بات ہے کہ تشدد اور عدم تشدد کی فوج کی تربیت میں فرق ہے۔ تشدد کی فوج کا کام ظلم ہے۔ دوسروں کو قتل کرنا اور نفرت پیدا کرنا ہے۔ اور دکھ تکلیف پہنچانا ہے اور ہماری عدم تشدد کی فوج کا کام کسی کو دکھ تکلیف پہنچانا نہیں بلکہ زور اور ظلم برداشت کرنا اور اپنی جان قربان کرنا ہے خود مصیبت سے گزارا کرنا اور دنیا میں محبت پیدا کرنا ہے۔ جس طرح تشدد میں جاں ماری سکھائی جاتی ہے۔ اسی طرح ہماری فوج کو بھی تربیت دی جاتی ہے۔ کہ اپنے آپ میں صبر و تحمل اور محبت پیدا کریں۔

تشدد منفرت ہے اور عدم تشدد محبت ہے ——— میں آپ کو بتا دوں کہ کسی پر جبر اور زیادتی نہیں ہے۔ ہر شخص کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اس راستہ پر چلنے کو تیار ہے یا نہیں ——— یہ بات ہرگز اپنے خیال میں نہ لائیں کہ آپ میرے ساتھ نہ چلیں تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ یہ میرا کوئی ذاتی کام تو ہے

نہیں، قوم کی خدمت ہے۔ مجھے یہ راستہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں اس پر چل رہا ہوں۔ اگر آپ کو دوسرا راستہ بہتر معلوم ہو تو اس میں آزادی ہے جو کچھ آپ کا من چاہے کریں۔ میں نے تو جتنا غور کیا ہے۔ اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ عدم تشدد میں میری قوم کا بہت فائدہ ہے اور جو فائدے مجھے اس میں نظر آئے ہیں تو تشدد میں اس کے برعکس مجھے بہت سے نقصانات دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کسی کے خیال میں یہ راستہ صحیح نہ ہو اور اس کی نظر میں شکوک وشبہات ہوں تو وہ ہمارے ساتھ بالکل شامل نہ ہو اس لیئے کہ جن کے دلوں میں شکوک ہوتے ہیں وہ اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ پاتے وہ اکثر راستے ہی میں بھٹک جاتے ہیں اور میں ایسے ساتھیوں کو ساتھ لینے کے لیئے تیار نہیں جو نصف راستے سے واپس ہو جائیں۔"

باچاخان نے بار بار قوم کے سامنے اپنی عدم تشدد کی پالیسی کی پوری وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختلف مثالوں سے اسے واضح کیا ہے۔ اس کا مفہوم سمجھایا ہے۔ اور اس کے فوائد بتائے ہیں۔ تشدد اور عدم تشدد کا مقابلہ کیا ہے۔

وہ عدم تشدد کی جنگ کے قائل ہیں جس میں فتح ہی فتح ہے۔ کامیابی ہی کامیابی ہے۔ جس میں زور آور سے زور آور حریف کو طاقت ور سے طاقت ور دشمن کو بالآخر پسپا ہونا پڑتا ہے ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے۔ ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں۔

وہ عدم تشدد کو کمزوروں اور بزدلوں کا ہتھیار نہیں سمجھتے بلکہ بہادروں اور دلیروں کا حربہ خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ظلم وستم سہنا، دکھ برداشت کرنا، تکلیفیں اٹھانا ہر کس وناکس کا کام نہیں بلکہ بڑے اولوالعزم اور بلند حوصلہ لوگوں کا کام ہے۔ بزدل اور کم ہمت شخص تو ذرا سی اذیت بھی برداشت

نہیں کرسکتا۔ وہ تو فوراً بوکھلا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ گوناگوں آزمائشوں میں پڑنے اور حادثات سے دوچار ہونے پر بھی ہمت نہ ہارنا اور ثابت قدمی دکھانا ہی جواں مردوں کی شان ہے ای سے ان کی عظمت اجاگر ہوتی ہے اور اُن کے تدبر کا پتہ چلتا ہے۔

باچاخان عدم تشدد کے داعی ہیں۔ مخالفین نے ان پر الزام لگائے، انہیں مطعون کیا۔ ان کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہے لیکن انہوں نے کسی چیز کی پروا نہ کی اور اپنے موقف پر چٹان کی طرح ڈٹے رہے، مضبوطی سے قائم رہے وہ آج تک اپنے اس اصول پر قائم ہیں اور شاید اپنی زندگی کی آخری سانس تک قائم رہیں۔

باچاخان اور امن

باچاخان کی امن پسندی تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ عدم تشدد کے فلسفے کو مقصدِ حیات سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ پشتون قوم اور اپنی خدائی خدمتگار جماعت کو امن و آشتی کی تعلیم دی اور آئینی طور پر جدوجہد جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ آپ نے اپنے ماہانہ پرچے "پختون" میں بدامنی کے خلاف دو تین مضمون بھی لکھے۔ جن میں سے ایک مضمون کا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"آج میں اپنی قوم کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو بھی چاہیئے کہ اس مسئلہ پر غور کریں اگرچہ آگ ہمیشہ سوکھی لکڑیوں کو لگتی ہے۔ لیکن بعد میں گیلی لکڑیاں بھی جل اٹھتی ہیں۔ بعض لوگوں کا اگر یہ خیال ہے کہ ہم تو محفوظ ہیں اور دوسرے لوگوں سے ہمارا کیا کام، تو یہ خیال غلط ہے۔ اگر بدامنی کی یہ آگ اسی طرح لگی رہی اور آپ نے اسے فرد کرنے کی تجویز پر غور نہ کیا تو ایک مکان بھی جلنے سے محفوظ نہ رہ سکے گا اور ہماری قوم اور ملک تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ یہ کام صرف ایک آدمی کا نہیں ہے اور نہ ہی

میرے اکیلے کا ہے کہ میں اس پر سوچوں اور آپ کو سمجھاؤں۔ بلکہ یہ ساری پٹھان قوم کا فرض ہے کہ اس بات پر غور و فکر کرے اور اپنے آپ کو اور دیگر نا سمجھ پٹھان بھائیوں کو آگاہ کرے۔ آخر کب تک ہم اس بات سے غفلت کرتے رہیں گے۔ اور خاموشی سے بیٹھے تماشہ دیکھتے رہیں گے۔ اور یہ تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کرتے رہیں گے ہم جانور تو نہیں ہیں آخر انسان ہیں اشرف المخلوقات ہیں — اگر باعلم نہیں ہیں تو آنکھیں تو رکھتے ہیں ہمیں دنیا کی دیگر قوموں کو دیکھنا چاہیئے۔ کہ کس طرح وہ اپنے اپنے ملک میں آرام کی زندگی گزار رہے ہیں بعض لوگ اس کی ذمہ داری وزراء پر ڈالتے ہیں لیکن اکیلے وزیر کیا کر سکتے ہیں۔ جب تک کہ ان کے ماتحت سارے محکموں کے افسران اعلیٰ اور عملہ خلوص اور شوق سے تعاون نہ کریں۔ اکیلا انسان دنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وزراء کے ساتھ اگر ماتحت عملہ تعاون نہیں کرتا تو انہیں برطرف کیوں نہیں کیا جاتا۔ تو ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ وزراء انہیں برطرف تو کیا ان کی تنخواہوں میں سے ایک پیسہ بھی کم نہیں کر سکتے بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ وزراء کے ہاتھوں میں پوری طاقت ہے یہ بات بھی غلط ہے اصل طاقت تو گورنر کے ہاتھ میں ہے اگر گورنر راضی نہ ہو تو وزراء کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تو اس موقع پر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے پھر یہ بے روح وزارت کیوں قبول کی ہے — آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے وزارت سنبھالی تھی تو ان شرائط پر — اور حکومت برطانیہ نے وعدہ بھی کیا تھا کہ ملک و قوم کی اصلاح کرنے اور نظام حکومت چلانے

کے سلسلہ میں گورنر آپ کی امداد کرے گا۔ اب کہا جاتا ہے کہ گورنر نیک آدمی ہے لیکن اس کے ماتحت اس کی مرضی کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ یہ ضروری واقعات تھے جن سے میں نے آپ کو خبردار کیا۔ اب آپ اس طرف متوجہ ہوں اور ان مصیبتوں سے اپنی قوم کو نجات دلانے کے لیے جدوجہد کریں"

(عبدالغفار — اتمان زئی ۲۳ جنوری ۱۹۲۹ء)

انہیں اپنی قوم کی جہالت اور اس کی وجہ سے سرحد میں قتل، غارت اور لوٹ مار کا شدید احساس تھا۔ اور دراصل اسی احساس کے باعث آپ نے محض اصلاح کی غرض سے اور اپنے صوبے میں امن قائم کرنے کے لیے خدائی خدمت گار تحریک کی بنیاد رکھی۔

آپ امن پسندی کو دنیا کی تمام مشکلات کا حل سمجھتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے جنگ میں اتحادیوں کی امداد کرنے کا فیصلہ کیا تو صرف گاندھی جی نے اور آپ نے اس کی مخالفت کی اور آپ اپنی جماعت خدائی خدمت گار سمیت کانگرس سے مستعفی ہو کر الگ ہو گئے۔ اس لئے کہ یہ چیز آپ کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھی۔ آپ جنگ کرنے والوں یا ان کی مدد کرنے والوں دونوں کو امن کا دشمن سمجھتے ہیں۔ اور دنیا میں قیام امن کے لیے عدم تشدد کو سب سے ضروری چیز خیال کرتے ہیں۔

آپ ہمیشہ اپنی تقریروں میں لوگوں کو امن کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں دشمنوں کو فراخ دلی سے معاف کر دو۔ اور آپ خود بھی ایسا کرتے رہے۔ جو لوگ آپ کو برا بھلا کہنے میں پیش پیش رہے آپ نے اُن سے بھی کبھی کدورت نہ رکھی اور ہمیشہ انہیں محبت سے ملے۔

۱۹۵۴ء میں آپ چھ برس کے بعد رہا ہوئے اور پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے کراچی گئے۔ تو مسٹر غلام محمد مرحوم سابق گورنر جنرل نے آپ سے ایک ملاقات کے دوران اعتراف

کیا کہ آپ سے بے انصافی کی گئی ہے۔ اور خدشہ ظاہر کیا کہ آپ لوگ دل میں بغض نہ رکھیں۔ اور انتقام لینے کی کوشش نہ کریں۔ اس پر باچا خان نے کہا میں اور میری جماعت اس چیز کے سخت مخالف ہیں ہم اپنے دشمنوں کو ہمیشہ معاف کرتے آئے ہیں اور آپ کو بھی ہم نے معاف کر دیا ہے ہمارا دل صاف ہے۔ اس میں کسی کے خلاف بھی بغض و کینہ نہیں۔ اور ایک سچے مسلمان کا دل ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

باچا خان جیل میں

باچا خان نے ہر اعتبار سے اپنے آپ کو ایک مثالی شخصیت بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ناز و نعم میں پرورش پائی۔ لیکن سیاسی میدان میں قدم رکھتے ہی تکلفات کے تمام لبادے اتار کر پھینک دیئے۔ عیش و آرام کی زندگی کو ہمیشہ کے لیئے بھلا دیا اور یہ سب کچھ انہوں نے بعض دوسرے لیڈروں کی طرح محض نمائشی طور پر نہیں کیا۔ بلکہ اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ خلوت و جلوت میں ان کا ایک ہی رنگ نظر آیا۔ حتےٰ کہ جیل میں بھی وہ نہایت صبر و استقلال سے وقت گذارتے رہے۔

دراصل جیل ایک ایسی جگہ ہے جہاں انسان اپنے اصلی روپ اور حقیقی خدوخال میں سامنے آجاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگ وہاں جا کر بوکھلا جاتے ہیں۔ اور اپنا دماغی توازن برقرار نہیں رکھ سکتے۔

باچا خان جیل میں نہایت پُر امن وقت گذارنے کے قائل ہیں۔ وہ وہاں جھگڑا فساد کرنے کے سخت مخالف ہیں۔ جو لوگ جیل جا کر مشقت سے جی چراتے ہیں۔ جیل کے ملازمین سے ناجائز طور پر کام نکلواتے ہیں۔ انہیں رشوت دے کر سہولتیں حاصل کرتے ہیں۔ جیل کے افسروں سے خواہ مخواہ لڑتے جھگڑتے ہیں ——— باچا خان ایسے لوگوں کو بہت بُرا سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں سیاسی قیدی بڑی عظمت کا مالک ہوتا ہے۔ اسے جیل میں بڑے وقار، بڑی شرافت بڑی

عزت سے وقت گزارنا چاہیئے۔ اور کوئی ایسی کمزوری نہیں ظاہر کرنی چاہیئے۔ جس سے اس پر حرف آئے۔

وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ بعض لوگ جیل جانے کو بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ اور باہر کام کرنے سے جی چراتے ہیں۔ ایسے لوگ تحریک کے لیئے ہرگز مفید نہیں ثابت ہو سکتے۔ ہمارا اصل مقصد جیل جانا نہیں ہے۔ بلکہ کام کرنا ہے۔ انہوں نے ایسے لوگوں پر طنز کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں "جس وقت گرفتاریاں شروع ہوئیں تو ہمارا ایمان معلوم ہو جائے گا" ان کا خیال ہے جیسے صرف جیل جانے سے ہمیں آزادی مل جائے گی۔ حالانکہ اس کے لیئے قوم میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ باچا خان کہتے ہیں۔ میں خود جیل جانا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی خوشی سے وہاں جانے کو تیار ہوں۔ لیکن مجھے تو مجبوراً وہاں جانا پڑتا ہے۔ اس لیئے کہ میں کام کرتا ہوں۔ اس کام کے لیئے انگریز مجھے نہیں چھوڑتے اور جب میں باز نہیں آتا۔ تو وہ مجھے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی اگر اس طرح گرفتار ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ خالی خولی گرفتاری کا کوئی فائدہ نہیں۔

باچا خان کھری کھری باتیں کرنے کے قائل ہیں۔ وہ کبھی اپنی کوئی کمزوری نہیں چھپاتے انہوں نے خدائی خدمت گاروں سے صاف صاف کہا کہ ۱۹۳۲ء کی سول نافرمانی میں انہوں نے جو حماقتیں کی ہیں۔ ان سے تحریک کو کافی نقصان پہنچا ہے اور جو قدر و منزلت اس جماعت کی حکومت کی نظروں میں پہلے تھی۔ وہ اب نہیں رہی۔ اس لیئے کہ اس نے ہمارا عمل دیکھ لیا۔ اس نے ہماری کمزوریاں دیکھ لیں۔

انہوں نے ایسے خدائی خدمت گاروں پر کڑی نکتہ چینی کی جو محض فیشن کے طور پر جیل جاتے ہیں یا اس لیئے جاتے ہیں کہ انہیں سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔ اور اس کے ذریعہ پانچوں سواروں

شامل ہو کر ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں اور کنٹونمنٹ بورڈوں کی ممبری حاصل کر سکیں گے۔

باچا خان ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے ہنگامہ میں پہلی دفعہ چھ مہینے کے لیے جیل گئے ۱۹۲۱ء میں انہیں دوبارا تین برس کی سزا دی گئی۔ اسیری کے ان ابتدائی ایام میں باچا خان کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دنوں جیلوں کی حالت بھی نہایت ابتر تھی۔ خصوصاً سیاسی قیدیوں سے تو بہت ہی برا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔

باچا خان کو بھاری بیڑیاں پہنائی گئیں۔ آپ کے شباب کا زمانہ تھا۔ صحت مند نوجوان تھے۔ جیل کی کوئی بیڑی ان کے پاؤں میں نہ آتی تھی۔ آخر کسی نہ کسی طرح ایک بیڑی زبردستی چڑھا دی گئی۔ جس سے آپ کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ اور ٹخنوں سے خون بہنے لگا۔ لیکن اظہار ہمدردی کرنے کے بجائے جیل کے انگریز افسر نے مسکرا کر کہا "خیر ہے رفتہ رفتہ تم اس کے عادی ہو جاؤ گے"۔ اور واقعی وہ رفتہ رفتہ اس کے عادی ہو گئے۔

اس قید کے دوران میں قید تنہائی اور چکی کی سخت مشقت کی وجہ سے آپ شدید بیمار پڑ گئے۔ یہاں تک کہ آپ کا پچپن پونڈ وزن کم ہو گیا۔ چیف کمشنر نے آپ کو اس شرط پر رہا کرنا چاہا کہ آپ دیہات کے دورے بند کر دیں۔ لیکن آپ نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ جیل میں آپ نے جیل کے حکام کو اخلاقی تعلیم دینی شروع کی۔ جس کی وجہ سے ایک وارڈن جیل نے ملازمت چھوڑ دی۔ حکومت نے باچا خان کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا اور انہیں پنجاب کے کسی جیل میں منتقل کر دیا۔

انہوں نے کبھی جیل کے ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کی نہ کبھی مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ آپ فرماتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی قیدی نے مجھے گڑ لا کر دیا گڑ میرے پاس پڑا تھا کہ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ آگیا۔ اور مجھے وہ گڑ کمبل کے نیچے چھپانا پڑا۔ اس چیز کو میں نے بعد میں

بہت محسوس کیا اور آئندہ کے لیئے عہد کر لیا کہ کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا جس سے بعد میں ندامت اٹھانا پڑے۔ یا دل میں خوف اور ڈر پیدا ہو۔

باچا خان نے اپنی جیل کی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اپنی تقریروں میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ مضامین بھی لکھے ہیں۔ اور آپ کا ایک طویل مضمون "بیسویں صدی کی تہذیب اور جیل خانے" جو آپ کے پشتو پرچے "پختون" میں مسلسل کئی قسطوں میں چھپتا رہا ہے اس سلسلہ میں بڑا کارآمد اور مفید چیز ہے۔ اس میں انہوں نے مہذب اور متمدن ہونے کی دعوے دار انگریز قوم کے وحشیانہ مظالم اور سنگدلانہ سلوک کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے۔ میں اس مضمون کے چند اقتباسات یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ لکھتے ہیں:-

"آخر رمضان ختم ہوا اور عید کا چاند نظر آیا۔ لیکن غلام قوم کی کیا عید ہوگی۔ پھر ایک غریب قیدی کی ـــــ صبح ہوئی، سپاہی آیا۔ اس نے میری کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ تو میں نے اسے کہا مہربانی ہوگی اگر تم داروغہ صاحب کو اطلاع دو کہ آج عید کا دن ہے میرے لیئے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے عید کی نماز کے لیئے اجازت لے لیں۔ اور میں اپنی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا باہر کوئی شخص بھی نہ تھا جسے میں عید مبارک کہتا ـــــ بس تن تنہا بیٹھا رہا۔ اگرچہ جیل خانہ مسلمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ لیکن جس نمبردار اور سپاہی کی نگرانی مجھ پر تھی۔ وہ دونوں ہندو تھے۔ جیل خانے کا یہ عام قاعدہ ہے۔ کہ اگر قیدیوں پر اگر وہ ہندو ہوں تو مسلمان اور مسلمان ہوں تو ہندو پہرے دار مقرر کیے جاتے ہیں ـــــ ویسے تو کبھی کبھی سپرنٹنڈنٹ، داروغہ جیل اور ڈاکٹر صاحب تشریف لایا کرتے تھے۔ لیکن اس روز کوئی بھی نہ آیا۔

اور جب نماز عید کا وقت قریب آگیا تو میں نے پھر نمبردار سے کہا کہ آپ مہربانی کر کے داروغہ صاحب کو پھر اطلاع دیں کہ میری ادائگی نماز کے متعلق کیا فیصلہ ہوا ——— نمبردار غریب مارے ڈر کے جانے کو تیار نہ تھا۔ مختصر یہ کہ میں انتظار ہی کرتا رہا اور نماز عید کا وقت ختم ہوگیا۔

اس بات سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے سوچا کہ غلامی بھی کتنی بڑی چیز ہے۔ کہ ایک غلام کو اپنے مذہبی احکام پورے کرنے کے لیے بھی اجازت نہیں ملتی ——— سارا دن یوں ہی گزر گیا۔ اور اس بوڑھے ہندو نمبردار کے سوا میں نے اور کسی کی شکل نہ دیکھی۔ جب شام قریب ہوئی تو ایک سپاہی آیا اور مجھے اپنی کوٹھری میں بند کر کے چلا گیا اور ساری رات یوں ہی غم و فکر میں گذر گئی۔

بہت سے سادہ لوح اور انگریز دوست مسلمان کہتے ہیں کہ انگریز کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتے۔ ان کے راج میں ہر قسم کی مذہبی آزادی ہے۔ لیکن وہ آزادی کہاں ہے۔ بے شک اس مذہب کو آزادی ضرور ہے جو ان کے مفاد کو نقصان نہ پہنچاتے۔

صبح سپرنٹنڈنٹ صاحب آئے تو مجھ سے بات چیت کرنے لگے باتوں باتوں میں میں نے ان سے کہا کہ آپ تو فرماتے ہیں کہ ہم کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیتے اور ہندوستان میں مذہبی آزادی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آپ نے کل مجھے نماز عید ادا کرنے کی اجازت تک نہ دی ——— سپرنٹنڈنٹ صاحب مجھے کیا جواب دیتے۔ انہوں نے کوئی

بہانہ بنانے کے بجائے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ حکومت بمبئی سے پوچھنا پڑے گا۔ اگر اس نے اجازت دے دی تو آئندہ ہم آپ کو ہرگز منع نہیں کریں گے۔ میں نے کہا جب دوسرے قیدی نماز پڑھتے ہیں تو مجھے کیوں روکا جاتا ہے۔ وہ میری بات کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اور چلے گئے۔ دراصل وہ ڈرتے ہیں کہ دوسرے قیدی مجھ سے متاثر نہ ہوں"

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"چونکہ میں بالکل اکیلا تھا۔ میرے ساتھ بات چیت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اور خوراک کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ اس لیے میں نے دو تین مرتبہ داروغہ، سپرنٹنڈنٹ اور ڈاکٹر سے کہا کہ اپنا کھانا مجھے خود تیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ جیل کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا ——— میرے لیے کوئی کام نہیں تھا سارا دن بیکار پڑا رہتا۔ میں چاہتا تھا کہ کھانا پکانے کی اجازت مل گئی تو میں مصروف ہوں گا۔ اور غم غلط ہوتا رہے گا۔ میں نے جیل کے حکام سے یہ بھی کہا کہ میں زمینداری اور باغبانی کا کام سمجھتا ہوں۔ اور ہزاری باغ جیل میں میں نے کافی تجربہ حاصل کیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ مجھے اس قسم کا کوئی کام دے دیجئے۔ اس سے ایک تو میرا جی بہلا رہے گا۔ دوسرا یہ کہ آپ کے لیے باغ بنا دوں گا۔ اور بہت سی سبزیاں، ترکاریاں لنگر کے لیے اگا دوں گا لیکن مجھے وہ لوگ ایک ہوا سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اپنے حلقے

سے نکلا تو قیدیوں میں مجھے دیکھتے ہی ایک نیا قومیت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔

میرا کام چرخہ چلانا تھا۔ کافی وقت میں یوں ہی گذارتا لیکن چرخہ چلانے سے بھی میں تفکرات سے جان نہ چھڑا سکتا۔ میری صحت آہستہ آہستہ خراب ہوتی گئی۔ اور آخر شدید بیمار پڑ گیا —— جیل خانے کا قاعدہ یہ ہے۔ کہ جو قیدی بیمار ہو جائے۔ اُسے ہسپتال لے جاتے ہیں اور ہر قیدی کو چارپائی ملتی ہے لیکن میرے لیئے نہ چارپائی تھی نہ ہسپتال —— ہسپتال مجھے اس لیئے نہیں لے جاتے تھے۔ کہ میرا خطرناک اور متعدی سیاسی مرض کہیں دوسرے قیدیوں کو نہ لگ جائے۔ میں اپنی کوٹھڑی ہی میں زمین پہ پڑا رہا۔ اسی طرح رات گزر گئی۔ صبح ڈاکٹر آیا اس نے دیکھ کر کہا دوائی بھجوا دوں گا۔ میں نے کہا مجھے ہسپتال میں داخل کریں تو بہتر ہو گا۔ لیکن اس نے کہا کہ وہ سپرنٹنڈنٹ کی اجازت کے بغیر یہ کام نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔ اور میں یوں ہی پڑا رہا۔ بخار بڑھتا گیا۔ اور میری حالت خراب ہوتی گئی اگلے روز شام کے قریب جیل کے وزیٹر اپنے ایک مسلمان ساتھی کے ساتھ آئے وہ احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام سید قادری صاحب تھا اور وہ ایک پنشن یافتہ سیشن جج تھے۔ انہوں نے میری خراب حالت دیکھ کر بڑی حیرانی ظاہر کی کہ مجھ سے اتنا خراب سلوک کیا جا رہا ہے —— میں نے اُن سے کہا اس کے ذمہ دار آپ ہیں اس لیئے کہ آپ نے

میری طرح کے ہندو قیدی بھی دیکھے ہوں گے جن کے ساتھ میری نسبت بہت اچھا سلوک ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک بیدار قوم کے افراد ہیں۔ ان میں نوکری پیشہ لوگ ہیں یا پنشن یافتہ، امیر ہیں یا غریب — سب کے سب بیدار ہیں۔ اس لیے ان کے قیدیوں کی جیل میں بھی قدر ہوتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں کہ اپنے قومی خادموں سے کسی قسم کی ہمدردی کریں۔ اس لیے انگریز مسلمان رہنماؤں سے ایسا خراب سلوک کرتے ہیں اس لیے کہ وہ اس خدمت سے تنگ جائیں اور کوئی دوسرا قومی کاموں کا نام نہ لے۔

قادری صاحب میری حالت اور جیل والوں کی لاپروائی سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے میری باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور چلے گئے۔ جاتے جاتے صرف اتنا کہا، خدا آپ پر رحم کرے، —— میں زمین پر پڑا بخار میں جل رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد ایک قیدی چارپائی لے آیا۔ اور میری کوٹھڑی میں ڈال کر مجھے اس پر لٹا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بھی قادری صاحب کی کوشش سے ہوا ہے۔ اب شام ہونے لگی مجھے فکر ہوئی کہ رات کیسے کٹے گی۔ میں نے بڑھے نمبردار کو جیلر کے پاس بھیجا کہ اُسے کہو مجھے ہسپتال نہیں لے جایا جاتا تو ایک شخص دیا جائے۔ اس نے آکر کہا ہسپتال کی اجازت نہیں البتہ رات کے لیے دو آدمی مل جائیں گے۔ چنانچہ رات اسی مختصر کوٹھڑی میں میرے ساتھ دو قیدی اور نمبردار کو بند کر دیا گیا۔ میں تمام رات بے آرام رہا۔ رات کے آخری حصے میں پسینہ آیا اور میرے

تمام کپڑے بھیگ گئے۔ اس پسینے سے قدرے بخار کی شدت کم ہوئی اور میں سو گیا۔

صبح چھوٹا ڈاکٹر آیا اور کہا ابھی میں بڑے ڈاکٹر کو خبر کرتا ہوں کل اتوار کا دن تھا۔ اس لیے وہ آئے ہی نہیں۔ میں نے کہا لیکن میں تو پرسوں سے بیمار ہوں۔ اگر مجھ جیسے قیدی سے آپ کا یہ سلوک ہے۔ تو دوسروں کے ساتھ کیا ہوگا۔ تھوڑی دیر میں بڑے ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے۔ پوچھا آپ کو کیا تکلیف ہے۔ میں نے سارا حال سنایا پھر اس نے نسخہ لکھا اور دونوں چلے گئے۔ کافی دیر بعد کمپونڈر آیا۔ اس کے پاس عزفرون اور بھاپ لینے کے لیے ایک پانی کا برتن تھا۔ اس برتن میں ربڑ کی ایک نالی لگی ہوئی تھی۔ اس نے وہ نالی میرے منہ میں رکھ دی اور کہا بھاپ کھینچو۔ لیکن وہاں بھاپ تھی ہی نہیں اس لیے کہ پانی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں سوچنے لگا قیدیوں کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے۔ ورنہ عقل تو یہی کہتی ہے۔ کہ یہاں سے ایک قیدی کو بھی زندہ نہیں جانا چاہیئے"

کچھ دنوں بعد جرنیل دورے پر آئے تو بابا خان نے ان سے اپنی تکلیفات بیان کیں کہ انہیں اس جگہ کی آب و ہوا راس نہیں۔ جرنیل نے انہیں پنجاب یا سرحد کے کسی جیل میں بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔ کوٹھڑی سے باہر سونے کی اجازت بھی دے دی۔ اور ایک پٹھان خدمتی بھی دیا۔

یہ پٹھان قیدی اگرچہ تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن ایک عرصہ کی تنہائی کے بعد اس ساتھی کے ملنے سے آپ بہت خوش ہوئے کیونکہ کم از کم بات چیت کرنے کی صورت پیدا ہو گئی تھی

پھر ایک دن انہیں سپرنٹنڈنٹ نے بتایا کہ پنجاب اور سرحد کے جیل والوں نے انہیں لینے سے انکار کر دیا ہے۔

باچا خان انفلوئنزا کے مرض سے صحت یاب ہوئے تو کانوں میں پھنسیاں نکل آئیں۔ جن کے درد اور تکلیف نے کافی دنوں آپ کو بہت پریشان کیا۔

باچا خان اسی مضمون میں آگے چل کر ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"قید اور جیل خانوں سے مجھے کافی فائدہ پہنچا ہے میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں نے گرفتار نہ کیا ہوتا اور بار بار قید نہ کیا ہوتا تو میں کبھی بھی اس قابل نہ ہوتا کہ میں خدا کی مخلوق کی کچھ خدمت کرتا اور نہ ہی ایسا علم اور عقل مجھے حاصل ہوتی اور نہ ہی اتنی معلومات اور تجربات ہوتے ---- ہر وقت اور ہر بار جب بھی میں جیل گیا ہوں میں نے اس سے کافی فائدے اٹھائے ہیں اور اپنی عادات اور کمزوریوں کی اصلاح کی ہے اور جب جیل سے باہر آیا ہوں تو نئے نئے سبق سیکھ کر ساتھ لایا ہوں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ جیل خانہ شعور، علم اور تزکیۂ نفس کے لیے ایک بہت بڑا مدرسہ ہے۔ بشرطیکہ کوئی اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے میرا تو یہ تجربہ ہے کہ جیل خانے میں جتنی تکلیفیں اور مصیبتیں مجھ پر نازل ہوئی ہیں میں تو ان ہی کی وجہ سے اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرنے میں کامیاب ہوا ہوں ویسے تو میرے بہت سے بھائی جیل گئے ہیں اور انہوں نے کافی تکلیفیں بھی برداشت کی ہیں لیکن رہائی کے بعد ان کے اخلاق میں اصلاح نہیں ہوئی

اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جیل جانے کو ہی بڑی قربانی تصور کیا اور فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے وہاں ذاتی آرام و آسائش کے لیے جھگڑوں ہی میں سارا وقت گذارا اور اپنی کمزوریوں کی اصلاح کے لیے ہرگز کوشش نہیں کی۔"

باچا خان کے متعلق یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ وہ جیل کے حکام سے لڑنے جھگڑنے کے خلاف ہیں۔ اور ان کی جیل کی زندگی میں بہت کم مواقع ایسے آئے جب اس کی نوبت آئی ہو۔ ابتدا میں دو چار مرتبہ حکام جیل سے آپ کی اس بات پر جھڑپیں ہوئیں کہ آپ کی ملاقات کے لیے جو لوگ آتے آپ ان سے پشتو میں باتیں کرتے اور حکام مصر تھے کہ یہ باتیں اردو میں کی جائیں۔ نتیجہ یہ کہ آپ نے ملاقاتیں کرنے سے ہی انکار کر دیا۔

اس کے علاوہ آپ نے جتنا وقت بھی جس جس جیل میں گذارا وہاں کے حکام نے آپ کی ہمیشہ تعریف کی اور آپ کے صبر و استقلال اور خوش اخلاقی کا اعتراف کیا۔

باچا خان بحیثیت مسلمان

ایک دفعہ ڈاکٹر خان صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے تو انہوں نے مسکرا کر کہا:۔

"میرے حصے کی نمازیں بھی باچا خان ہی پڑھ لیتے ہیں"

گاندھی جی نے کہا تھا:۔

"باچا خان اتنا پکا مسلمان ہے کہ میں نے واردھا کے قیام کے دوران میں کبھی انہیں نماز قضا کرتے نہیں دیکھا"

مہادیو ڈیسائی کی رائے تھی:۔

"میں جتنے مسلمان دوستوں سے ملا ہوں ان میں سے کسی

کو بھی باچا خان سے زیادہ ایمان دار اور سچا مسلمان

تو کیا ان کے برابر بھی نہیں پایا؟

سیّد سبط حسن لکھتے ہیں:۔

"جب راقم نشتر کی جیل کے شاہی وارڈ میں داخل ہوا

تو دیکھا کہ باچا خان زمین پر میلے کچیلے بچھائے عشار کی نماز

میں مصروف ہیں۔ سر پر جیل کا تولیہ بندھا ہے۔ مٹی

رنگ کا کرتہ اور پاجامہ زیب تن ہے۔ اور اوپر ایک

کھدر کی روئی دار صدری ہے۔ ان کا رنگ جو کسی زمانے

میں شہابی تھا پیلا پڑ گیا تھا۔ چہرے اور ہاتھوں پر

جھریاں اور بڑھ گئی تھیں۔ وہ سجدے میں جھکتے تو ایک

ہاتھ کمر پر رکھ لیتے اور جب سجدے سے اٹھتے تو کرب

سے ان کے ماتھے پر لاتعداد شکنیں ابھر آتیں۔ وہ

بیمار تھے:

باچا خان کی زندگی پر نظر کی جائے تو ایک چیز جو سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ نماز و روزہ کی پابندی ہے۔ ان کے قریبی ساتھیوں کا کہنا ہے۔ کہ اپنی اس مصروف زندگی میں کسی مرحلے پر بھی انہوں نے نماز قضا نہیں کی۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انہوں نے حج بھی کیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ نمود و نمائش کے قائل نہیں اس لیے آج تک کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

انہوں نے قرآن شریف پڑھا ہے، تفسیر پڑھی ہے۔ احادیث کی کتابیں پڑھی ہیں اور مذہبی

اور اسلامی کتب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ خصوصاً سیرت نبوی پر ان کی گہری نظر ہے۔ اور نبی کریم ؐ اور صحابہؓ کرام کے اسوہ پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں

باچا خان کی سادہ زندگی، سادہ خوراک، سادہ لباس، سادہ مزاج، سادہ رہن سہن سادہ طور طریقے سب کے سب تعلیم اسلامی کے مظہر ہیں۔

وہ دین اسلام کو ایک سچا اور آخری مذہب سمجھتے ہیں اور رسول اکرم ؐ کو ہادی برحق اور پیغمبر آخر الزمان مانتے ہیں۔ اور قرآن حکیم کی تعلیمات کو انسان کی نجات کا واحد ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

انہوں نے ابتدا ہی سے اسلامی اصولوں پر اپنی خدائی خدمت گار تحریک کی بنیاد ڈالی اس وقت پشتون قوم کو تجارت کا شعور نہیں تھا۔ اور چند سرمایہ دار سارے صوبے کی تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ آپ نے پشتونوں کو تجارت کی طرف مائل کیا۔ اور ان سود خور ہندو بنیوں کی سخت مخالفت کی۔

آپ نے انگریزی تعلیم کی بھی مخالفت کی۔ اور آزاد قومی مدرسے قائم کرکے ان میں اسلامی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔

جب انگریزوں نے خدائی خدمت گار تحریک کو کچلنے کا تہیہ کر لیا۔ اور بعض دوستوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ اسے کسی دوسری جماعت میں مدغم کرنے سے ہی اس کا بچاؤ ہو سکتا ہے۔ تو سب سے پہلے آپ نے مسلم لیگ اور دوسری تنظیموں کے پاس آدمی بھیجے تاکہ ان سے بات چیت کی جائے لیکن جب انہوں نے اعتنا نہ کی تو مجبور ہو کر کانگرس کی دعوت قبول کرکے اس کے ساتھ الحاق کر لیا۔

آپ نے تحریک ہجرت میں نہ صرف سرگرمی سے حصہ لیا بلکہ خود بھی سب کچھ چھوڑ کر اور اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہہ کر ہجرت کی۔

آپ خلافت کمیٹی کے صدر رہے۔

آپ نے جلال جمر کمیٹی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اور اس کے علاوہ آپ ہر اسلامی تحریک میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

آپ کی تحریک خدائی خدمت گار کا جھنڈا سُرخ ہے جو اسلامی نشان ہے اور اس کے نعرے ہمیشہ "اسلام آزاد" "قرآن آزاد" وغیرہ رہے ہیں۔

آپ کی تحریک کا نام "خدائی خدمت گار" بجائے خود اسلامی روح کا مظہر ہے۔

خدا پر ان کا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی وہ کبھی نہیں ڈگمگائے چنانچہ جب ۱۰ دسمبر ۱۹۳۴ء کو آپ کو واردھا میں گرفتار کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

"یہ سب خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ جب تک اس نے مجھ سے باہر کام لینا تھا باہر رکھا۔ اب اس کی مرضی ہے کہ میں جیل کے اندر خدمت کروں تو میں جیل جا رہا ہوں۔ جس بات میں وہ خوش ہے۔ اسی میں میں بھی خوش ہوں۔"

آپ نے اپنی تقریروں میں اکثر قرآن حکیم کی آیات مقدسہ احادیث کے حوالے دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"خدا نے قرآن پاک میں صاف ارشاد فرمایا ہے کہ میں دنیا میں ان لوگوں کو خوش حال رکھتا ہوں اور یہ بھی فرمایا ہے کہ میں اس قوم سے ملک لیتا ہوں جو ظالم ہو۔ اپنی قوم پر جبر و ظلم کرے۔ جس میں انصاف نہ ہو۔ ایسے لوگ مجھے بھول جاتے ہیں مجھے چھوڑ دیتے

رہیں تو پھر میں بھی انہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ اور اپنی رحمت سے انہیں محروم کر دیتا ہوں۔"



"کام کاج ہمارا محض فرض ہی نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے۔ رسول پاکؐ فرماتے ہیں "الکاسب حبیب اللہ" جو کوئی کسب کرتا ہے خدا اسے دوست رکھتا ہے۔"



"اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ اے لوگو تم مجھ پر ایمان لائے ہو تو ایسی باتیں مت کرو۔ جو تم نہیں کرتے ہو اس لیئے کہ خدا کے نزدیک یہ بڑا جرم ہے کہ انسان جو کچھ کہے اس پر عمل نہ کرے۔"



"خدائے پاک کا ارشاد ہے کہ ہر واقعہ کے لیئے ایک انصاف ہے، ایک احسان ہے — انصاف یہ ہے کہ تمہیں اگر کوئی تھپڑ مارے تو تم بھی اُسے تھپڑ مارو، تمہارے بھائی کو کوئی قتل کرے تو تم اُسے قتل کرو — لیکن احسان یہ ہے کہ اگر تم پر کوئی زیادتی کرے تو تم اُسے معاف کر دو۔ اور احسان انصاف سے بہتر ہے۔ جو شخص کسی کو معاف

کر دے تو خدا کے نزدیک اس کا بہت بڑا درجہ ہے"

☆

"ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسولؐ نے اپنے صحابہ سے پوچھا تم کس آدمی کو بہادر سمجھتے ہو۔ صحابہ نے جواب دیا اُسے کہ جسے جنگ میں کوئی گرا نہ سکے — آپ نے فرمایا نہیں ایسا نہیں ہے۔ بہادر وہ شخص ہے کہ غصّے میں بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔"

☆

"مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں اگر آپ سارا قرآن پڑھ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا۔ کہ قرآن پاک نے انسان کے لیئے ایک خاص تصوّر قائم کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد رحمت اور محبت پر رکھی گئی ہے۔ ایک حدیث شریف ہے کہ اللہ پاک کی رحمت ان لوگوں پر ہے جو مخلوق خدا پہ رحم کرتے ہیں۔ قرآن شریف کی ایک آیت کا ترجمہ ہے۔ کہ خداوند کریم کی محبت اس شخص کے ساتھ ہے جو اپنا قہر ہضم کر لیتا ہے۔ اور خدا کی مخلوق کو معاف کر دیتا ہے۔"

☆

رُوحانیت

باچا خان کو رُوحانیت سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ بار بار اس کا اظہار کرتے ہیں کہ خدائی خدمت گار تحریک ایک رُوحانی تحریک ہے۔ لیکن وہ پیری مریدی یا خانقاہی درویشی کے قائل نہیں اسی لیئے ساتھ ہی ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ تم پیر سمجھ کر میرے ہاتھ چومو، پاؤں پڑو اور میری پوجا کرنے لگو۔ بلکہ میں تو تم سے عمل اور صرف عمل چاہتا ہوں۔ وہ اپنی تحریک کو روحانی تحریک اس لیئے کہتے ہیں کہ وہ اس کے ذریعے اپنی قوم کے باطن کی صفائی کرنا چاہتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کے پیرو :-

جھوٹ کہنا ترک کر دیں

ایک دوسرے کی بُرائی نہ کریں

غیظ و غضب کا شکار ہو کر ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچائیں

نماز روزے کی پابندی کریں

تعلیم کے حصول کا شوق پیدا کریں۔

ہر ایک سے محبت سے پیش آئیں

بے مزد خدمتِ خلق کریں۔

ساری دنیا کے انسانوں کو ایک نظر سے دیکھیں۔

سادہ اور بے تکلف زندگی اختیار کریں

حلال روزی کمائیں اور کسی کے مال کی طرف بُری نظر سے نہ دیکھیں۔

متقی اور پرہیز گار بنیں۔

آزاد رہ کر جینا اور آزاد رہ کر مرنا سیکھیں۔

خود ان کی اپنی زندگی میں ابتدا ہی سے انہوں نے تزکیۂ نفس کے لیئے جدوجہد شروع

کی اور مسلسل مجاہدے سے اسے ایک اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچایا۔ اس تزکیہ نفس نے ان میں ایسی روحانی کشش اور جاذبیت پیدا کر دی۔ اور ان کی شخصیت میں ایسا جادو بھر دیا کہ لوگ ان کی طرف خود بخود کھچے گئے۔

باچا خان کی شخصیت کو عظیم بنانے میں ان کی روحانیت کو بڑا دخل ہے۔ آج تک میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو ایک دفعہ ان سے ملنے کے بعد ان کی شخصیت سے متاثر نہ ہوا ہو۔

مہاتما گاندھی سے ملنے اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد باچا خان کو ان سے جو عقیدت اور اُنس پیدا ہوا وہ اسی روحانی کشش کا باعث تھا۔ گاندھی جی بھی اسی لیے باچا خان کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ دونوں روحانی شخصیتیں تھیں جس طرح گاندھی جی کے مخالفین بھی ان کی سیاسی شخصیت کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ان کی روحانی شخصیت سے انکار نہیں کرتے اسی طرح باچا خان کی روحانیت کے بھی دوست دشمن سبھی قائل ہیں بلکہ بعض لوگ تو گاندھی جی اور باچا خان دونوں کو محض روحانی رہنما ہی مانتے ہیں اور ان کی سیاسی زندگی کو بھی روحانیت ہی کا ایک پہلو سمجھتے ہیں۔

باچا خان نفس کشی پر زیادہ زور دیتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ خواہشات نفسانی ترک کر کے ہی انسان اپنی معراج کو پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو کسی چیز کی عادت نہیں ڈالی۔ صرف چائے کی عادت تھی وہ بھی چھوڑ دی باقی لے دے کر ایک کھانے کی عادت ضرور ہے لیکن اس کی بھی یہ حالت کہ بسا اوقات دن میں ایک دفعہ اور بعض اوقات اس کی پابندی سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

وار دھا کے قیام کے دوران میں گاندھی جی سے ان کی سیاسی گفتگو بہت کم ہوتی۔ بلکہ

زیادہ تر روحانی صحبتیں ہوتیں۔ ان دنوں وہ آپس میں کوئی بات نہ کرتے بلکہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے خاموشی سے بیٹھ کر عبادت میں مصروف رہتے۔ باچا خان وہاں روزانہ صبح آشرم جاتے جہاں گاندھی جی سے رامائن سنتے، صبح و شام پرارتھنا میں شریک ہوتے اور بھجن سنتے۔

یہ صحبتیں کتنی پیاری، کتنی دل کش ہوں گی کچھ وہی لوگ اسے محسوس کر سکتے ہیں جو اس دور سے گذرے ہوں جس مذاق کا بھی آدمی ہو اسے اپنے ہم مذاق شخص سے مل کر کتنی تسکین، کتنی خوشی، کتنی راحت ہوتی ہے۔ باچا خان نے بھی وہ عرصہ جو گاندھی جی کی صحبت میں گزارا، شاید وہ ان کی زندگی کے سب سے قیمتی دن تھے لیکن احساس فرض کا یہ عالم تھا۔ کہ ان میٹھی اور روح پرور صحبتوں میں بھی وہ اپنے فرائض سے غافل نہ رہے۔ اور گاندھی جی کی اجازت سے کر بنگال اور دوسرے علاقوں کے دورے کرتے رہے۔

آپ نے قرآن حکیم کے علاوہ گیتا، گرنتھ شریف اور انجیل مقدس کا مطالعہ بھی کیا۔ ان کا قول ہے کہ آپس کے میل ملاپ اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیئے ضروری ہے کہ ہم دوسرے مذاہب والوں کی مذہبی کتابیں پڑھیں۔ انہیں قریب سے دیکھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

آپ بہت بڑے سیاسی لیڈر ہیں۔ آپ کا سارا وقت ہنگاموں میں گزرتا ہے لیکن تنہائی آپ کو اتنی مرغوب ہے کہ جتنا وقت بھی ممکن ہو بچا کر آپ تنہائی میں گذارتے ہیں۔ جہاں عبادت الٰہی اور ذکر و اذکار میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ چیز آپ کی روحانی غذا ہے اور اس کے بغیر آپ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اخلاق

باچا خان اخلاقی طور پر بہت بلند الشان ہیں وہ دنیا میں کسی سے نفرت نہیں کرتے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ نفرت کر ہی نہیں سکتے۔ اپنے دشمنوں سے بھی محبت سے ملتے ہیں اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔ ان کا کردار

بہت بلند ہے۔ اتنا بلند کہ آج تک کسی کو انگشت نمائی کی جرأت نہیں ہوئی۔ وہ خود حسن اخلاق کا مجسمہ ہیں اور اپنے پیروؤں کو ہمیشہ اپنے اخلاق بلند کرنے پر زور دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"خدائی خدمت گار تحریک ایک مذہبی، اخلاقی اور سیاسی تحریک ہے۔ اس کی غرض بنی نوع انسان کی خدمت اور ان میں محبت، خلوص، ہمدردی، رواداری اور برادرانہ جذبہ پیدا کرنا ہے۔ ہر خدائی خدمت گار کا فرض ہے کہ وہ قتل، رہزنی، ڈاکہ، بے حیائی، شراب نوشی اور ہر قسم کی بداخلاقی سے اجتناب کرے، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، چغل خوری، حسد، پارٹی بازی، انتقام لینا اس تحریک کے پاک اصولوں کے خلاف ہے خدائی خدمت گار کو چاہیئے کہ وہ خود غرضی، مکر و ریا، حرص و لالچ، خواہشات نفسانی اور غرور و نخوت سے پرہیز کرے۔ کیونکہ یہ بدعادتیں انسان کی بدترین دشمن ہیں۔"

ان کی خواہش تھی کہ اپنے تمام پیروؤں کو اخلاق حمیدہ کا نمونہ بنا دیں۔ اور وہ اس کے لیے اپنی انتہائی کوشش کرتے رہے۔ اپنی تحریر، تقریر اور عام گفتگو میں ہمیشہ لوگوں کو اخلاقی تعلیم دینے کا کوئی موقع بھی وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کے متعلق تو ہم کوئی زیادہ امید افزا رائے نہیں دے سکتے۔ لیکن اتنی بات تو ہمارے مشاہدے میں آئی ہے کہ کم از کم ان کی موجودگی میں کسی خدائی خدمت گار کو بھی گرٹ

شراب پینے، نسوار پھانکنے یا کسی قسم کی بھی کوئی غیر اخلاقی حرکت کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی یہاں تک کہ مہمانوں کو کوئی چائے یا کھانے کے متعلق بھی نہیں پوچھ سکتا۔

باچا خان کی رواداری

باچا خان ایک روحانی آدمی ہونے کی وجہ سے کافی وسیع الخیال واقع ہوئے ہیں آپ تمام مذاہب کا احترام کرتے ہیں ان کے رہناؤں کو مانتے ہیں۔ اور کسی مذہب کے پیروؤں کی دل آزاری یا دل شکنی کرنے کو بہت بڑا جرم سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کے بنیادی اصول یکساں ہیں۔ البتہ فروعات میں فرق ہے کیونکہ ہر مذہب میں اس ملک کی رنگت ہے جہاں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ مثلاً فرماتے ہیں:۔

"ایک سادہ سی مثال لیجئے۔ اسلام اور ہندو دھرم دونوں میں صفائی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ صفائی کے مسئلہ میں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں لیکن عمل میں تھوڑا فرق ہے۔ اسلام میں خشک مسواک کرنے کا حکم ہے۔ اور ہندو دھرم میں سبز داتن کا ـــــ اسلام میں جب غسل واجب ہو اس وقت غسل کرنے کا حکم ہے۔ لیکن ہندو دھرم میں روزانہ یا دن میں کئی بار اشنان کرنا لازمی ہے۔ ان باتوں سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ چونکہ ہندو دھرم نے وہ آریہ میں جنم لیا ہے جہاں پانی کی افراط تھی اس لیئے اس نے روزانہ غسل کی تعلیم دی۔ اور اسلام ایک ایسے ریگستان سے شروع ہوا۔ جہاں اکثر

پانی کا ملنا محال تھا۔اس لیئے اس نے حسب ضرورت
غسل کا حکم دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اگر کوئی
مسلمان روز غسل کرے یا برش مسواک استعمال کرے تو اسلام
سے خارج ہے۔ عمل کے معاملہ میں مختلف مذاہب میں
جو فرق ہے اس سے محض مقامی حالات کے اختلاف کا
پتہ چلتا ہے۔ کوئی اصولی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیئے
میں کسی کے مذہب میں کیوں دخل دوں۔ یہ تو ناممکن ہے
کہ ساری دُنیا کا ایک مذہب ہو جائے۔ ہر قوم بہر حال اپنے
ہی مذہب سے ہدایت حاصل کرے گی اس لیئے ایک
قوم کا دوسری قوم کے مذہب میں دخل دینا بے کار ہے"

یہی نہیں بلکہ ایک دفعہ گاندھی جی نے باچا خان سے ڈاکٹر خان صاحب کی انگریز بیوی کے متعلق پوچھا کہ آیا وہ مسلمان ہوگئی ہے یا نہیں تو انہوں نے کہا وہ باقاعدہ مسلمان نہیں ہوئی اور اس کی ضرورت بھی کیا ہے اسے اس کی پوری آزادی حاصل ہے کہ اس کا جو عقیدہ بھی ہو اس کی پیروی کرے میں نے کبھی اس معاملہ میں دخل نہیں دیا آخر خاوند اور بیوی اپنے اپنے مذہب کے کیوں نہ پابند رہیں اور شادی تبدیلی مذہب کا باعث کیوں ہو۔

باچا خان کو مذہبی تفریق اور تعصب سے سخت نفرت ہے اس سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں شمولیت کے لیئے گئے وہاں ایک ہندو ممبر جو انکے ساتھ جیل میں رہ چکا تھا اسے پیاس لگی اور اس نے پانی پینا چاہا۔ وہاں اتفاقاً پانی پینے کا برتن موجود نہ تھا۔ باچا خان نے اپنے لوٹے سے اس کے ہاتھوں پر پانی ڈالا

اور جب آپ اسے اس طرح پانی پلا رہے تھے تو کسی نے ان کا فوٹو لے لیا اور وہ تصویر "ٹربیون" اخبار میں چھپ گئی۔ چنانچہ مخالفین نے اس چیز کو خوب اچھالا۔ اور آپ کے خلاف نہایت زہریلا پروپیگنڈا کیا۔ انہوں نے خدائی خدمت گاروں سے کہا کہ "دیکھو یہ تمہارے پٹھانوں کا لیڈر ہے جو ایک ہندو کو پانی پلاتا ہے۔"

باچا خان نہایت تعجب سے کہتے ہیں کہ آج تک ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ آخر خدا کی مخلوق سے کسی کو پانی پلانے میں کیا قباحت ہے اور اسے بعض عقل کے اندھے گناہ اور جرم کیوں سمجھتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ قرآن پاک میں صاف لکھا ہے کہ دنیا کی ہر قوم کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہادی بھیجے اور وہ سب اہل کتاب تھے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کو اس سے محروم رکھا گیا ہو۔ عام لوگ ہندوؤں کو اہل کتاب اس لیے نہیں مانتے کہ ان کی کتابوں کے نام قرآن شریف میں نہیں ملتے ——— باچا خان کہتے ہیں قرآن شریف میں جو نام درج ہیں وہ محض تمثیلی ہیں۔ اس میں دنیا کی تمام قوموں، ان کے پیغمبروں اور ان کی مقدس کتابوں کی مکمل فہرست کیونکر مرتب کی جا سکتی تھی۔

اسی طرح ایک تقریر میں فرماتے ہیں :-

"رسول کریم کی یہ حدیث آپ نے پڑھی ہو گی "خیر الناس من ینفع الناس ——— دنیا میں بہت ہی قابل عزت اور بہتر انسان وہ ہے جو انسانوں کو فائدہ پہنچائے۔ آپ غور کریں تو اس حدیث شریف میں 'ناس' کہا گیا ہے۔ اور 'ناس' صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ اس سے مراد خدائے پاک کی تمام مخلوق ہے

باچا خان بحیثیت صحافی اور ادیب

باچا خان کو ادب و صحافت سے بڑی رغبت ہے اور قوم کی ترقی کے لیے ملک میں آزاد صحافت کی ضرورت کا نہایت شدت سے احساس ہے خصوصاً پشتو زبان میں صحافت کی کمی کو وہ بری طرح محسوس کرتے ہیں انہیں گلہ ہے کہ پشتون قوم کا متمول طبقہ اور انگریزی خواں نوجوان اپنی زبان و ادب کی ترقی سے یکسر غافل ہیں اس لیے جہاں بعض نوعمر زبانوں میں کئی کئی روزنامے اور ہفتہ وار پرچے نکل رہے ہیں وہاں پشتو ایسی قدیم زبان میں ابھی تک اس کے امکانات مسدود نظر آتے ہیں۔

باچا خان نے اپنی گوناگوں سیاسی مصروفیات کے باوجود پشتو زبان و ادب اور صحافت کی ترقی کے لیے بھی حتی المقدور کام کیا ہے۔

انہوں نے سب سے پہلے ۱۹۲۸ء میں اپنا مشہور ماہانہ پشتو مجلہ پختون کا اجرا کیا جس کی سرپرستی وہ خود کرتے تھے اور ادارت کے فرائض پشتو کے مشہور شاعر محمد اکبر خادم مرحوم کے سپرد تھے۔

اس وقت سرحد میں پشتو کا یہ پہلا ماہنامہ تھا اور اس میں پشتو کے تمام مشہور ادیب لکھتے تھے۔ یہ پرچہ ۱۹۳۰ء میں باچا خان اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد بند ہو گیا۔

مئی ۱۹۳۱ء میں پختون کا نیا دور شروع ہوا۔ اب اس کے مدیر عبدالخالق صاحب خلیق مقرر ہوئے جو پشتو کے منجھے ہوئے ادیب ہیں۔ دسمبر ۳۱ء کا پرچہ تیار تھا کہ ۲۵ر دسمبر کو عام گرفتاریاں ہوئیں اور یہ پرچہ پھر بند ہو گیا۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں اسے پھر خلیق صاحب کی ادارت میں جاری کیا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں اس سے حکومت نے ضمانت طلب کر لی اور مجبوراً اسے بند کرنا پڑا۔

اپریل ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت میں پھر اس کا اجراء عمل میں آیا اور قیام پاکستان کے بعد بند ہو گیا۔

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک یہ پرچہ دس روزہ رہا، ۱۹۴۵ء میں ہفت روزہ کر دیا گیا۔

اس کی اشاعت دو ہزار سے چار ہزار تک رہی۔ پہلے دوسرے اور تیسرے دور میں اس کا دفتر اتمان زئی میں رہا۔ بعد میں سردریاب منتقل کر دیا گیا۔ اس کے اداریے اکثر باچا خان خود لکھا کرتے تھے۔

"پختون" کو پشتو صحافت اور ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ باچا خان خاص طور سے اس پرچے میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ اس میں زیادہ تر سیاسی مضامین ہی ہوتے تھے۔ خدائی خدمت گار تحریک کی خبریں، باچا خان کی تقریریں، ملک کے سیاسی رہنماؤں کی بعض اہم تقریروں کے تراجم وغیرہ لیکن کبھی کبھی کوئی ادبی، تاریخی اور تحقیقی مضمون یا مقالہ بھی منظر عام پر آجاتا تھا۔

اس پرچے کو مقبول بنانے کے لئے باچا خان کو کافی کام کرنا پڑا۔ آپ فرماتے ہیں شروع شروع میں جب کسی سے میں اس میں دلچسپی لینے کے متعلق کہتا۔ وہ یہی جواب دیتا کہ "باچا خان یہ آپ کس بکھیڑے میں پڑ گئے ہیں اپنا وقت ادھر ضائع نہ کیجئے اس سے کیا فائدہ ہوگا"۔ آپ نے بتایا کہ انگریزوں نے پشتو کے "دوزخی زبان" ہونے کا اتنا وسیع پروپیگنڈا کیا کہ بیگانے تو بیگانے اپنے بھی اس سے متنفر نظر آتے تھے۔ لیکن آخر رفتہ رفتہ پڑھے لکھے لوگ اس میں دلچسپی لینے لگے۔ اور اس کی اشاعت کافی بڑھ گئی۔ اس پرچے کو خدائی خدمت گار تحریک کے ترجمان کی حیثیت حاصل تھی اور تحریک کو پھیلانے بڑھانے اور مضبوط بنانے کے لیے یہ بڑا مفید ثابت ہوا۔

باچا خان نہ ادیب ہیں نہ انہیں اس کا دعوے ہے۔ لیکن ان کی تحریروں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اگر انہیں ادب کی طرف توجہ دینے کا موقع ملتا۔ تو ایک اچھا ادیب بننے کی

صلاحیت ان میں پائی جاتی تھی۔ ان کی تحریر نہایت سادہ، شستہ اور بے تکلف ہوتی ہے جس میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی مثالیں دے کر آپ اسے دل چسپ بنا دیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"قوم کی مثال ایک درخت کی ہے۔ جس میں کئی شاخیں ہوتی ہیں۔ اگر درخت کی جڑ تازہ ہو تو شاخیں ہری ہوں گی ورنہ مرجھا کر رہ جائیں گی۔ دنیا کی ترقی یافتہ قومیں ہمیشہ اس درخت کی جڑوں کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن ہمارا خیال جڑ کی طرف نہیں بلکہ ہر شاخ اپنے آپ کو جڑ سمجھتی ہے اور یہی ہمارے تنزل کا باعث ہے۔"

آپ نے خاص طور پر کوئی ادبی مضمون کبھی نہیں لکھا۔ البتہ آپ نے مختلف اوقات میں جیل سے جو خطوط اپنے ساتھیوں کے نام لکھے ہیں انہیں ہم ادب کا شاہکار نہیں تو کم از کم اچھے خاصے ادبی نمونوں کے طور پر ضرور پیش کر سکتے ہیں —— آپ بائیکلہ جیل بمبئی سے ۱۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو مہاتما گاندھی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"پیارے مہاتما جی سلامت رہیے۔

آج مجھے اس جیل خانہ میں تین دن ہو چکے ہیں۔ لیکن آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ کل میرا ارادہ تھا کہ آپ کو خط لکھوں لیکن آپ نے جو مجھ پر بیان نہ دینے کی پابندی عائد کی ہے سارا دن میں اس پر غور کرتا رہا۔ کیونکہ یہ میرے لیے بالکل ایک نئی چیز ہے۔

آج صبح میں نے آپ کو خط لکھنے کا فیصلہ کیا لیکن آپ کو کیا لکھوں۔ میں اس جگہ کے حالات سے پوری طرح باخبر نہیں ہوں۔ ایک کوٹھڑی میں بند ہوں، نہ میں کسی سے بات کر سکتا ہوں نہ کوئی مجھ سے — نہ میں کسی کو دیکھ سکتا ہوں نہ ہی کوئی میرے قریب آ سکتا ہے۔ اس لیے یہ بہتر ہو گا کہ میں آپ کو اپنے ہی حالات لکھوں۔ لیکن اس سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے آپ کہیں یہ رائے نہ قائم کر لیجئے گا کہ میں یہاں پر تنگ ہوں — میں بالکل خوش ہوں بلکہ اس قید کو تزکیۂ نفس کے لیے اکسیر سمجھتا ہوں۔

میں ایک کوٹھڑی میں تنہا بند ہوں جس کے سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ ہے۔ جس کا بیرونی حصّہ لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں سے بند ہے میں جب صبح و شام برآمدے میں ٹہلتا ہوں تو مجھے چڑیا گھر یاد آ جاتا ہے اور ان جانوروں کی طرف میرا دھیان پلٹ جاتا ہے جو کہ لوہے کے پنجروں میں بند ہوتے ہیں اور ادھر سے اُدھر ٹہلتے رہتے ہیں۔ میں یہاں صرف ایک وقت روٹی کھاتا ہوں اس لیے نہیں کہ دوسرے وقت کھانا کھانے کی مجھے اشتہا نہیں ہوتی بلکہ وہ مجھے دیتے ہی نہیں — آج کل رمضان شریف کا مہینہ ہے۔ سحری کے لیے مجھے کھانا نہیں ملتا۔ جیل والے کہتے ہیں کہ سحری کے کھانے کے لیے جیل مینول میں کوئی قانون نہیں ہے۔

میں زمین پر سوتا ہوں، سارا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں وقت

کافی ہے۔ لیکن پڑھنے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں —— زیادہ
وقت عبادت میں گزارتا ہوں اور مطمئن ہوں۔"

آپ کا عبدالغفار

باچا خان کا ایک اور خط عبداللہ خان ایم ایل اے کے نام ہے جو ۱۱ نمبر سنگرۂ
کے پختون میں شائع ہوا ہے اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"پیارے بھائی عبداللہ خان صاحب
السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا خط چند دن ہوئے موصول ہوا۔ میں آپ کو جلد ہی جواب دینا چاہتا تھا لیکن فرصت نہ مل سکی۔ آپ نے جو اعتراض کیا ہے میں ان باتوں سے ناراض نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہوں۔ میرا معاملہ پیری مریدی کا نہیں ہے اور نہ ہی یہ میرا کوئی ذاتی کام ہے کیونکہ گلے شکوے تو ہمیشہ ذاتی معاملات میں پیدا ہوتے ہیں۔ میں اس قسم کے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جن کے دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ۔ اس قسم کی پارٹی دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی اور اگر کچھ کامیابی حاصل بھی کرے تو وہ چند روزہ ہوتی ہے۔

جس تشدد کا ذکر قرآن پاک میں ہے اور رسولؐ کے زمانہ میں جتنی جنگیں بھی لڑی گئیں وہ سب مدافعانہ تھیں۔ ان کے بعد مسلمانوں میں یا دوسری قوموں میں جو جنگیں ہو رہی ہیں وہ جارحانہ ہیں۔ میں اس تشدد کو ناپاک کہتا ہوں اور میں نے جو آپ کو لکھا تھا تو اسی لئے ہی

مطلب تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے خط میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ عدم تشدد ہماری آزادی کے لیے ایک بہترین ہتھیار ہے۔ یعنی آپ کو یقین ہے کہ اس کے ذریعے ہم آزادی حاصل کر سکتے ہیں لیکن یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی کہ آزاد ہونے کے بعد ہم اپنے ملک کو عدم تشدد پر کاربند رہتے ہوئے دوسری قوموں سے کس طرح بچا سکیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح ہم یہ چیز عدم تشدد کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اسے اس کے ذریعے سنبھال بھی سکتے ہیں۔ چونکہ ہمارے دماغ تشدد سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے ابھی یہ بات آسانی سے ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی ہے

اس کے علاوہ بھی باچا خان کے بہت سے ایسے خطوط ہیں۔ جن میں بعض ادبی شہ پارے مل جاتے ہیں لیکن یہاں طوالت کے خدشے سے صرف انہی دو پر اکتفا کرتا ہوں۔

باچا خان کے مختلف نام

باچا خان کا اصلی نام عبدالغفار خان ہے۔ لیکن ان کے عقیدت مند انہیں مختلف ناموں سے پکارتے ہیں چونکہ وہ اپنی قوم میں ایک قابل فخر ہستی سمجھے جاتے ہیں اس لیے انہیں لوگوں نے فخر افاغنہ کا خطاب دے رکھا ہے۔ اور عموماً آپ کے نام کے ساتھ شروع ہی سے فخرِ افاغنہ کا القاب لکھا جاتا ہے۔

دوسرا القاب آپ کا سرحدی گاندھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ آپ گاندھی جی کے بہت قریب رہے ہیں۔ اور آپ نے ان کے اصولوں کو بھی بدرجہ اتم اپنایا ہے۔ خصوصاً ان

کے عدم تشدد کے اصول کو تو آپ نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنی زندگی کو بھی سادگی اور بے تکلفی کے اعتبار سے بہت حد گاندھی جی کی زندگی کا نمونہ بنا رکھا ہے۔ اس لیئے آپ کا یہ القاب بہت مشہور تھا۔ مخالفین آپ کو طنزاً "سرحدی گاندھی" کہتے تھے اور اپنے ساتھی محبت اور عقیدت کی وجہ سے اس نام سے یاد کرتے تھے لیکن انہوں نے یہ القاب اپنے لیئے پسند نہ کیا اور ۷ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کو ایک اعلان کے ذریعہ اپنے پیروؤں کو منع کر دیا کہ وہ ان کے نام کے ساتھ آئندہ "سرحدی گاندھی" نہ لکھا کریں یہ اعلان ملاحظہ ہو:-

"مجھے لوگ سرحدی گاندھی کہتے ہیں۔ مگر مجھے یہ پسند نہیں۔ جب مہاتما گاندھی موجود ہیں تو ملک میں بہت سے گاندھیوں کی ضرورت نہیں میرا بھی یہی خیال ہے جیسا کہ گاندھی جی نے کہا ہے کہ اگر ملک میں بہت سے گاندھی ہو گئے تو وہ آپس میں لڑ پڑیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ لوگ مجھے سرحدی گاندھی کہنا اور لکھنا بند کر دیں گے"

بعض ان پڑھ خدائی خدمت گار آپ کو "سرخ پوش بابا" بھی کہتے ہیں اور چونکہ آپ ہمیشہ ننگے سر رہا کرتے ہیں۔ اس لیئے "سرتور بابا" (ننگے سر والا بابا) کے نام سے بھی آپ مشہور ہیں۔ اسی طرح آپ کا قد از بسکہ کچھ غیر معمولی طور پر لمبا ہے۔ اس لیئے آپ بعض حلقوں میں "گوڑ بابا" (لمبے قد والا بابا) بھی کہلاتے ہیں۔

لیکن جتنی شہرت آپ کو باچا خان کے نام سے ہوئی اتنی کسی اور نام سے نہیں ہو

سکی: باچا پشتو میں سید یا سردار کو کہتے ہیں اور بادشاہ کے مفہوم میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ آپ پشتون قوم کے سردار بھی ہیں اور وہ آپ کو اپنا بے تاج بادشاہ بھی سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ کے اس نام کو بڑی شہرت ہوئی اور سرحد اور بیرون سرحد میں عموماً آپ اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اگرچہ آپ نے اپنی ایک تقریر میں لوگوں کو یہ نام استعمال کرنے سے بھی روکنا چاہا۔ کیونکہ آپ کو شاہی سے نفرت ہے لیکن لوگ باز نہ آئے۔ باچا خان فرماتے ہیں۔

"آپ کہتے ہیں کہ ہم نے فخر افغان کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا ہے۔ یعنی نام کے لیے تو آپ نے مجھے بادشاہ بنا لیا۔ لیکن عجیب بات ہے۔ کہ میری ایک بات بھی نہیں مانتے ہیں کچھ کہتا ہوں اور آپ کچھ کرتے ہیں —— یاد رکھئے ہماری یہ جدوجہد اس لیے ہے کہ اپنی قوم سے بُری عادتیں دُور کریں۔ اس لیے نہیں کہ آپ مجھے بادشاہ بنائیں یا کسی دوسرے کو —— کسی کو بادشاہ بنانے سے قوم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچتا۔ آپ اپنے ملک کے اردگرد نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ایسی قومیں بھی ہیں جن پر ایک شخص کی بادشاہی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چند آدمی تو مزے کر رہے ہیں اور باقی ساری قوم بھوکی ننگی بدحال اور غیر تعلیم یافتہ ہے۔ ہماری اس تحریک کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہم کسی کو بادشاہ نہیں بناتے اور نہ ہی آپ مجھے بادشاہ بنائیں۔ کیونکہ اس طرح تو میرے بال بچوں کے مزے ہوں گے اور آپ کا کیا بنے گا؟ ہم تو ایسی حکومت کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس میں قوم کا ہر فرد بادشاہ ہو۔"

باچا خان کے لطیفے

باچا خان اس قدر سنجیدہ واقع ہوئے ہیں کہ خلوت وجلوت میں کبھی ان سے کوئی غیر سنجیدہ حرکت سرزد نہیں ہوتی اور ان کی طبیعت میں مزاح کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کبھی کبھی طبیعت موج پر آئے۔ تو وہ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو اچھے خاصے لطیفے ہوتے ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں:۔

"میں جب ۱۹۳۷ء میں چھ سال کی نظر بندی و
جلا وطنی اور قید و بند کے بعد وطن آیا تو اور تو
اور خود اکثر خدائی خدمت گاروں نے مجھ سے
آکر پوچھا۔ باچا خان کیا یہ سچ ہے کہ آپ گائے
کو ذبح نہیں کرتے؟
ہاں ــــ میں نے کہا
کیوں؟ ــــ انہوں نے پھر پوچھا
اس لیے کہ میرا باپ قصائی نہ تھا۔

باچا خان کے ایک دوست کو باتوں باتوں میں کہیں پتہ چلا کہ آپ نے حج بھی کیا ہے۔ اس نے کہا پھر آپ اپنے نام کے ساتھ الحاج کیوں نہیں لکھتے؟

انہوں نے کہا ــــ خدا نے حج مجھ پر فرض کیا ہے۔ جس طرح نماز روزہ فرض ہے پھر میں اپنے نام کے پیچھے آگے نمازی اور روزہ دار کیوں نہ لکھوں۔

ان ہی دنوں خواجہ ناظم الدین جن کے نام کے ساتھ باقاعدگی سے الحاج لکھا جاتا تھا۔ اپنے عہدے سے ہٹا دیئے گئے اور ساتھ ہی اخبارات نے انہیں الحاج لکھنا بھی چھوڑ دیا

بابا خان اپنے دوست کو مخاطب کرکے بولے

"دیکھا آپ نے اپنے الحاج کا حشر — اب بیچارے

خالی خواجہ ناظم الدین رہ گئے ہیں اور شاید کچھ دنوں

تک خواجگی بھی چھن جائے۔"

ایک دفعہ انہوں نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا:۔

"بعض لوگ جیل اس لیئے جاتے ہیں کہ چلو سال دو گزار لیں گے

تاکہ قومی خدمت اور قربانی کی سند مل جائے۔ کیونکہ یہ

سرٹیفکیٹ پاس ہوگا تو کل کو ڈسٹرکٹ بورڈ، میونسپلٹی، اسمبلی اور

دوسرے بورڈوں کی ممبری کے لیئے کھڑا ہو سکوں گا۔"

آپ مہاتما گاندھی کو بمبئی جیل سے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں ایک کوٹھڑی میں تن تنہا بند ہوں۔ جس کے سامنے ایک

چھوٹا سا برآمدہ بھی ہے۔ جس کا بیرونی حصّہ لوہے کی موٹی موٹی

سلاخوں سے بند ہے۔ میں جب صبح و شام برآمدے میں ٹہلتا

ہوں تو مجھے چڑیا گھر یاد آجاتا ہے۔ اور ان جانوروں کی طرف

میرا دھیان پلٹ جاتا ہے جو کہ لوہے کے پنجرے میں بند

ہوتے رہیں۔ اور ادھر سے ادھر ٹہلتے رہتے ہیں۔

اسی طرح اپنی گرفتاری کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"اٹک کا پل پار کرتے ہی پنجاب پولیس نے مجھے حراست میں لے لیا میں ایک درخت کے سائے میں بستر بچھا کر بیٹھ گیا اتنے میں ایک سکھ کانسٹیبل میرے پاس آیا اور کہنے لگا ہم بڑے خوش نصیب ہیں کہ آپ کے درشن کیئے۔ میں نے کہا —— سردار جی میں بھی اپنے آپ کو کچھ کم خوش قسمت نہیں سمجھتا۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں:-

"جب سرحد میں کانگرس وزارت تھی تو ایک خدائی خدمت گار آتا اور کہتا "میرا تو وظیفہ نہ لگا" دوسرا کہتا "میں تو ٹرک کا جمعدار نہ بنا" میں نے کہا اگر تم ٹرک کے جمعدار نہیں بنے تو کیا میں بن گیا ہوں

باچا خان پر اعتراضات اور اُن کا جواب

باچا خان پر ان کے مخالفین جو اعتراضات کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کافی سنگین الزامات ہیں لیکن باچا خان خود ہی وقتاً فوقتاً ان کے جواب دیتے رہے ہیں اس لیئے ہم اپنی طرف سے کسی قسم کی صفائی پیش

کہنے کی بجائے مناسب سمجھتے ہیں کہ ہر اعتراض کے جواب میں ان کا اپنا بیان ہی پیش کر دیں

پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ باچا خان کے عدم تشدد کے حربے سے بہادر پشتونوں کے وہ جوہر چھین لیئے جو صدیوں سے ان کا طرۂ امتیاز چلے آئے ہیں۔

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے باچا خان فرماتے ہیں :۔

"عدم تشدد کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہر کس و ناکس کے سامنے ہاتھ باندھیں۔ اور ہر ایک ہمارے سروں پر پیر رکھے اور ہم سر نہ اٹھائیں۔ عدم تشدد کمزور لوگوں کا کام نہیں ان اصولوں پر وہی قوم عمل کر سکتی ہے جو مضبوط ہو۔ ان کے ارادے مضبوط ہوں اور کوئی بڑا مقصد ان کے سامنے ہو۔"

"عدم تشدد کی جنگ کوئی نئی چیز نہیں یہ جنگ وہی ہے۔ جو آج سے چودہ سو سال پہلے ہمارے رسول اکرمؐ نے مکّہ کی زندگی میں لڑی تھی۔"

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ وہ پاکستان کے مخالف ہیں اور بعض پاکستان دشمن طاقتوں سے ان کی ساز باز ہے۔ باچا خان کا جواب ملاحظہ ہو۔

"میں پاکستان کے نظریہ کا کبھی مخالف نہ تھا۔ لیکن پاکستان کے بارے میں میرے اپنے تصورات قدرے مختلف تھے۔ مسلمانوں کے وطن کا میرے ذہن میں جو تصور تھا اس کے تحت پنجاب اور بنگال کی تقسیم کسی طرح ممکن نہ تھی۔"

"۱۹۴۸ء میں جب پاکستان پارلیمنٹ کے اجلاس میں پہلی بار میں شریک ہوا تو میں نے اعلان کیا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ پاکستان ہم

سب کا مشترکہ ملک ہے اگر برسراقتدار طبقہ ملک کی خدمت کا خواہش مند ہے تو ہم ہر مطلوبہ طریق پر اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔"

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ باچا خان پٹھانستان چاہتے ہیں اور پشتون علاقے کو پاکستان سے جدا کر کے افغانستان سے ملانے کے خواہش مند ہیں۔

باچا خان کا بیان ہے :۔

"نواب زادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے پوچھا کہ پٹھانستان سے میرا مطلب کیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ یہ پٹھانستان نہیں بلکہ پختونستان ہے۔ اور یہ صرف ایک نام ہے۔ انہوں نے پھر دریافت کیا کہ یہ نام کس قسم کا ہے؟ اس پر میں نے کہا کہ جس طرح پنجاب، بنگال، سندھ بلوچستان پاکستان کے صوبوں کے نام ہیں اسی طرح یہ بھی پاکستان کے ڈھانچے کے اندر ایک نام ہے۔ ہمیں کمزور کرنے کے لیے انگریزوں نے اپنے عہد اقتدار میں ہمارے عوام کے حصے بخرے کر دیئے اور ہمارے علاقے کا نام تک مٹا دیا۔ ہم اپنے پاکستانی مسلمان بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ براہ کرم وہ اس ناانصافی کا ازالہ کریں جو انگریزوں نے ہمارے ساتھ کی ہے۔ پٹھانوں کو متحد کریں اور ہمیں پنجاب کی طرح ایک نام دیں۔ کیونکہ جب بھی پنجاب کا نام لیا جاتا ہے تو لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ اس سے مراد وہ علاقہ ہے جہاں پنجابی بستے ہیں۔ اسی طرح بنگال، سندھ اور بلوچستان سے ان علاقوں کا تصور ذہن میں آجاتا ہے ہم بھی صرف اسی طرح کا ایک نام پاکستان کے ان علاقوں

کے لئے چاہتے ہیں جہاں پشتون رہتے ہیں "

چوتھا اعتراض ہے کہ وہ پنجابیوں کی مخالفت کرتے اور صوبائی تعصب اور نفرت پھیلاتے ہیں جیسا کہ باچا خان کی تقریروں کے اقتباسات سے ظاہر ہے وہ ہمیشہ نفرت، تعصب بغض اور عداوت کے خلاف اور محبت کے مبلغ رہے ہیں۔ تقسیم سے پہلے وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی اور رنگ و نسل اور مذہب کی تفریق کے سب سے بڑے مخالف تھے اور اب بھی اس تنگ نظری اور تنگ دلی سے وہ کوسوں دور ہیں۔ پھر ایسے شخص سے نہ جانے اس بات کی کیونکر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے پنجابی مسلمان بھائیوں کی مخالفت کرے اور ان کے خلاف نفرت پھیلائے۔

دراصل ان کی اینٹی یونٹ تحریک کے سلسلہ میں جو سرگرمیاں تھیں حکمران طبقہ نے اسے روکنے اور باچا خان کو بدنام کرنے .... کے لئے یہ بہانہ تراشا اور ان پر یہ من گھڑت الزام لگایا۔

ایک جلسے میں راقم نے باچا خان کو اپنی تقریر کے دوران میں یہ الفاظ کہتے سنا۔

"اگر ہمارا حکمران طبقہ سمجھتا ہے کہ پنجابی ایک یونٹ کے حق میں ہیں۔ تو وہ پنجاب ہی میں ایک یونٹ پر رائے شماری کرائے۔ اگر وہاں یونٹ کے حق میں اکثریت نے فیصلہ دے دیا تو ہم ایک یونٹ کو بلاچون وچرا تسلیم کر لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے وہاں بھی ناکامی ہو گی۔ کیونکہ پنجاب کے عوام بھی یونٹ کے حق میں نہیں ہیں "

اس کے بعد اب حال ہی میں جیل سے رہا ہوتے ہی انہوں نے فرمایا۔

"میری صحت خراب ہے جونہی میں صحت یاب ہو گیا لاہور واپس آکر سابق صوبہ پنجاب کے قصبات اور دیہات کا دورہ کروں گا اور برسراقتدار لوگوں نے میرے خلاف پروپیگنڈے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے اس سلسلہ میں عوام پر اپنی پوزیشن کی وضاحت کروں گا!"

ون یونٹ کی مخالفت

باچا خان پر آخری الزام یہ لگایا گیا ہے کہ ایک یونٹ کی مخالفت کے پردے میں مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنا چاہتے ہیں صوبائی تعصب پھیلاتے ہیں اور پاکستانی مسلمانوں کی یکجہتی گوارا نہیں کرتے۔

شمال مغربی سرحدی صوبے نے ۱۹۰۱ء میں جنم لیا۔ اس سے پہلے یہ علاقہ پنجاب سے ملحق تھا۔ اسے علیحدہ طور پر صوبائی حیثیت دلانے کے لئے یہاں کے باشندوں نے کافی جدوجہد کی اور بھاری قربانیاں دیں۔

قیام پاکستان کے بعد بھی یہ حد بندی اسی نہج پر چلتی رہی۔ لیکن ۱۹۵۶ء کے اوائل میں حکومت پاکستان نے تمام مغربی پاکستان کا ایک یونٹ بنانے کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا اور اس ایک یونٹ میں مغربی پاکستان کے تمام صوبوں سندھ، پنجاب، بلوچستان اور صوبہ سرحد کو مدغم کر دیا گیا۔

حکومت کی طرف سے اس نئے تجربے کی توجیہہ یہ پیش کی گئی۔

مسلمانوں میں یکجہتی پیدا ہو گی

صوبائی عصبیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پسماندہ علاقوں کو ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔

حکومت کو اخراجات میں کافی کفایت ہو جائے گی۔

حکومت کا نظم و نسق آسان اور بہتر ہو گا۔

باچا خان کا کہنا تھا کہ یہ تجربہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حکومت اور عوام دونوں کو اس سے پریشانی کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ انہوں نے کہا ایک یونٹ کے قیام سے مغربی پاکستان کے مسلمانوں کی یک جہتی پر کاری ضرب پڑے گی ہر علاقے کے لوگوں کو اپنی حق تلفی کا شدید احساس ہو گا۔ اور اس طرح صُوبائی عصبیّت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جائے گی۔

انہوں نے با اختیار لوگوں کے اس خیال کی بھی مخالفت کی کہ ایک یونٹ میں پسماندہ علاقے ترقی کریں گے۔ باچا خان نے اپنی تقریروں میں واضح طور پر بتایا کہ ایک یونٹ میں اخراجات کم ہونے کے بجائے بہت زیادہ بڑھ جائیں گے اور پسماندہ علاقوں کی ترقیاتی سکیمیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ نیز اتنے بڑے علاقے کا نظم و نسق قائم رکھنا دشوار ہو جائے گا۔

چنانچہ وہی ہُوا جو باچا خان کہہ رہے تھے ابھی ایک یونٹ بنے ایک سال بھی نہیں گزرا لیکن مغربی پاکستان کی ایڈمنسٹریشن عملی طور پر فیل ہو چکی ہے۔ حکومت اقتصادی بوجھ کے نیچے دبی جا رہی ہے اور صُوبائی تعصّب ختم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا جا رہا ہے بلکہ اب تو یہ زہر حکومت کے دفتری نظام میں سرایت کر رہا ہے۔ جو حقیقتاً ایک نہایت خوفناک اور افسوسناک چیز ہے۔

آج سندھی، پنجابی، سرحدی کوئی بھی خوش نظر نہیں آتا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ بے انصافی کا رونا رو رہا ہے ایک دوسرے کو غاصب سمجھ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو مشکوک اور مشتبہ نظروں سے گھور رہے ہیں۔

جہاں تک فروگذاشتوں اور کمزوریوں کا تعلق ہے۔ ہم بھی باچا خان کو اس سے مبرّا نہیں

سمجھتے اور انہیں خود بھی اس چیز کا اتنا شدید احساس ہے کہ ہمیشہ اس کا اظہار کرتے رہے۔

باچاخان آخر انسان ہیں فرشتے نہیں ہیں اور بھول چوک انسان سے ہو ہی جاتی ہے ہر انسان میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اور بحیثیت انسان کے باچاخان میں بھی کچھ نہ کچھ کمزوریاں ضرور ہوں گی لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان کی خوبیوں کے مقابلے میں ان کی کمزوریوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

دوست تو دوست دشمن بھی اس بات کے ضرور قائل ہیں کہ باچاخان ایک مضبوط کردار کے انسان ہیں، با اصول ہیں، بلند حوصلہ ہیں، سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ قوم کے خیر خواہ ہیں، عوام میں ہر دلعزیز ہیں۔ سامراج دشمن ہیں، جمہور دوست ہیں ملک و قوم کی آزادی کے لئے انہوں نے بیش بہا قربانیاں دی ہیں اور صوبہ سرحد کے طول و عرض میں آج جو تھوڑا بہت سیاسی شعور لوگوں میں نظر آتا ہے۔ یہ زیادہ تر انہی کی مسلسل جدوجہد اور تگ و دو کا نتیجہ ہے۔

اب انکی اتنی ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ اگر ان میں تھوڑی بہت کمزوریاں بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر پائی گئی ہوں تو انہیں ہمیں تقاضائے بشریت پر محمول کرنا چاہیئے۔ ان کی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے بحیثیت سوانح نگار ہم نے ان فروگذاشتوں پر پردہ ڈالنے کی ہرگز کوشش نہیں کی۔ اس لئے نہیں کہ اس کے بغیر ہم اپنے فرائض سے پوری طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے تھے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ان چند ایک کمزوریوں کے باوجود ان کی شخصیت میں اتنی ساری خوبیوں کا جمع ہو جانا ہم ان کی عظمت کی دلیل سمجھتے ہیں۔

باچا خان اور ڈاکٹر خان صاحب

باچا خان اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر خانصحب سے سات برس چھوٹے ہیں لیکن شہرت قبولیت اثر و سوجھ بوجھ اور عظمت کے اعتبار سے ان سے بہت بڑے ہیں پشتونوں کی روایات اور اسلامی تعلیم کے مطابق آپ اپنے بڑے بھائی کی بڑی عزت کرتے ہیں چنانچہ سابرمتی جیل احمد آباد سے انہوں نے ڈاکٹر خان صاحب کے نام ایک خط لکھا تو اس میں انہیں "پیارے دادا" کے القاب سے مخاطب کیا پشتو میں "دادا" بزرگ یا باپ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہ خط ملاحظہ ہو۔

پیارے دادا سلامت رہو

اُمید ہے میم صاحبہ کی طبیعت اب اچھی ہوگی، اس جگہ کی آب و ہوا اور قید تنہائی کی وجہ سے میری طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے مگر اللہ میرے وجود سے اپنی مخلوق کی کچھ خدمت لینا چاہتا ہے تو وہ میری صحت اچھی کر دے گا۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ خدا جو بھی کرتا ہے میرے فائدے کے لیے .... اس لیے کہ میں دیکھتا ہوں کہ مجھ میں بہت ہی کمزوریاں ہیں اور آہستہ آہستہ ان کی اصلاح ہو رہی ہے اسمبلی کے ختم ہونے تک اگر میری بدلی پنجاب میں ہو گئی تو آپ سرحد جاتے ہوئے مجھے دیکھتے جائیں اور اگر میری بدلی نہ ہوئی تو پھر یہاں تشریف لانے کی تکلیف نہ کریں اس لیے کہ ایک تو اس موسم میں یہاں شدید گرمی ہوتی ہے جو آپ کے لیے اچھی نہ ہوگی اور دوسرا فضول خرچی ہوگی اگر آپ مناسب سمجھیں تو میری یہ چند باتیں ہوم ممبر صاحب کو بتا دیں کہ ان کا پیغام مجھے سردار پٹیل کے

ذریعے پہنچا میں اُن کی محبت اور ہمدردانہ مشورے کا مشکور ہوں لیکن میرے متعلق جو اطلاعات اُنہیں دی گئی ہیں وہ درست نہیں . . . . بے شک میں اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ میں اب سرکاری مہمان ہوں اور اس کی مہمانی کھاؤں گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو میرا جی چاہے وہی مجھے سرکار دے گی بلکہ جو کچھ مجھے دے گی وہی کھاؤں گا۔

میں جیل میں متعدد بار گیا ہوں اور ہمیشہ میں اپنے حصّے پر صابر رہا ہوں اور اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت پیش آئی تو میں نے اپنے پیسوں پر منگوائی حکومت کے خزانے پر میں نے کبھی بوجھ نہیں ڈالا یہاں بھی جس وقت آیا تو وہی خوراک کھائی بلکہ میرے حصے کی دال اور چاول سرکار کو بچ رہے اس لیے کہ میں وہ کھا نہیں سکتا آخر میری طبیعت اس خوراک سے خراب ہو گئی اس لیے کہ گجرات کی خوراک اور ہماری خوراک میں بڑا فرق ہے تو میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ میری یہ خوراک تبدیل کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری تو باہر بھی طبیعت ناساز تھی اور میں ڈاکٹری اصولوں کے تحت سادہ خوراک کھاتا تھا اب بھی جن چیزوں کی مجھے ضرورت نہ ہو میں جیل والوں سے نہیں مانگتا اس لیے کہ یونہی چیزوں کو فضول ضائع کرنا پسند نہیں کرتا، جب سے میں یہاں آیا ہوں مجھے جیل والوں نے ایک عجیب سی تلائی دی ہے جس سے میرا آدھا جسم باہر رہتا ہے۔ اور اوڑھنے کے لیے دو کمبل ملے ہیں جیسا کہ عام قیدیوں کو دیئے

جاتے ہیں کہ جن میں اگر میں سر ڈھانپوں تو ٹانگیں ننگی رہتی ہیں۔ اور اگر پیروں کو ڈھانپوں تو سر ننگا رہتا ہے لیکن اس پر بھی میں نے حکومت کو تکلیف نہیں دی اور نہ خزانہ پر بوجھ ڈالنا چاہا بلکہ یہ ساری شدت کی سردی میں نے یوں ہی گزار دی اس لیے کہ میں سوچتا ہوں کہ خدا نے تمہیں اتنا لمبا بنایا ہے تو اس میں سرکار غریب کا کیا قصور ہے کہ اس پر میں بوجھ ڈالوں۔ جیل خانہ میں میرے جیسے قیدی کو اس کا حق اور پوری چیزیں نہیں دی جاتیں اور اس سے وہ لوگ باخبر ہیں جو جیل ہو آئے ہیں۔ دوسری بات خوراک کی ہے تو آپ ہوم ممبر صاحب کو فرمائیں کہ جس وقت تک مجھے اپنی چیزیں استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی تو اس وقت تک میرا جسم لگاتار کمزور ہوتا گیا یہاں تک کہ میرا وزن ۲۰ پونڈ کم ہو گیا لیکن جس وقت مجھے اپنی چیزیں منگوانے کی اجازت ملی تو اس وقت میرا وزن گرنا بند ہو گیا۔ انسان کے لیے خوراک بھی لازمی ہے لیکن اس کے لیے اچھی سوسائٹی اور صاف آب و ہوا بھی ضروری ہے۔ صرف خوراک پر ہی صحت اچھی نہیں رہ سکتی۔ والسلام فقط

آپ کا عبدالغفار

۱۴ر مارچ ۱۹۳۵ء

(سابرمتی سنٹرل جیل احمد آباد)

باچاخان کی سب سے بڑی کمزوری ڈاکٹر خان صاحب ہیں وہ بڑے بھائی کا باپ کی طرح احترام کرتے ہیں ان کی کسی غلط سے غلط بات کو بھی جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتے اپنی اس کمزوری کے باعث باچا خان کو کئی دفعہ اپنی مرضی اور اصول کے خلاف بھی ڈاکٹر صاحب کی ہاں میں ہاں ملانی پڑی اور بادل نخواستہ ان کی تائید کرنی پڑی۔ صوبہ سرحد میں دو دفعہ کانگرس وزارت بنی اور دونوں دفعہ باچا خان اس کے حق میں نہیں تھے لیکن انہیں ڈاکٹر صاحب کی خواہش کا احترام کرنا پڑا اور دوسری دفعہ ۴۵ء میں تو وہ وزارت بنانے کے قطعی مخالف تھے جس کا اظہار انہوں نے بار بار اپنی تقریروں میں کیا۔

"لوگ سرحد کی وزارت کے بارے میں میری رائے پوچھتے ہیں میں کہتا ہوں اگرچہ ڈاکٹر خان صاحب میرے بھائی ہیں لیکن میرے دوستوں کو ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم دونوں ہر بات میں ہم خیال ہیں۔ وہ وزیراعلیٰ بن سکتے ہیں میں نہیں بن سکتا مجھے پارلیمنٹری طریقے کی سیاست پر یقین نہیں میری سیاست تو یہ ہیں کہ لوگوں کی خدمت کی جائے اور دوسروں کو اس کام کے لیے میدان میں آنے کی دعوت دی جائے ایسے ہی قومی خدام کا نام میں نے خدائی خدمت گار رکھا ہے لیکن مجھ میں اتنی رواداری ہے کہ جو لوگ اسمبلی میں جانا اور عہدے قبول کرنا چاہتے ہیں انہیں اس وقت تک برداشت کروں جب تک وہ کسی نہ کسی صورت میں عوام کی خدمت کر سکتے ہوں۔"

کانگرس کی پہلی وزارت ٹوٹی تو آپ نے خدا کا شکر ادا کیا اس کے بعد آپ نے اس بات کا بھی صاف اظہار کیا کہ اس وزارت نے ہمیں سوائے انتشار اور پھوٹ کے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ وزارت نے لوگوں کو لالچی بنا دیا ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ وہ اپنی قربانیوں کا بدلہ لے اور کوئی فائدہ اٹھائے کوئی ڈپو کے لیے میرے پاس آتا ہے کوئی کچھ اور چاہتا ہے اصلی مقصد کو سب بھول گئے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں کو کچھ ملا وہ ہمارے کام کے نہیں رہے بلکہ عہدوں اور ذاتی مفاد سے چمٹ کر ہماری تحریک سے کٹ گئے اور انگریزوں سے وفاداری جتانے لگے تاکہ جو چیز انہیں حاصل ہوئی ہے اس سے محروم نہ کر دیئے جائیں انہوں نے اپنی ایک تقریر میں وزارت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے صاف طور پر کہا کہ

"جو لوگ وزارتوں کے شوقین ہیں وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ وزارتیں کب لو گے میں اُن سے کہتا ہوں کہ ہم نے وزارتیں ترک کر دیں اور ان کا جنازہ نکال دیا ہم دوبارہ وزارتیں قبول نہیں کریں گے اور ایسی وزارتوں کا فائدہ بھی کیا ہے جس میں نام کو تو ہم وزیر ہوں لیکن ایک ملازم کی تنخواہ میں کمی بیشی کا بھی اختیار نہ ہو اور ملک کے لیے مفید قوانین بھی نہ بنا سکتے ہوں بھلا ایسی نام نہاد وزارتوں سے ملک کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے"

ایک اور موقع پر کہتے ہیں۔

"جب سرحد میں کانگرس وزارت تھی تو ایک خدائی خدمت گار آتا اور کہتا کہ میرا وظیفہ نہ لگا، دوسرا آ کر کہتا میں تو سڑک کا جمعدار

بھی نہ بنا۔۔۔ لیکن اگر تم خود سڑک کے جمعدار نہ بنے تو پھر کون بنا؟
۔۔۔ وزیر صاحب نے اپنے رشتہ داروں کو عہدے دے دیئے
ہیں میں ہر ایک خدائی خدمت گار سے کہتا تھا کہ ایک غریب آدمی
کی ضرورت تھی اور اس غریب کو جمعدار بنا دیا گیا جب ایک کی
ضرورت تھی تو آپ کیوں ناراض ہوتے ہیں آخر وہ بھی تو غریب
خدائی خدمت گار تھا آپ نے میرا ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ اگر
ہم نے پھر کچھ حاصل کیا تو پھر وہی پرانا دکھ ہوگا کہ مجھے جمعداری ملے
اور وظیفہ ملے تو اس کمائی اور اس حصول سے کیا فائدہ۔۔۔"

باچا خان کے ان واضح بیانات کے بعد تو اس بات میں کسی شک و شبہ کی
گنجائش نہیں رہتی کہ وہ ذاتی طور پر کبھی بھی وزارت سازی کے حق میں نہیں تھے
بلکہ ہر دفعہ ڈاکٹر خانصاحب کی سینہ زوری سے وزارتیں بنتی رہیں اور وہ بڑے
بھائی کے احترام کی وجہ سے اس کی مخالفت نہ کر سکے۔ پھر جہاں تک ڈاکٹر خانصاحب
کے وزیر اعلیٰ بننے کا تعلق ہے اس سے تو شاید انہیں کبھی اتفاق نہیں تھا اس لیے
کہ وہ سیاسی بصیرت رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ مخالفین کو اعتراض کرنے اور
نکتہ چینی کرنے کا موقع ملے گا اور آخر یہی ہوا۔

چنانچہ پہلی دفعہ جب ستمبر ۱۹۳۷ء میں صاحبزادہ عبدالقیوم خان کے خلاف عدم
اعتماد کی تحریک پاس کی گئی اور ان کی وزارت ٹوٹ گئی تو نئی کانگریسی وزارت کی
تشکیل کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد یہاں آئے اور پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ میں
غلام محمد خان لوند خوڑ کی پارٹی ڈاکٹر خانصاحب کے مقابلہ میں ثمین جان خان کو

وزیر اعلیٰ بنانے کے حق میں تھی اور مخالف پارٹی رائے شماری میں دو ووٹوں سے جیت بھی گئی لیکن ڈاکٹر خانصاحب کے ایمار پر باچا خان کو مداخلت کرنی پڑی اور ان کے اصرار پر ڈاکٹر خانصاحب ہی کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔

ڈاکٹر خانصاحب کی سب سے بڑی کمزوری ان کی انگریز بیوی تھی جس کے ذریعے ڈاکٹر صاحب کی صوبہ سرحد کے انگریز گورنر سر جارج کنگھم سے گاڑھی چھننے لگی اور یہ چیز نہ صرف انگریز دشمن خان برادران کی بدنامی کا باعث بنی بلکہ یہ حقیقت ہے کہ وہ اس چالاک انگریز کا آلۂ کار بن کر بہت سے ایسے کام نادانستہ طور پر کرتے رہے جو شاید انگریز خود بھی کرنے کی جرات نہ کر سکتا۔ جن میں سے غلہ ڈھیر میں مظلوم کسانوں کی تحریک کو کچلنے کا واقعہ کبھی نہیں بھلایا جا سکتا چنانچہ انہوں نے اس تحریک میں اپنے لڑکے عبید اللہ خان کو بھی گرفتار کرکے دو سال کے لیے جیل بھجوا دیا۔

اور اب ڈاکٹر خان صاحب نے باچا خان کی مرضی کے خلاف نہ صرف ایک یونٹ کی حمایت کی بلکہ مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ بن کر برسر اقتدار لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے اور انہوں نے ان کے ہاتھوں اپنے عزیز بھائی کو گرفتار کرا کے کال کوٹھڑی میں پہنچا دیا وہ جمہوری اصولوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آمرانہ طریقہ پر ایک غیر متعلقہ علاقے سے بلا مقابلہ اسمبلی کے ممبر چنے گئے اور جو بدنام مسلم لیگی ان کی تحریک کو کچلنے اور ان کا نام ونشان مٹانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ان سے مل کر ری پبلکن پارٹی بنائی اور اپنے بھائی باچا خان کی کھلم کھلا مخالفت پر اُتر آئے۔

مخالفین کو وہم تھا کہ ڈاکٹر خانصاحب نے باچا خان کے مشورے سے حکومت میں دخل حاصل کیا ہے اور دونوں بھائیوں نے ملی بھگت سے یہ پروگرام بنایا ہے کہ

ایک حکومت کا مخالف رہے اور دوسرا حکومت کے اندر رہ کر کام کرے ۔ ۔ ۔ ۔ اس چیز کو مخالفین نے اتنے زور شور سے پھیلایا کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے اور معاملہ فہم لوگ بھی اس پروپگنیڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور ان دونوں بھائیوں کے اس دوراہے پر جدا ہونے کو نہایت گہری سازش سے تعبیر کرنے لگے ۔ لیکن جب ڈاکٹر خانصاحب نے باچا خان پر اپنے حکومتی اختیارات کا بھرپور وار کیا تو سب کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ ڈاکٹر خانصاحب کی طبیعت کے اس تغیر پہ حیران رہ گئے ۔

ڈاکٹر خان صاحب کی یہ اصول شکنی کوئی نئی چیز نہیں تقسیم ملک سے پہلے ان کی وزارت کے دوران میں لارڈ لن لتھگو پشاور آئے تو گورنر سرحد کے ایماء پر انہوں نے اس کے استقبال میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا حالانکہ وہ صوبے کے کانگریسی وزیر تھے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے لارڈ لن لتھگو کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا ہوا تھا ۔

ڈاکٹر صاحب بہت سادہ لوح واقع ہوئے ہیں وہ مخلص بھی ہیں اپنی وزارت کے زمانے میں غریب لوگوں کی مرغیاں بھی ڈھونڈ کر لاتے رہے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی پیٹھ پیچھے ہاتھی بھی گزرتے رہے ہیں جن کی انہیں خبر تک نہیں ہوئی ۔

ان کے ایک جانثار کارکن غلام محمد گاما نے ان کے ایک "تگڑم" کا واقعہ بھی سنایا تھا جو انہوں نے اپنی وزارت کے عہد میں کیا لیکن یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ۔

باچا خان اور ڈاکٹر خانصاحب دونوں حقیقی بھائی ہیں لیکن بھائی ہونے اور ایک ہی تحریک میں شانہ بشانہ کام کرنے کے باوجود ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ وہ ایک دوسرے کی ضد تو نہیں لیکن ان کے مزاج میں کافی تفاوت ہے ۔

گاندھی نے کہا تھا، ڈاکٹر خان صاحب کو سیاست سے چھو تک نہیں ......

سچ پوچھئے تو انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا وہ سب کچھ سہی لیکن کم از کم سیاسی آدمی نہیں۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ سیاست میں وہ آئے نہیں لائے گئے ہیں۔

وہ ڈاکٹری کے لیے ولایت گئے اور وہاں سے فوج میں بھرتی ہو کر پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کے دست راست بن کر کارہائے نمایاں کرتے رہے جنگ کے بعد بھی انہوں نے ملازمت ترک نہیں کی اور جب ایک عرصہ بعد وہ فوجی ملازمت سے مستعفی ہو گئے تو قصہ خوانی بازار پشاور میں مطب کرنے لگے۔ ان دنوں صوبے میں سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں، باچا خان قید و بند کی صعوبتیں کاٹ رہے تھے لیکن ڈاکٹر خانصاحب دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دوکانداری میں مگن تھے۔

۱۹۲۰ء میں افغانستان کے لوگوں کی امداد کے لیے خلافت کمیٹی نے ہلال احمر کے نام سے ایک طبی وفد بھیجنا چاہا جس کی قیادت کے لیے بحیثیت ڈاکٹر کے ڈاکٹر خانصاحب کو منتخب کیا گیا اس طرح پہلی دفعہ سیاسی حلقوں میں ان کا نام سننے میں آیا لیکن عملی طور پر اب بھی سیاست سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا اس وفد کو افغانستان جانے کی اجازت نہ مل سکی اور یہ قصہ یہیں ختم ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب پھر اپنے دھندے میں لگ گئے۔

ملک میں کئی ہنگامے اٹھے اور گذر گئے مگر ڈاکٹر خانصاحب پر کوئی اثر نہ ہوا یہاں تک کہ اپریل ۱۹۳۰ء کے سیاسی بھونچال میں بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

۱۹۳۱ء کی تحریک میں باچا خان کے ساتھ اچانک ڈاکٹر خانصاحب کی گرفتاری بھی عمل میں آئی ان دنوں وہ پہلی دفعہ جیل گئے وہ عملی طور پر اب بھی سیاست سے کوسوں دور تھے۔ بلکہ محض انہیں باچا خان کا بھائی ہونے کی وجہ سے جیل جانا پڑا۔ انگریزوں نے

انہیں خواہ مخواہ سیاست میں گھسیٹا اور ڈاکٹر صاحب جو نہایت اطمینان سے اب تک اپنے کاروبار میں مصروف تھے اس طرح اب مجبوراً انہیں سیاست کے خارزار میں قدم رکھنا پڑا اور آخر وہ ڈاکٹری بھول کر سیاست ہی کے ہو کر رہ گئے ۔

باچا خان مشاہیر کی نظر میں

ترکی کی مشہور ادیبہ اور سیاسی رہنما محترمہ خالدہ ادیبہ خانم ہندوستان کے دورے پر آئیں تو باچا خان سے بھی ملاقات کی اپنی اس ملاقات کے تاثرات کو انہوں نے اپنی کتاب میں بیان کرتے ہوئے باچا خان کو یوں خراج تحسین ادا کیا ہے ۔

"پٹھان قوم کا یہ قائد اور جوان مرد لیڈر بےشک ایک آزاد روح کا مالک ہے وہ ایک سچا اور حقیقی مسلمان ہے باچا خان کی تحریک خدائی خدمت گار کے اصولوں میں اسلامی فلسفہ آشکار ہے ان میں پہلی قسم اللہ کے نام پر ہے اور خدا کے احکامات کی متابعت کرنے کی بنیادی تعلیم ان میں ملتی ہے بے شک انہی اصولوں پر کاربند رہنے سے ہی باچا خان کی شخصیت عظیم بنی ۔"

مہاتما گاندھی نے باچا خان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔

"خان عبدالغفار خان پکے مسلمان ہیں میں نے واردھا میں قیام کے دوران میں انہیں کبھی ایک نماز بھی قضا کرتے نہیں دیکھا ۔ وہ نہایت فراخ دل اور بلند حوصلہ انسان ہیں خدائی خدمت گاروں کو آپ سے انتہائی عقیدت ہے اور وہ آپ کو فخر افغان کہہ کر خوش ہوتے ہیں ۔"

پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں۔

"خان عبدالغفار خان کی شخصیت میں صوبہ سرحد نے ایک عظیم الشان انسان پیدا کیا ہے ایسا انسان جس پر تمام ہندوستان فخر کرتا ہے اس نے سرحد کو پستی سے نکالا اور اپنی بے مثال قربانیوں سے نہ صرف سرحد بلکہ تمام ہندوستان کا سر بلند کیا اس نے خدائی خدمت گاروں کی فوج تیار کر کے ایک نمایاں کام کیا ہے۔ عدم تشدد ایک زبردست ہتھیار ہے اسے صرف بہادر اور دلیر انسان ہی استعمال کر سکتے ہیں سرحد کے غیور باشندوں نے خان عبدالغفار خان کی رہنمائی میں اس ہتھیار کو پوری بہادری سے اپنایا ہے۔"

متحدہ ہندوستان کے مشہور نیشلسٹ مسلمان رہنما ڈاکٹر سید محمود فرماتے ہیں

"پٹھانوں نے آزادی کے لیے گولیاں کھائیں مگر پیٹھ نہیں دکھائی یہ جذبہ سرحد کے پٹھانوں میں خان عبدالغفار خان کی کوششوں سے پیدا ہوا ہے سرحد کے پٹھانوں کی قربانیوں کی وجہ سے تمام ملک کے ہندو اور مسلمان انہیں سارے ملک کا محافظ سمجھتے ہیں اور سرحد کے پٹھانوں کو یہ اعزاز ان کے رہنما خان عبدالغفار خان کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ مسلمانوں اور خاص طور پر پٹھانوں کو اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں نیشلزم کو پھیلایا اور اس کے سب سے پہلے بانی بھی وہی ہیں اس چیز کو سب سے پہلے شیر شاہ سوری نے پیش کیا تھا

انہوں نے نیشنلزم کے خیال کو اس قدر پھیلایا کہ انگریز مورخوں کو بھی اس بات کا اعتراف کرنا پڑا ۔ یہ شیر شاہ پٹھان تھا اور مجھے یقین ہے کہ دوسرے شیر شاہ خان عبدالغفار خان اس خیال کی تکمیل کریں گے"

ملک خدا بخش مرحوم جو صوبہ سرحد کے بہت بڑے سیاست دان تھے اور جو ایک عرصہ تک سرحد اسمبلی کے سپیکر بھی رہے انہوں نے باچا خان کی شخصیت کے متعلق اپنی مندرجہ ذیل پتی تلی رائے کا اظہار فرمایا تھا ۔

"فخر افغان خان عبدالغفار خان اپنے زخم لے کر کانگرس میں داخل ہوئے اور ان کی قربانیوں اور بے لوث خدمات کا یہ اثر ہو رہا ہے کہ آج صوبہ سرحد کے لاکھوں باشندے اُن کے اشارے پر سب کچھ کرنے کو تیار ہیں ۔ ....

آپ ملاقات کرتے، ہاتھ ملاتے اور باتیں کرتے وقت مسکراتے ہیں عجب انداز سے چلتے ہیں قدم تیز ہوتا ہے مگر چھوٹا ، اپنے کمرے میں خود جھاڑو دیتے ہیں آپ کی زندگی نہایت سادہ ہے سچ ہے کہ بڑے آدمیوں کی بڑائی کسی قیمتی لباس کی محتاج نہیں ہوتی "

مہادیو ڈیسائی اپنی کتاب "دو خدائی خدمت گار" میں باچا خان کے متعلق لکھتے ہیں

"میرے نزدیک خان عبدالغفار خان میں سب سے بڑی چیز ان کی روحانیت یا سچا اسلامی جذبہ ہے یعنی اللہ کے حضور میں سر تسلیم خم کر دینا مجھے

بہت سے مسلم احباب کی دوستی کا فخر حاصل ہے جو فولاد کی طرح مضبوط اور مستقل مزاج ہیں اور جو ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہیں لیکن آج تک ایک شخص بھی میں نے ایسا نہیں دیکھا جو غیر معمولی پاکیزہ اور سخت زاہدانہ زندگی کے لحاظ سے انتہائی نازک جذبات کے لحاظ سے اور خدا پر کامل ایمان رکھنے کے لحاظ سے خان عبدالغفار خان سے زیادہ یا ان کے برابر بھی ہو۔"

باچا خاں کے ساتھی

اس میں شک نہیں کہ باچا خان ہر خدائی خدمت گار تحریک کے بانی بھی ہیں پشتون قوم کے واحد مقبول رہنما بھی ہیں اور آپ نے یہاں جتنا کام ہے یا جو خدمات اور قربانیاں آپ کی ہیں ان کی مثال نہیں ملتی لیکن اس کام میں آپ کے ساتھیوں کا بھی کافی حصّہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ذکر کے بغیر یہ کتاب کسی طرح بھی مکمل نہیں کہلائی جا سکتی ۔

محمد اکبر خادم

پشتو کے مشہور قومی شاعر خادم صاحب مرحوم باچا خان کے دست راست اور خدائی خدمت گار جماعت کے بانیوں میں سے تھے وہ ایک انقلابی شاعر اور آتش بیان مقرر تھے ، انہوں نے اپنے طوفانی دوروں اور ولولہ انگیز نظموں سے سارے صوبے میں آگ لگا دی اور تحریک کو پھیلانے اور بڑھانے میں سب سے زیادہ کام کیا ، یہاں تک کہ ۳۲-۱۹۳۰ء کے انتہائی سخت دور میں جب باچا خان کے اکثر ساتھی مارے دہشت کے کنارہ کش ہو گئے تو وہ تن تنہا سارے صوبے میں دورے کرتے رہے ۔ آپ نے سالہا سال تک قید و بند کے مصائب برداشت کئے چنانچہ قید کے دوران ہی میں آپ کا توازن دماغی جاتا رہا اور آخر اسی حالت میں

وفات پائی۔

قاضی عطاء اللہ

خدائی خدمت گار تحریک کے دوسرے اولوالعزم رہنما قاضی عطاء اللہ مرحوم تھے وہ نہ صرف اس تحریک کے بانیوں میں سے تھے بلکہ اس کے لیے خدائی خدمت گار کا نام بھی انہی نے تجویز کیا، وہ باچا خان کے پرانے رفیق تھے اور آخر وقت تک انہوں نے باچا خان کا ساتھ نبھایا، وہ صاحب الرائے انسان تھے اور اکثر اوقات باچا خان سے اختلاف بھی کرتے تھے اور ان کے قیمتی مشوروں کو باچا خان بخوشی قبول کر لیتے تھے۔

قاضی صاحب مرحوم نے ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری حاصل کی اور مردان میں پریکٹس کرنے لگے ۱۹۱۹ء میں پہلی دفعہ رولٹ بل کے ہنگامہ میں باچا خان کے ساتھ مل کر ملکی سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا اور اس کے بعد وہ ہمیشہ باچا خان کے مخلص ساتھی بنے رہے، انجمن اصلاح الافاغنہ، یوتھ لیگ، خدائی خدمت گار جماعت اور کانگرس میں انہوں نے باچا خان کے دوش بدوش حصہ لیا اور ان کے ساتھ ہی وقتاً فوقتاً قید و بند کے مصائب جھیلتے رہے۔

۱۹۳۶ء کے عام انتخابات میں قاضی صاحب سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور جب ۱۹۳۷ء میں سرحد میں کانگرس کی پہلی وزارت بنی تو قاضی صاحب وزیر معارف لئے گئے اس وقت اگرچہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خانصاحب تھے لیکن حکومت کا تمام نظم و نسق قاضی صاحب ہی چلاتے رہے۔

۴۲ء کی سول نافرمانی میں آپ پھر گرفتار ہو کر جیل چلے گئے اور تین سال کی نظربندی کے بعد جب دوبارہ کانگرس وزارت بنی تو آپ رہا ہوتے ہی پھر وزارت

کی کرسی پر نظر آئے۔

قیام پاکستان کے بعد کانگرس وزارت توڑ دی گئی اور آپ باچا خان اور اُن کے ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیے گئے جیل میں آپ کی صحت روز بروز بگڑتی گئی آخر وقت میں آپ کو میو ہسپتال لاہور میں بغرض علاج منتقل کیا گیا جہاں انہوں نے ۱۷ فروری ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔

قاضی صاحب مرحوم ایک اچھے ادیب اور مؤرخ بھی تھے آپ نے پشتو زبان میں پشتونوں کی تاریخ دو ضخیم جلدوں میں لکھی جو آپ کی زندگی میں ہی طبع ہو گئی تھی اس کے علاوہ آپ کے مضامین وقتاً فوقتاً پختون رسالہ میں چھپتے رہے اور آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اپنے دور وزارت میں آپ نے صوبہ سرحد کے سرکاری مدارس میں پشتو کو لازمی مضمون قرار دے دیا۔ ۱۷ فروری ۱۹۵۷ء کو مردان میں نیشنل پارٹی کے زیر اہتمام آپ کا یوم شہادت نہایت اہتمام سے منایا گیا۔

سمین جان خان

سمین جان خان مرحوم باچا خان کے پرانے ساتھیوں میں سے تھے انہوں نے خدائی خدمت گار تحریک میں نمایاں حصّہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں پہلی کانگرس وزارت کی تشکیل ہونے لگی تو ڈاکٹر خانصاحب کے مقابلہ میں صوبائی کانگرس کمیٹی کی اکثریت سمین جان خان کو وزیر اعلیٰ بنانے کے حق میں تھی لیکن بعض نامعلوم مصالح کی بنا پر ڈاکٹر خانصاحب کو وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا یہیں سے سمین جان خان کا اختلاف شروع ہوا اور وہ کانگرس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے پیر مانکی شریف گروپ کے ساتھ مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر عوامی لیگ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۵۶ء میں اینٹی

یونٹ فرنٹ بنا تو آپ پھر باچا خان سے آملے اور صحت کی خرابی کے باوجود سارے صوبے میں دورے کرتے رہے چنانچہ آپ کی صحت زیادہ بگڑ گئی اور نومبر ۵۶ء کو لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں انتقال کیا۔

آپ نہایت قابل انسان اور پشتو کے بے نظیر مقرر تھے، باچا خان کے بعد عوامی مقررین میں کوئی بھی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

ارباب عبدالغفور خان

۱۹۰۷ء میں موضع تہکال میں پیدا ہوئے کالج کے زمانے سے ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا ستمبر ۱۹۲۹ء میں آپ نے اتمان زئی کے تاریخی جلسے میں شرکت کی جس میں "افغان جرگہ" کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۹۲۱ء میں کالج کے لڑکوں نے ہشنگر میں ایک ڈرامہ کھیلا جس پر امیر نواز جلیا گرفتار ہوا، کالج کے طلبا نے احتجاجی جلسہ کیا جس کی وجہ سے آٹھ طلبا کو کالج سے نکال دیا گیا ان طلبا میں ارباب صاحب کا نام سر فہرست تھا یہیں سے انہوں نے باقاعدہ سیاست میں حصہ لینا شروع کیا، ۱۹۳۱ء میں آپ پہلے پہل گرفتار ہو کر ۱½ سال قید ہوئے یہ سزا بھگت کر آپ باہر آئے لیکن آتے ہی دفعہ ۴۰ سرحدی میں پھر تین سال کے لیے جیل بھیج دیئے گئے پہلی کانگرس وزارت میں پارلیمنٹری سیکرٹری مقرر ہوئے، ۱۹۳۹ء میں کانگرس وزارت مستعفی ہوئی ۱۹۴۰ء میں ارباب صاحب بغاوت کے الزام میں دو سال قید ہوئے ۴۲ء میں رہا ہو کر آئے تو بعض اختلافات کی بنا پر کانگرس سے قطع تعلق کر کے "افغان جرگہ" میں کام کرنے لگے بعد میں پیر صاحب مانکی شریف کی وجہ سے مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے قیام پاکستان کے بعد قیوم خان سے اختلاف بڑھا اور آپ نے پیر صاحب کی معیت میں عوامی لیگ بنائی اور یکے بعد دیگرے تین دفعہ

گرفتار ہو کر جیل جانا پڑا ۱۹۵۶ء میں اینٹی یونٹ فرنٹ پر آپ پھر باچا خان سے مل کر کام کرنے لگے اور اب تک مستعدی سے کام کر رہے ہیں۔

ارباب صاحب مخلص، دیانتدار اور باہمت سیاسی کارکن ہیں آپ بہت اچھے مقرر اور سلجھے ہوئے سیاستدان ہیں آپ میں کام کرنے کی بڑی صلاحیت ہے پشاور سے چکلہ ہٹانے کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔

علی گل خان

۱۸۹۸ء میں بمقام پشاور پیدا ہوئے میٹرک میں پڑھ رہے تھے کہ عدم تعاون کی تحریک میں تعلیم چھوڑ کر سیاسیات میں حصہ لینے لگے رولٹ ایکٹ اور ہجرت کی تحریکوں میں رضاکار کے طور پر کام کیا، ۱۹۲۲ء میں پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ میں حصہ لینے کے جرم میں گرفتار ہو کر چھ ماہ سزا پائی، رہا ہو کر آئے تو خلافت کمیٹی کے سیکرٹری مقرر ہوئے ۱۹۲۹ء میں آپ کانگرس میں شامل ہوئے ۱۹۳۰ء کے ہنگامہ میں پشاور شہر سے جن رہنماؤں کو سب سے پہلے گرفتار کیا گیا ان میں آپ بھی شامل تھے آپ کو ایک سال کی سزا ہوئی۔

آپ ایک عرصہ تک پشاور میونسپلٹی کے ایڈمنسٹریٹر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے قیام پاکستان سے قبل ہی صحت کی خرابی کے باعث آپ کو مجبوراً سیاسی زندگی سے دست کش ہونا پڑا۔

حکیم عبدالجلیل

سرحد کانگرس کمیٹی کی باگ ڈور باچا خان کے ہاتھ میں چلی گئی اور انہوں نے اس کا مرکزی دفتر اتمان زئی میں منتقل کر دیا تو پشاور شہر کے تقریباً تمام سیاسی کارکن کانگرس سے الگ ہو گئے لیکن علی گل خان اور حکیم عبدالجلیل صاحب نے پوری مستقل مزاجی اور وفاداری سے باچا خان

کا ساتھ دیا۔ حکیم صاحب پرانے سیاسی کارکن ہیں انہوں نے ہمیشہ قوم کی بے لوث خدمت کی اور ہر قسم کی قربانی میں پیش پیش رہے۔ پشاور میں کانگرس کے بانیوں میں سے ہیں رولٹ بل کے زمانہ میں ملکی سیاسیات میں حصہ لینے لگے اور قیام پاکستان تک پوری سرگرمی سے کام کرتے رہے، پاکستان بننے کے بعد آپ سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

عبد الصمد خان اچکزئی آپ بلوچستان کے مشہور رہنما اور باچا خان کے قدیم ساتھی ہیں تمام عمر سیاسی ہنگاموں میں گزار دی، ۱۰ سال تک قید و بند کے مصائب جھیلے، با اصول اور قوم پرست انسان ہیں۔

عاشق شاہ آپ ۱۹۳۰ء میں خدائی خدمت گار تحریک میں شامل ہوئے اور آج تک پوری ثابت قدمی سے باچا خان کا ساتھ دے رہے ہیں کم از کم دس برس جیل کاٹ چکے ہیں باچا خان کے فدائی اور مخلص ساتھی ہیں۔

امیر محمد خان ۱۹۳۱ء میں خدائی خدمت گار تحریک سے وابستہ ہوئے باچا خان کے با اعتماد جرنیل ہیں نہایت صحت مند نوجوان تھے لیکن مسلسل قید و بند کی صعوبتوں نے آپ کی صحت برباد کر دی، مستقل مزاج، حوصلہ مند اور باحمیت انسان ہیں۔

عبد الخالق خلیق پشتو کے بہت بڑے ادیب شاعر اور باچا خان کے دیرینہ ساتھی ہیں آپ ایک عرصہ تک خدائی خدمت گار تحریک کے مشہور آرگن "پختون" کے ایڈیٹر رہے اور آج تک پوری وفاداری سے اپنے مسلک

پر قائم ہیں۔

عبدالولی خان باچا خان کے بڑے بیٹے اور خدائی خدمت گار تحریک کے انتھک کارکن ہیں ۱۹۳۱ء میں آپ پہلی دفعہ گرفتار ہوئے اس کے بعد متعدد بار جیل جانا پڑا۔ آپ وسیع المشرب، اچھے پڑھے لکھے اور فہمیدہ جوان ہیں۔ سیاسی سوجھ بوجھ میں آپ کو خدائی خدمت گار رہنماؤں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

ماسٹر عبدالکریم آپ باچا خان کے آزاد قومی مدرسے کے فارغ التحصیل ہیں۔ خدائی خدمت گار تحریک میں آپ ابتداہی سے کام کر رہے ہیں عمر کا بیشتر حصہ قید و بند میں گزارا، مخلص اور انتھک کارکن ہیں پشتو کے اچھے ادیب بھی ہیں،

حسین بخش کوثر پشاور کے رہنے والے ہیں خدائی خدمت گار تحریک اور باچا خان کے فدائیوں میں سے ہیں متعدد بار قید و بند کے مراحل سے گزر چکے ہیں اور آج کل بھی ایک قابل اعتراض تقریر کے سلسلہ میں محبوس ہیں۔ اردو پشتو کے بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں۔ آپ نے پشتون زبان پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جو ابھی طبع نہیں ہو سکی۔

عبدالغنی خان باچا خان کے منجھلے بیٹے اور خدائی خدمت گار کارکن ہیں دو دفعہ جیل جا چکے ہیں اعلیٰ تعلیم پائی ہے انگریزی اور پشتو کے بہترین شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ نہایت اچھے مصور بھی ہیں۔

یحییٰ جان باچا خان کے داماد ہیں اور پشاور کے مشہور معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں آپ ایک عرصہ سے خدائی خدمت گار تحریک سے وابستہ ہیں

کانگرس وزارت میں وزیر تعلیم رہ چکے ہیں سنجیدہ اور خاموش کارکن ہیں ۔

ولی محمد طوفان پشتو اور اردو کے بہت اچھے شاعر، ادیب اور صحافی ہیں سنہ ۱۹۳۰ء میں خدائی خدمت گار تحریک سے وابستہ ہوئے اور آج تک نہایت ثابت قدمی سے باچا خان کا ساتھ نبھا رہے ہیں، انتھک کارکن اور مخلص انسان ہیں بارہا قید و بند کے مصائب بھی اٹھائے ان دنوں نیشنل پارٹی کے سرگرم رکن اور ہفتہ وار پشتو اخبار "رہبر" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں

میر مہدی شاہ پرانے سیاسی کارکن ہیں خدائی خدمت گار تحریک کے سرگرم اور اچھے مقرر ہیں پشتو زبان کے بلند پایہ شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے اس کے علاوہ آپ پشتو کے افسانہ نگار اور صحافی بھی ہیں، پشتو ہفت روزہ "رہبر" کے مدیر ہیں ۔

اجمل خٹک پشتو زبان کے چوٹی کے ادیب شاعر اور صحافی ہیں خدائی خدمتگار تحریک کے ساتھ ایک عرصہ سے وابستہ ہیں پختونستان کے الزام میں ایک عرصہ تک قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں انتھک کارکن اور ہمیشہ نوجوان ہیں

سرانجام خان باچا خان کے بھانجے ہیں خدائی خدمت گار تحریک کے سرگرم رکن ہیں ان دنوں نیشنل پارٹی سے وابستہ ہیں، بلند حوصلہ، نڈر اور مخلص نوجوان ہیں ۔

عبدالقیوم سواتی، حاجی نیز خان، مہاشہ شیورام، چودھری جے کرشن، راجہ غلام سرور، جلال بابا، ضلع ہزارہ میں داؤد خان سالار، پیر خان (لبقہ) میاں عبدالقیوم، عمر فاروق، جگت رام ماسٹر غلام حیدر (ایبٹ آباد) حکیم عبدالسلام (ہری پور) محمد حسین (ہری پور)

مولانا قمر علی (مانسہرہ) خدائی خدمت گار اور کانگرس جماعتوں کے سرگرم کارکن تھے۔

ہزارہ میں کسان فرنٹ پر ملک امیر عالم اعوان محمد حسین عطا، گلاب خان (پنڈ لھاکرم) مولانا غلام ربانی لودھی، مولانا عبدالرؤف (ہری پورہ) حکیم عبدالواحد (سرائے صالح) کام کر رہے تھے لیکن کانگرس اور خدائی خدمت گار تحریکوں کو ان کی عموماً حمایت حاصل رہی۔

مجلس احرار میں مولوی غلام غوث (بفہ) ڈاکٹر ہارون جمعیت العلماء میں مولانا عبدالودود (بفہ) سید محمود شاہ (بفہ) مولانا محمد اسحاق (ایبٹ آباد) کام کرتے رہے ان لوگوں نے بھی جماعتی طور پر کانگرس اور خدائی خدمت گار تحریکوں کی ہمیشہ ہمنوائی کی۔

کانگرس سے پہلے ہزارہ خلافت تحریک کا بہت بڑا مرکز تھا۔ مولانا محمد اسحاق مانسہروی اس جماعت کے قائد تھے دیوبند کے فاضل اور عوام کے محبوب رہنما تھے ان کے ساتھی غلام رسول آف سفیدہ، مولانا محمد عرفان مانسہروی، بابا ہنس راج تھے ان دنوں قبل تحریک عروج پر تھی اور ہندو مسلم اتحاد کے نعرے ہر طرف گونجتے تھے۔

خلافت کے بعد انجمن اصلاح رسوم کے نام سے ایک اصلاحی انجمن خدائی خدمتگار کے طور پر وجود میں آئی اس انجمن کے بنانے والے مولوی غلام احمد صاحب (شنگئی بالا کوٹ) تھے مفتی محمد الیاس، مولوی محمود صاحب، قاضی محمد عبداللہ، مہدی زمان خان (کلابٹ) ان کے پیرو تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو ہزارہ میں قائد کی حیثیت حاصل تھی تقریباً تمام سیاسی رہنما آپ ہی کے تربیت یافتہ تھے آپ بہت بڑے عالم تھے آزاد خیال اور وسیع المشرب انسان تھے۔

کوہاٹ میں مولانا احمد گل، پیر سید کمال، پیر حسن شاہ، میاں فضل شاہ، چچا غلام رسول

لالہ محمد ایوب، چچا غلام قادر، پیر شہنشاہ، مولوی عبدالجبار، استاد نور احمد، حاجی عبدالغفور مرحوم، مولانا عبداللطیف پراچہ، میاں رحمت اللہ پراچہ، حافظ الٰہی بخش پراچہ، مستری غلام حیدر مرحوم، اٹگہ کوہاٹی، میاں معروف شاہ وغیرہ خدائی خدمت گار اور کانگرس کے پہلے دور میں ان جماعتوں کے نہایت سرگرم کارکن تھے۔

دوسرے دور میں خیر محمد جلالی، کاکا خوشحال خان، غلام محمد پراچہ، سالار اسلم خان، صاحب گل، محمد افضل خان، ملک شیر زمان، ٹھیکیدار علی بادشاہ مرحوم، گلاب خان، قاضی محمد حسین مرحوم، مولانا حبیب گل، غلام حیدر خان، عبدالحنان، میر اکبر، پیر نوران شاہ، گل محمد خان وکیل، عین الدین وکیل، محمد طبیب، محمد اکرم خان، میر ولی، چچا غلام حسین، پنڈت انوپ چند وکیل، سردار گوپال سنگھ، ڈاکٹر موہن لال گلاٹی، مہتہ دیوان چند، اودھم لعل، ستیارام، تارا سنگھ آزاد، سندر سنگھ، پنڈت ترلوک ناتھ وغیرہ خدائی خدمت گار اور کانگرس تحریکوں کی روح و رواں تھے۔

بنوں میں ملک اکبر علی خان، حاجی اسلم خان، سالار یعقوب خان، وشوا متر، ماسٹر کپل رام، سردار رام سنگھ وغیرہ خدائی خدمت گار قابل ذکر ہیں۔

ہزارہ، کوہاٹ اور بنوں کے ان حضرات میں سے بعض لوگ بعد میں کانگرس سے الگ ہو کر دوسری جماعتوں میں جا شامل ہوئے لیکن اکثر آخر تک ان کے ساتھ رہے اور اب تک ساتھ ہیں ان تمام حضرات نے ملک کی جنگ آزادی میں ایسی بیش بہا قربانیاں دی ہیں جو ہر لحاظ سے قابل قدر ہیں۔

پشاور میں آغہ لعل بادشاہ، اللہ بخش یوسفی، رحیم بخش غزنوی، پیر بخش خان، سردار عبدالرب نشتر، آغہ قاسم شاہ، حاجی جان محمد مرحوم، سلیم خان، عمر خان، ملک امیر عالم

اعوان، خمار میر ہلالی، حاجی اکرم خان (بہادر کلی) وغیرہ ابتدا میں خلافت کمیٹی اور کانگرس کے مشہور رہنما تھے انہوں نے بھاری قربانیاں بھی دیں انتھک کام بھی کیا لیکن بعد میں انہیں بعض وجوہات کی بنا پر کانگرس سے علیحدہ ہو کر مسلم لیگ سے اپنا رشتہ جوڑنا پڑا۔

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی مرحوم، کاکا صنوبر حسین، ماسٹر بشیر علی، چری رام کنڈٹی بخشی فقیر چند، روشن لال، رام سرن نگینہ، عبدالغفور آتش، کاشی رام الحق، ایچ رام سوہن لال، عبداللہ جان، عبدالرحمان ریا، اللہ بخش برقی، عبدالعزیز خوش باش، غلام ربانی سیٹھی انتہا پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور نوجوان بھارت سبھا کے جانباز سپاہی تھے۔ یہ گروہ کانگرس کے ہراول دستہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اکثر و بیشتر کانگرس کے پروگرام پر ہی یہ چلتے رہے اور ہر موقع پر بڑھ چڑھ کر قربانیاں دیں۔ انہیں باچا خان کی عدم تشدد کی پالیسی سے اتفاق نہیں تھا، حبیب نور، رام کشن اور غازی عبدالرشید نوجوان بھارت سبھا ہی کے ممبر تھے جو مختلف اوقات میں ظالم اور جابر انگریز افسروں پر قاتلانہ حملے کی پاداش میں سولی پر چڑھا دیئے گئے۔

میاں احمد شاہ خدائی خدمت گار جماعت کے بانیوں اور باچا خان کے ابتدائی ساتھیوں میں سے ہیں جو بعد میں خاکسار جماعت سے وابستہ ہو گئے اور اب خاموش زندگی گذار رہے ہیں۔

ڈاکٹر خانصاحب باچا خان کے بھائی اور دست راست ایک عرصہ تک خدائی خدمت گار تحریک کے ستون خیال کئے جاتے تھے ان دنوں اس جماعت سے الگ ہو کر ری پبلکن پارٹی کے قائد اور مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ ہیں۔

عبیداللہ خان ڈاکٹر خانصاحب کے فرزند اور خدائی خدمت گار کے سرگرم کارکن رہ چکے ہیں انہوں نے ۱۹۳۱ء میں بڑا نام پیدا کیا ان کی چارسدہ جیل کی ۳۸ دن کی بھوک ہڑتال اور ملتان جیل کی ۴۰ دن کی بھوک ہڑتال ہماری جنگ آزادی کی تاریخ میں ایک یادگار کارنامہ ہے آپ بھی ان دنوں ری پبلکن پارٹی سے وابستہ ہیں۔

غلام محمد خان لوند خوڑ خدائی خدمت گار اور کانگرس کے مشہور سرحدی رہنما ہیں جنہوں نے ان جماعتوں میں بیش بہا قربانیاں دیں اب عوامی لیگ کے ساتھ ہیں۔

احمد میاں اور عباس خان آپ کے ابتدائی ساتھیوں میں سے ہیں اور اس اعتبار سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

پیر صاحب مانکی شریف باچا خان کے مخالف رہے ہیں لیکن ان دنوں آپ کے ہمنوا ہیں اور اینٹی یونٹ فرنٹ میں آپ کے دوش بدوش کام کر رہے ہیں۔

نکو دیوی پشاور کی واحد خاتون ہیں جو کانگرس کی انتھک کارکن تھیں یہ بہادر خاتون ابتدا ہی سے اپنے بیٹے روشن لال کے ساتھ قومی تحریکوں میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی وہ کانگرس اور نوجوان بھارت سبھا کی بہت بڑی کارکن تھیں آخر میں فارورڈ بلاک سے وابستہ ہو گئیں قیام پاکستان کے بعد بھارت چلی گئیں ان دنوں دہلی میں مقیم ہیں ۱۹۳۱ء میں کانگرس ورکنگ کمیٹی نے بمبئی کے اپنے ایک خصوصی اجلاس میں نکو دیوی کے مشورے سے ہی سرحد کانگرس کمیٹی کی باگ ڈور باچا خان کے حوالے کی تھی

غلام محمد گاما خدائی خدمت گار اور کانگرس کا جانثار سپاہی اور باچا خان کا فدائی تھا تقریباً دس برس قید و بند میں گزارے اب ری پبلکن پارٹی سے وابستہ ہے۔

سرفراز خان، حجاب گل اور محمد اکبر خان سب سے پہلے تین خدائی خدمت گار ہیں

عبدالحکیم خان اور محمود شاہ دو خدائی خدمت گار اتمان زئی فائرنگ میں شہید ہوگئے
لالہ بیٹرا خان، سردار رام سنگھ، امیر نواز جلیا، اسلم خان شہر مرحوم، بھائی جان، سالار مرتضیٰ
خان، رب نواز خان، امیر، سالار امین جان، مقرب خان، حبیب اللہ خان، ستار خان، چیلا رام
شوق، میاں محمد شاہ، محمد یونس، حکیم اسلم سنجری، محمد صدیق ،، چارسدہ، محمد عاشق، اپسج رام
تاج محمد، فردوس خان مانیری، منیر خان مینری، راحت خان سناکوٹ، عبدالعزیز خان عنایت علیشا
میاں شاکر اللہ گجر گڑھی، بہادر نواز خان، حکیم خیر محمد، عرب خان، ڈاکٹر محسن خان (پشاور) غلام
جیلانی خان (پشاور)، کرامت شاہ فولاد (ٹپرانگ چارسدہ) وغیرہ کانگرس اور خدائی خدمتگار
جماعتوں کے ناقابل فراموش کارکن رہ چکے ہیں اوران میں اکثر توآج تک اسی تندہی سے
کام کر رہے ہیں انہوں نے ملک کی سیاسی جدوجہد میں قابل قدر قربانیاں دی ہیں اور خدائی
خدمت گار تحریک کو بڑھانے پھیلانے اور کامیاب بنانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں،

خاتمہ

میں سیاسیات سرحد لکھنے کے لیے پر تول رہا تھا بلکہ اس کا کافی حصہ لکھ بھی چکا تھا، کہ جون ۱۹۵۶ء میں خان عبدالغفار خان گرفتار ہو گئے پھر جیل سے اُن کی بیماری کی بُری بُری خبریں آنے لگیں ادھر ان کے خلاف مقدموں کا انبار لگا دیا گیا اور قرائن یہی بتاتے تھے کہ حکمران انہیں باہر دیکھنا نہیں چاہتے اور کسی لمبے سفر پر بھجوا رہے ہیں۔ میں نے اُن کی پیرانہ سالی، صحت کی خرابی، قید و بند کی صعوبت اور اپنے عزیز بھائی اور عمر بھر کے ساتھی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے دُکھ کا تصور کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس دفعہ باچا خان شاید ہی جیل سے زندہ و سلامت لوٹ کر آئیں۔ مجھے قاضی عطا اللہ مرحوم کا انجام یاد آگیا دل غم اور دُکھ سے بھر گیا اور میں نے سیاسیات سرحد سے پہلے باچا خان کے سوانح حیات مرتب کرنے کا فیصلہ کر لیا حالانکہ میرے پروگرام کے مطابق یہ چیز سیاسیات سرحد کے بعد آنی چاہیئے تھی۔

باچا خان کسی تعارف کے محتاج نہیں، ملک کی جنگ آزادی میں انہوں نے اتنا اہم پارٹ ادا کیا ہے کہ پاک و ہند کا بچہ بچہ انہیں جانتا ہے ان کی قربانیوں اور خدمات سے واقف ہے اور اُن کے خلوص و دیانتداری کا قائل ہے لیکن ان کی زندگی کے کئی گوشے ابھی تک لوگوں کے سامنے نہیں آئے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس افراتفری

یں کسی کو اس طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہ ملا دوسرا وہ کچھ ایسے حالات سے گزر رہے تھے کہ ان کے متعلق کچھ لکھنا بہت بڑا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا تیسرا وہ لوگ جو ان سے قریب تھے یا اُن کے متعلق لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے وہ خود بھی باچا خان کی طرح معتوب تھے اور انہیں اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ اپنی اس دیرینہ خواہش اور وقت کی اہم ضرورت کو پورا کر سکتے۔

مجھے جو سابق سرحد اور اہل سرحد کے متعلق لکھنے کا جنون ہے اس کے پیش نظر میرے پروگرام میں سیاسیات سرحد کے علاوہ سرحد کی سرکردہ اہم سیاسی شخصیتوں کے حالات زندگی پر الگ الگ کتابیں پیش کرنا بھی شامل تھا اسی نکتہ نظر سے میں ابتدا ہی سے باچا خان کی زندگی اور اُن کی خدائی خدمت گار تحریک کا نہ صرف بغور مطالعہ کرتا رہا بلکہ اس کے متعلق اہم دستاویزات بھی جمع کرتا رہا۔ جو میرے لیے اس کتاب کے سلسلے میں کافی کار آمد اور ممد و معاون ثابت ہوئیں، میں اس کا اظہار کر چکا ہوں کہ باچا خان کی زندگی کے کئی پہلو ہیں جو اتنی وسعت لیے ہوئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک الگ کتاب لکھی جا سکتی ہے اور زیر نظر کتاب کسی طرح بھی ان تمام چیزوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ تاہم میری یہ کوشش رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اُنکی زندگی اور تحریک کے تمام گوشوں پر تھوڑی بہت روشنی ڈالی جائے تاکہ قارئین کو باچا خان کی شخصیت اور ان کے مشن کو سمجھنے اور پرکھنے میں آسانی ہو۔

چونکہ صحیح معنوں میں باچا خان کی زندگی پر یہ پہلی کتاب ہے اس لیے یقیناً اسے کافی اہمیت حاصل ہے مجھے اس اہمیت کا احساس تھا اور میں نے واقعات و حالات کا جائزہ لینے میں حتی الوسع خاصی احتیاط سے کام لیا ہے اور واقعات کو اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش ہے اس کے باوجود

اگر اس میں کوئی تاریخی یا واقعاتی غلطی رہ گئی ہو تو اُسے میری معلومات کا قصور سمجھا جائے۔ اور از راہ کرم مطلع کیا جائے تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے۔

اس کتاب کو موضوع کے اعتبار سے صرف باچا خان کے حالات تک ہی محدود رہنا چاہیے تھا لیکن جیسا کہ مطالعہ سے معلوم ہوگا اس میں سابق صوبہ سرحد کی تقریباً تمام سیاسی تاریخ آگئی ہے ممکن ہے بعض حضرات اس پر اعتراض کریں اور اسے غیر متعلق چیز خیال کریں اس لیے یہاں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

درحقیقت باچا خان کی زندگی کو سرحد کی سیاسی تاریخ سے الگ کر کے کسی صورت نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ یہاں کی تمام سیاسیات آپ کی زندگی کے گرد گھومتی ہے اس لیے باچا خان کی تحریک ان کے مشن، اُن کی جدوجہد اور اُن کی سیاسی زندگی کو سمجھنے کے لیے ان تفصیلات کو سامنے لانا ناگزیر تھا۔

باچا خان کی زندگی جدوجہد کا مرقع ہے، ان کی کارگزاری، بے پناہ قومی خدمات اور انمول قربانیوں کا جو انعام انہیں دیا گیا اسے ہر محب وطن شخص ایک بہت بڑا قومی حادثہ تصوّر کرے گا۔

ہمارے ہاں لیڈروں کی کمی نہیں لیکن گذشتہ ایک صدی کی سیاسی تاریخ پر نظر کیجیے تو باچا خان ایسے مخلص، بے ریا اور بے داغ رہنما گنتی کے دکھائی دیں گے۔

باچا خان کے متعلق ملک کے بعض حلقوں میں کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی

ہیں جو لوگ دیانتداری سے انہیں سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لیے شاید یہ کتاب کافی مفید ثابت ہو گی لیکن جو لوگ انہیں سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہتے انہیں قائل کرنا کسی کے بس کا کام نہیں نہ ہی اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ باچا خان کے مخالفین کو جبراً اُن کی عظمت کا قائل کیا جائے۔

باچا خان کے متعلق ملک کا جو طبقہ مخالفین کے غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈے کا شکار ہو چکا ہے اسے حقائق سے روشناس کرانا ہم ضرور اپنا فرض سمجھتے ہیں اور درحقیقت اسی احساس نے یہ کتاب لکھنے پر مجبور کیا۔

باچا خان کی شخصیت کو جتنا پُر اسرار بنا دیا گیا ہے دراصل وہ کچھ ایسی پُر اسرار شخصیت نہیں ، ممکن ہے بعض لوگوں کو انہیں سمجھنے میں دقت ہو رہی ہو لیکن شروع ہی سے ان کی پالیسی اتنی صاف اور واضح رہی ہے کہ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں رہا وہ اپنی کمزوریوں اپنی فروگذاشتوں اور اپنی اسکیموں کو ہمیشہ صاف اور سیدھے طور پر پیش کرتے رہے ہیں انہوں نے کبھی اپنی کوئی بات چھپانے یا اُسے صیغۂ راز میں رکھنے کی کوشش نہیں کی وہ جو کچھ کہتے ہیں برملا کہتے ہیں ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت بھی انہیں اظہار حق سے روک نہیں سکتی۔

باچا خان کی عمر اس وقت ۸۶ برس کے قریب ہے ، وہ کافی نحیف اور کمزور ہو چکے ہیں اس کے علاوہ سالہا سال کی انتھک جدوجہد ، قید و بند کے مصائب اور فکر و تردد نے ان کی صحت اس حد تک بگاڑ دی ہے کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتے ہیں۔

مسلمان مُردہ پرست قوم ہے آج جو کم نظر لوگ باچا خان ایسے عظیم رہنما کی قدر و قیمت سے ناواقف ہیں مجھے اُمید ہے کل انہیں اُن کی اہمیت اور عظمت کا ضرور احساس ہوگا لیکن اگر خدانخواستہ اُس وقت وہ ہم میں نہ ہوئے تو اُن کا یہ احساس محض روائتی مُردہ پرستی کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

سچ پوچھئے تو یہ ہماری بدقسمتی ہے جو باچا خان ایسے رہنما کی ہمارے ہاں اتنی قدر نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی، باچا خان ایسے محب وطن روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ بلکہ بقول اقبالؒ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سید فارغ بخاری

پشاور
یکم مارچ ۱۹۵۷ء

(دفتر کتابت انارکلی لاہور)

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی